عزیزی ملک محمد علی ریش کی نذر

تلوک چند محروم

دہلی
16.5.

گنجِ معانی

دہلی کتاب گھر

نیا محلہ پل بنگش دہلی

پہلی بار ۱۹۳۲ء

دوسری بار ۱۹۵۶ء

قیمت سات روپے آٹھ آنے

پبلشرز۔ دہلی کتاب گھر نیا محلہ پل بنگش دہلی

پرنٹرز۔ محبوب المطابع برقی پریس اردو بازار دہلی

فہرستِ مضامین

دیباچہ

شیخ سر عبدالقادر بالقابہ

میرے قدیم کرم فرما جناب تلوک چند صاحب محروم اپنے تخلص کی مناسبت سے دنیا کی بعض اور نعمتوں سے محروم رہتے ہوں تو اور بات ہے، مگر خدا داد لطفِ سخن اور موزونیٔ طبع سے انھیں حصّہ وافر ملا ہے۔ اور ان کا کلام خلعتِ قبولِ عام سے محروم نہیں رہا۔ بڑے بڑے سخنوروں نے اِن کی شاعری کو سراہا ہے، اور ان کے حُسنِ بیان کی تعریف کی ہے۔ شائقینِ اُردو ادب یہ سُن کے خوش ہوں گے کہ کلامِ محروم جو اس وقت تک بیشتر ادبی رسائل کے اوراق میں اور کچھ حصّہ مصنّف کے مسودوں میں محفوظ تھا، ایک دلچسپ مجموعے کی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ مجموعہ میرے سامنے ہے، اور میں جناب مصنّف کا شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے اشاعت سے پہلے اپنی کتاب کا ایک نسخہ مجھے عنایت کیا۔ اُن کی خواہش ہے کہ میں اِس کتاب کا دیباچہ لکھوں۔

یہ فرمائش اُن تعلقات کی بنا پر کی گئی ہے جو رسالہ مخزن کے دورِ اوّل

کے زمانے سے میرے اور جناب محرومؔ کے درمیان قائم ہیں۔ آپ کی کئی نظمیں پہلے مخزن میں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔ الفاظ کی برجستگی، بندش کی چستی، خیالات کی پاکیزگی حضرت محرومؔ کے اشعار کی خصوصیات ہیں۔ مگر اُن کی شاعری کا جو وصف مجھے خاص طور پر پسند ہے وہ یہ ہے کہ اس میں صلح و محبّت کی تلقین ہے۔ دنیا کے سب بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کی خوبیاں جناب محرومؔ کے پیشِ نظر ہیں — وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان والے سب کو عزّت کی نگاہ سے دیکھیں، اور اُن کی بیش بہا زندگیوں سے سبق حاصل کریں۔

ایک اور چیز جو ان کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہے، وہ کیفیتِ غم ہے۔ بہار ہو یا خزاں، قدرت کے ہر منظر کو دیکھ کر اُن کے دل کا کوئی نہ کوئی زخم تازہ ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے قدرت نے درد و گداز طبیعت میں حد سے زیادہ رکھا تھا، اس پر بعض ذاتی صدمات ایسے پیش آئے کہ شاعر سراپا درد ہو گیا۔ ان صدموں میں سے سب سے زیادہ اثر اس جان کاہ زمانے کا ہے، جب محرومؔ کی جوان بیوی شادی کے چند سال بعد ایک ننھّی سی لڑکی چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسی۔ اس کو بسترِ مرگ پر دیکھ کر جو کچھ ان کے دل پر گزری، ننھّی سی بیٹی کی بے بسی پر جو غم ہوا، اپنی خانہ ویرانی کا جو مسلسل نقشہ آنکھوں میں پھرا، یہ سب کیفیتیں نہایت درد بھرے لفظوں میں بیان ہوئی ہیں — اور اس حصّے کا عنوان طوفانِ غم ہے۔ ان نظموں میں سے ایک میں سب دنیاوی رشتوں کی ناپائداری کا بیان کرتے ہوئے کوششِ صبر کے

باوجود اپنی مجبورانہ اشک باری کا ذکر ان شعروں میں کیا گیا ہے ؎

کتنے ہی استوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن
رشتے یہ جتنے الفت و مہر و وفا کے ہیں

محروم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم
جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں

کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی
اشکوں کو کیا کروں! کہ یہ خود سر بلا کے ہیں

یہ درد اور اپنے نقصان کا احساس یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ کانٹے کی طرح ہر جگہ دل میں چبھتا رہتا ہے۔ شاعر کنارِ راوی پر بیٹھا ہے۔ قدرت اپنے دلچسپ نظارے دکھلا رہی ہے۔ مگر مغموم آنکھ اپنے غم کے سبب ان نظاروں کا لطف نہیں اٹھا سکتی۔ چنانچہ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آنکھ کھولی اُدھر ستاروں نے
جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے

گو اشارے کئے ہزاروں نے
آنکھ اُٹھائی نہ غم کے ماروں نے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

"فصلِ بہار" پر نظم لکھی ہے۔ بہار کی کیفیت کا نقشہ نہایت خوبی سے کھینچ رہے ہیں، کہ یکایک اپنا غم یاد آجاتا ہے، اور نظم اس بند پر ختم ہوتی ہے ؎

آمدِ گُل کا ہم کو کیا احساس
دل ہے پہلو میں کب سے کشتۂ یاس

یہ جو تالے ہیں زینتِ قرطاس
ہے فقط اپنی شاعری کا پاس

ورنہ ہم کو خزاں بہار ہے ایک
برگِ گل اور نوکِ خار ہے ایک

محرؔوم کی درد بھری طبیعت دوسروں کے درد کو بھی معمول سے زیادہ محسوس کرتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے بعض ہم عصروں کے بے وقت انتقال پر آنسو بہائے ہیں۔ جن میں سچّی محبّت اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ مولانا گرامیؔ، طاؔلب بنارسی، سرؔور جہاں آبادی، ناؔدر کاکوروی، چکبسؔت لکھنوی وہ حضرات تھے جن کے اشعار کلامِ محرؔوم کے ساتھ ساتھ بار بار زینتِ اوراقِ مخزنؔ ہوئے۔ محرؔوم کو اُن سے غائبانہ اُنس تھا۔ مگر وائے محرومی کہ وہ یکے بعد دیگرے چل بسے۔ گراؔمی اور طاؔلب تو خیر عمرِ طبعی کو پہنچ لئے تھے، گو اُن کے جانے سے شاعری کو نقصان پہنچا۔ مگر سرؔور، ناؔدر اور چکبسؔت جوانی میں اِس جہان سے رخصت ہوئے۔ اُن کی شاعری ابھی شباب پر تھی کہ وہ اپنے بے شمار مدّاحوں کو داغِ مفارقت دے گئے۔

جو مثالیں اوپر درج ہوئیں، اُن سے یہ سمجھنا چاہئے کہ شاعر صرف تصویرِ غم کھینچنے ہی میں اُستاد ہے۔ قوّتِ سخن خوشی کے منظر دکھانے سے بھی قاصر نہیں "ہلالِ عید" ایک دل کش نظم ہے۔ تمہید کا چلبلا پن اور اسلوبِ بیان قابلِ داد ہے ؎

دیکھو، دیکھو، وہ میں نے دیکھ لیا
قلۂ کوہ سے ذرا اونچا
چھپ گیا، چھپ گیا کہیں، دیکھو
پھر نظر آئے گا وہ ہیں، دیکھو
وہ جو ہے سامنے شجر، دیکھو
اُس سے اوپر اُٹھا نظر، دیکھو

اے لو، اے لو، وہیں نظر آیا
مژدہ اے شائقیں نظر آیا!

بندرابن میں صبح ہو رہی ہے۔ اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ مناظر قدرت سے شاعر کی دلچسپی اور ان کی تصویر سہل مگر رنگین الفاظ میں کھینچنا قابلِ توجہ ہے ؎

صبحِ خنداں، عروسِ تازہ — آئی مل کر شفق کا غازہ
آئی اور کس ادا سے آئی — شانوں پر کاکلیں طلائی
چہرہ اس کا وہ یعنی خورشید — بے پردہ، عدوِ حسرتِ دید
ہر چیز کو پرتوِ سحر سے — قدرت نے رنگا ہے رنگ زر سے

جمنا ابھی خواب سے اٹھی ہے
پیدا بشرے سے تازگی ہے!

طبع زاد نظموں کے علاوہ مرحوم کی ہمہ گیر طبیعت نے چمنِ اردو کی آرائش کے لئے ہر باغ سے پھول لئے ہیں۔ انگریزی میں شیکسپیئر کے ڈراموں سے بعض دلچسپ اشعار ترجمے کے لئے انتخاب کئے ہیں، اور ان کو اردو کا لباس ایسی خوبی سے پہنایا ہے کہ ان میں سے کئی پہچانے نہیں جاتے کہ اصل میں یہ انگریزی نژاد ہیں۔ مثلاً شبنم کے متعلق دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

وہی شبنم جو غنچے پر مثالِ گوہرِ غلطاں — نظر آتی تھی اِترائی ہوئی خود اپنی قسمت پر

برنگِ اشکِ چشمِ شاہد گل میں نمایاں ہے   کوئی ہو اشکِ یزداں جس طرح اپنی ندامت پر

چند صفحے "سیرِ گلستاں" کے زیرِ عنوان ایسے ہیں جن میں حضرت سعدی شیرازی کی گلستاں سے پند آمیز اشعار کا سادہ ترجمہ آسان اُردو میں کر دیا ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے ؎

لوگوں کی ملاقات کو جانا تو نہیں عیب
اتنا بھی نہ جاؤ کہ وہ کہہ دیں کہ نہ آؤ

ایک اور شعر سعدی کا ہے جو بے تکلف اُردو کے سانچے میں ڈھل گیا ہے ؎

پیچھے جو تجھ کو چھوڑ چلا، وہ شخص ترا ہمراہ نہیں
مت اس سے لگا تُو دل اپنا جس شخص کو تیری چاہ نہیں

محروم نے چونکہ عمر بھر محکمۂ تعلیم میں بسر کی ہے، خود اُن کے کلام میں بہت سے حصّے جوانوں اور بچّوں کے لئے نصیحت آمیز ہیں۔ آج کل نقّادانِ فن کا میلان اس رائے کی طرف ہے کہ نصیحت آمیز شاعری اصلی معنوں میں شاعری نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک شاعری جذبات کے طوفانِ بے پایاں کا نام ہے۔ یا تخیل کی نزاکتوں اور معنی آفرینیوں کا۔ البتہ اگر کوئی اُستاد معمولی مضامین میں بھی اپنی کاری گری سے رنگ بھرے تو وہ پند آمیز کلام کا رتبہ بلند کر دیتا ہے۔ محروم جا بجا اس فن میں کامیاب ہوئے ہیں۔ گو کہیں کہیں نصیحت صرف منظوم نصیحت رہ گئی ہے۔ پند رنگیں کا نمونہ دیکھنا ہو تو ایک نظم دیکھئے جس میں شراب کی مذّمت کی گئی ہے۔ شراب کی تعریف میں تو بہت سی رنگین شاعری ہو چکی ہے۔ اب

مذمتِ شراب میں محروم کی طبیعت کا رنگ دیکھئے ؎

فریب رہا ہر نے تدبیرِ جاں ستانی کی | کہ شکل آگ نے کی اختیار پانی کی
نہ حور ہے نہ یہ کوئی پری ہے شیشے میں | رہے خیال کہ آتش بھری ہے شیشے میں

ایک نظم اُستاد کے عنوان سے لکھی ہے، اس کے دو شعر قابلِ ملاحظہ ہیں۔ ایک میں کس سچائی سے تعلیم کی صحیح تعریف بیان کی گئی ہے۔ دوسرے میں واقعات حاضرہ پر دو مصرعوں کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے ؎

نہاں ہیں فطرتِ انساں میں جو ہر عالی | ہنر سے اپنے ہے کرتا انھیں عیاں اُستاد
دلوں کی ہوتی تھی تعلیم فیضِ دل سے کبھی | زباں ہی آج تو شاگرد ہے، زباں اُستاد

میں نے چند نظموں کے نمونے پیش کئے ہیں۔ ان کی رنگا رنگی اصل مجموعے میں نظر آئے گی جس میں ہر مذاق کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ مہاتما بدھ ایوانِ شاہی سے رُخصت ہو رہے ہیں۔ یہ سین بہت خوبی سے نظم کیا گیا ہے۔ رامائن سے ایک سین لیا ہے اور رام چندر جی کے بَن باس کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ رباعیات ہیں، قطعات ہیں۔ تصوّف اور معرفت کا رنگ بھی موجود ہے۔ اس کی دو مثالیں درج کرتا ہوں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی نگاہ قدرت کے گوناگوں نظاروں سے کس طرح اپنے فطرتی وجدان کو بڑھاتی ہے ؎

(۱)

چمن میں، دشت میں، وادی میں، کوہ و صحرا میں | گہر میں، اولے میں شبنم میں، ابر و دریا میں

شرر میں، شعلے میں، آتش میں، برقِ سینا میں   شمیم گُل میں، نسیم مسرت افزا میں

یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں

(۲)

آبشاروں کا ترنّم ترے بہلانے کو   لالہ زاروں کا تبسّم ترے بہلانے کو

دن کو ہنگامۂ مردُم ترے بہلانے کو   رات کو محفلِ انجُم ترے بہلانے کو

مجھ کو دی تابِ تکلّم ترے بہلانے کو

اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل تو خطا کس کی ہے؟

اِس تقریب کو ختم کرنے سے پہلے میں دو باتیں خاص طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ جناب محروم اُن ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی عمر بھر کی محنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ جس سے دونوں کو فائدہ اُٹھانے کا حق ہے، اور جس کی خدمت دونوں کے ذمّے ہے۔ خدا کرے کہ آپ دیر تک اُردو کی خدمت کے لئے زندہ سلامت رہیں۔ دوسری بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ ہم اس امر پر فخر کر سکتے ہیں کہ محروم کا زادِ بوم سرزمین پنجاب ہے۔ میں نے جب تک اُنھیں دیکھا نہ تھا، اور خط و کتابت کے ذریعے انھیں جانتا تھا، تو اُن کے کلام سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ صوبجاتِ متّحدہ کے کسی حصّے کے رہنے والے ہیں۔ جب ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ پنجاب کے اُس گوشے کے رہنے والے ہیں جہاں اُردو

کا چرچا بہت کم ہے ضلع میانوالی آپ کا مسکن ہے۔ اس جنگل میں خدا نے وہ خودرو
پھول پیدا کیا جس کی خوشبو دہلی اور لکھنؤ تک پھیلی۔ جناب محروم کے کلام کے متعلق
حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم نے یہ رُباعی لکھ کر اُن کی طباعی کی تعریف کی تھی ؎

لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے داد کا مستحق کلامِ محروم
اُن کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم
ہے اُن کا سخن مفید و دانش آموز

محروم نے اس داد کا شکریہ ایک رُباعی میں ادا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ؎

طبعِ موزوں خدائے برتر سے ملی
تاثیرِ کلام قلبِ مضطر سے ملی
آیا مجھ کو یقیں کہ شاعر ہوں میں
جب دادِ سخن جنابِ اکبر سے ملی

میں نے شملہ کے مشاعرے میں، اور اس کے بعد لاہور کے بعض مشاعروں
میں جناب محروم کو پڑھتے سُنا ہے۔ ان کا لہجہ سرحدی علاقے کا لہجہ ہے۔ گو اُن کا
پڑھنا ایک خاص انداز رکھتا ہے۔ مگر اسے سن کر اُن کی صفائی زبان پر اور بھی
تعجب ہوتا ہے اور ان کی کوشش اور کاوش کی داد دینی پڑتی ہے۔

(سر) عبدالقادر
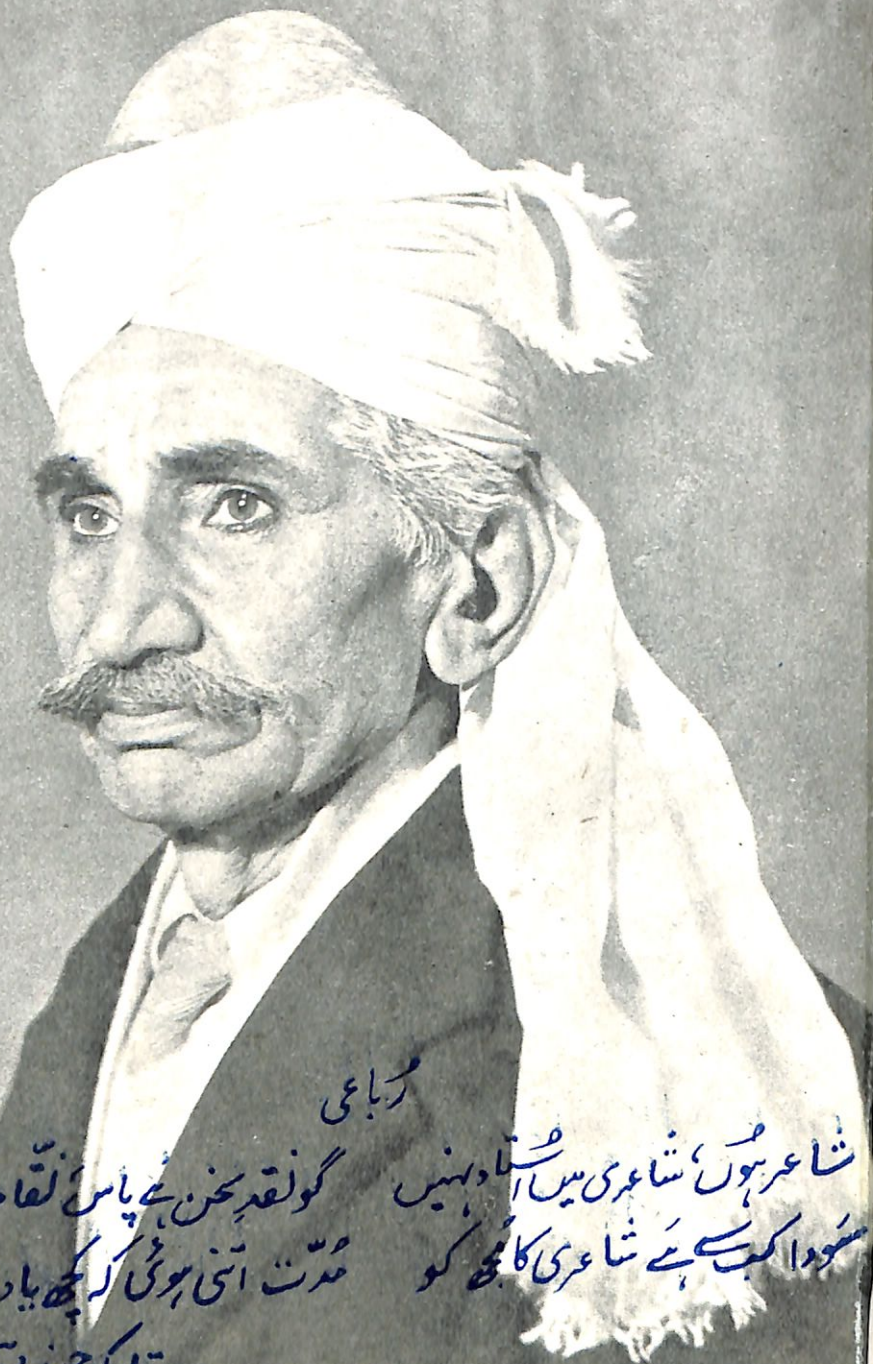
رباعی

شاعر ہوں، شاعری میں اُستاد نہیں گو نقدِ سخن ہے پاس نقّاد نہیں
سودا کب سے ہے شاعری کا مجھ کو مُدّت اتنی ہوئی کہ کچھ یاد نہیں!

تلوک چند محروم

زمزمۂ توحید

ہر ذرّے میں ہے ظہور تیرا — خورشید و قمر میں نور تیرا
افسانہ ترا جہاں تہاں ہے — چرچا ہے قریب و دور تیرا
ہر ذرّۂ خاک میں ہے لمعاں — مخصوص نہیں ہے طور تیرا
محتاجِ شراب و جام کب ہے — جس دل کو ہوا سرور تیرا
گاتے ہیں سحر ہوا میں کیا کیا — دم بھرتے ہیں سب طیور تیرا

تو جلوہ فگن کہاں نہیں ہے
وہ جا نہیں، تو جہاں نہیں ہے

تاروں میں چمک دمک تری ہے — جو رعد میں ہے کڑک، تری ہے
اے باعثِ رونقِ گلستاں — شاخوں میں لہک لچک تری ہے
ہر غنچے میں ہے ترا تبسّم — ہر گل میں بھری مہک تری ہے
نغمے مرغانِ خوش گلو کے — کہتے ہیں یہ سب چہک تری ہے
کہتی ہے کلی کلی زباں سے — میری یہ نہیں چٹک تری ہے

بشگفتہ ہے تو چمن چمن میں
خنداں ہے گُلاب و یاسمن میں!

خُوبوں میں ہے تیرا حُسنِ رعنا — ہر ایک حسیں ادا کا پُتلا
نوکِ مژہ میں تری خلش ہے — عُشاق کے دل میں ہے جو کانٹا
بانکی چتون، کٹیلی آنکھیں — گر ان میں نہ ہو تُو کارفرما
ہیں صورتِ تیغِ زنگ آلود — جس کا نہ اثر ہو دل پہ اصلا
اُس چہرے میں سادگی ہے تیری — چہرہ جو کوئی ہے بھولا بھالا

یکتائے زمانہ حُسن تیرا
عالم میں فسانہ حُسن تیرا!

اے معنیٔ نازِ نازنیناں — وے نُورِ جبینِ مہ جبیناں
عالم ہے نگارخانہ تجھ سے — اے مایۂ خوبیٔ حسیناں
تیرے ہی یہ ولولے ہیں دل میں — اے ذوقِ دلِ جمال بیناں
ہیں صبر و قرار تجھ سے قائم — اے مرہمِ زخمِ غم قریناں
او وجہِ تسلیٔ دلِ زار — او موجبِ راحتِ حزیناں

پروانے کو تیری ہی لگن ہے
اور شمع میں تیری ہی جلن ہے

ناقوس میں تُو، اذاں میں تُو ہے — ہر شور میں، ہر فغاں میں تُو ہے

گنگا میں ہیں اُٹھتی تیری موجیں ۔۔۔ زمزم کی صفائے جاں میں تُو ہے
ہر قافلے میں تری صدا ہے ۔۔۔ ہر منزلِ دہر نشاں میں تُو ہے
ہے تیرے بغیر کون موجود ۔۔۔ ہے کوئی اگر جہاں میں تُو ہے
ہے دیر و حرم میں تیرا جلوہ ۔۔۔ القصّہ مکاں مکاں میں تُو ہے

سجدہ ہے ترا ہر اک کا مقصود
خالق تُو ہے سب کا اور معبود!

یہ کشمکشِ حیات کیا ہے ۔۔۔ تیرا ہو کرم تو بات کیا ہے
اے رہبرِ کاروانِ ہستی ۔۔۔ راہِ غم مشکلات کیا ہے
تُو جس کو دکھا دے اک تجلّی ۔۔۔ کیا جانے وہ غم کی رات کیا ہے
جو مل گئے تجھ میں، اُن کے آگے ۔۔۔ تمیزِ صفات و ذات کیا ہے
جس نے تجھ میں سمائی پا لی ۔۔۔ پھر اُس کو غمِ ممات کیا ہے

ہر ذرّے میں تیری جستجو ہے
محروم کو بھی اک آرزو ہے!

(۱۹۰۶ء)

ترانۂ وحدت

ہے نظارہ محوِ حیرت، کہ جہاں ہیں تُو ہی تُو ہے
کہیں آب ہے گُہر میں، کہیں گُل میں رنگ و بُو ہے!

مہ و مہر میں درخشاں، تو نجوم میں ہے تاباں
ترا نُور ہر طرف ہے، ترا جلوہ چار سُو ہے

دلِ سنگ میں شرر تُو، تو فلک پہ ہے قمر تُو
ہے زمیں پہ جلوہ گر تُو سرِ آسماں بھی تُو ہے

تُو ہی بحر میں رواں ہے، تُو نسیم میں وزاں ہے
تُو یہاں نہیں وہاں ہے، یہ فضول گفتگُو ہے

ترے شوق میں بہائے ہیں چمن نے اشکِ شبنم
تو اسی سے اس کی رونق ہے، اسی سے آبرُو ہے

ترے عشق میں ہوا ہے گُلِ تر جو چاک داماں
تو اسی لئے چمن میں وہ بہت شگفتہ رُو ہے

وہ کرشمہ اب دکھا دے کہ رہے مری زباں پر
"مجھے تیری آرزو ہے"! "مجھے تیری آرزُو ہے"!

تُو ہی تُو ہے

(تضمین)

نہ دل میں وہ ہنگامۂ آرزو ہے　　نہ آنکھوں میں بیتابیٔ جستجو ہے
نہ لب پر غمِ ہجر کی گفتگو ہے　　نہ وحشت نہ وہ شورشِ ہاؤہُو ہے

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے!

نہ وہ سحر کی جلوہ سامانیوں میں　　طیورِ سحر کی نوا خوانیوں میں
فضائے چمن کی گُل افشانیوں میں　　ہواؤں میں، خُنکی میں، ویرانیوں میں

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے!

شجر میں، حجر میں، گُل و خار میں تُو　　گُلستاں میں تُو، برگ و اشجار میں تُو
بیابان و صحرا و گُلزار میں تُو　　عیاں وادی و دشت و کُہسار میں تُو

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے!

نہیں گو بہ قیدِ مکان و زماں تُو　　زمیں پر، فضا میں، سرِ آسماں تُو
کہوں کیا، کہاں ہے، نہیں ہے کہاں تُو　　نہاں تُو، عیاں تُو، یہاں تُو، وہاں تُو

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے!

جدھر دیکھتا ہوں، تجھے دیکھتا ہوں　　نظر حُسنِ جاں بخش پر تیرے مفتُوں
سرِ خاک و بالائے ایوانِ گردُوں　　بصد جلوہ ظاہر تری ذاتِ بیچُوں

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے!

یہ کِس کے جلوے ہیں سارے؟

فلک پہ مہر و مہِ پُر ضیا کے جلوے ہیں　　زمیں پہ لالہ و گُل کی ادا کے جلوے ہیں
بُتانِ مہر وش و مہ لقا کے جلوے ہیں　　قسم خدا کی، غضب کے بَلا کے جلوے ہیں

یہ سارے جلوے ہیں کِس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

بتا وُہ مہرِ منوّر میں نور کِس کا ہے؟　　میانِ انجمِ تاباں ظہور کِس کا ہے؟
یہ سُجھ میں اے دلِ شاعر سُرور کِس کا ہے؟　　دماغِ فلسفی! تجھ میں شعور کِس کا ہے؟

یہ سارے جلوے ہیں کِس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

نجومِ شب میں بلند اختری اُسی کی ہے　　جو چاندنی میں ہے جاں پروری اُسی کی ہے
ضیا ہر ایک کُرہ میں بھری اُسی کی ہے　　اُسی کا نور ہے، جلوہ گری اُسی کی ہے

یہ سارے جلوے ہیں کِس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

وہی ہے رعد میں، بجلی میں، دریا دل میں　　　اُسی کے دم سے ہے منگل ہر ایک جنگل میں
اُسی کی بُو ہے گُلوں میں اسی کا رس پھل میں　　　اُسی کی نکہت تر ہے صبا کے آنچل میں

یہ سارے جلوے ہیں کِس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

ہر ایک برگ چمن اُس کا ہے پتا دیتا　　　جو گُل سے پُوچھو، تو وہ بھی ہے مُسکرا دیتا
ہر ایک سرو جو اُنگلی ہے یوں اُٹھا دیتا　　　نشاں اُسی کا ہمیں ہے یہ برملا دیتا

یہ سارے جلوے ہیں کِس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

اُسی کا داغ ہے لالے کے دل میں دیکھو تو　　　وہی ہے دیدۂ نرگس کے تِل میں، دیکھو تو
وہی تو پھولوں کی ہے آب و گِل میں دیکھو تو　　　لکھا ہے ہر ورقِ منتخِل میں، دیکھو تو

یہ سارے جلوے ہیں کِس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

چمن میں، دشت میں، وادی میں، کوہ و صحرا میں　　　گُہر میں، اولے میں، شبنم میں، ابر و دریا میں
شرر میں، شعلے میں، آتش میں، برقِ سینا میں　　　شمیمِ گُل میں، نسیمِ مسرّت افزا میں

یہ سارے جلوے ہیں کِس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

اُسی کے جلوے ہیں سارے، جو چشمِ بینا ہو　　　تمام ذرّے ہیں تارے، جو چشمِ بینا ہو
وہ روبرو ہے ہمارے، جو چشمِ بینا ہو　　　بشر زباں سے پکارے، جو چشمِ بینا ہو

یہ سارے جلوے ہیں کِس کے؟ خدا کے جلوے ہیں!

(سنہ ۱۹۱۱ء)

خطا کس کی ہے؟

غنچہ و گُل میں ذرا دیکھ ادا کس کی ہے؟ سبزۂ تر میں لہک کس کی؟ فضا کس کی ہے؟

سرو ریحان میں بھلا نشو و نما کس کی ہے؟ گہری سبزی جو ہے پتّوں میں بتا کس کی ہے؟

جلوہ فرمائی یہ سب اُس کے سوا کس کی ہے؟

اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے؟

گُلِ شاداب کا شیدا ہے بہت تُو اے دل ہنسنے والوں کی تجھے بھاتی ہے خُو بُو اے دل

جانفزا تیرے لئے رنگ ہے اور بُو اے دل روز و شب جوشِ بہاراں ہے ہر اک سُو اے دل

کہیں نیلوفرِ خنداں، کہیں شبّو اے دل!

اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے؟

ہے نظر پرورِ عشاق جلالِ جاناں — جان لیتا نہیں، دیتا ہے ملالِ جاناں
سرسری سا تجھے رہتا ہے خیالِ جاناں — ورنہ مشکل نہیں اتنا تو وصالِ جاناں
ذرے ذرے میں چمکتا ہے جمالِ جاناں
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے؟

چہچہاتے ہیں پرندے چمنستانوں میں — مائلِ رقص ہیں طاؤس خیابانوں میں
وحش ہیں چوکڑیاں بھرتے بیابانوں میں — وہ بھی دلشاد ہیں جو رہتے ہیں ویرانوں میں
تجھ کو اللہ نے پیدا کیا انسانوں میں
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے؟

آبشاروں کا ترنم ترے بہلانے کو — لالہ زاروں کا تبسم ترے بہلانے کو
دن کو ہنگامۂ مردم ترے بہلانے کو — رات کو محفلِ انجم ترے بہلانے کو
مجھ کو دی تابِ تکلم ترے بہلانے کو
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل تو خطا کس کی ہے؟

چاندنی تیرے لئے اس نے بنائی کیسی — خاک کے فرش پہ چادر یہ بچھائی کیسی
چرخ پر ماہ کی ہے جلوہ نمائی کیسی — رُخِ پُرنور میں اس کے ہے صفائی کیسی
دیکھ صانع نے یہ صنعت ہے دکھائی کیسی
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے!

اور ایسے ہی ہزاروں ہیں نظارے دلکش　　جانفزا ایک سے اک جتنے ہیں سارے دلکش
آتشِ حُسن کے آ دیکھ شرارے دلکش　　ہیں سرِ ارض و سما پھُول ستارے دلکش
کتنے دلچسپ ہیں، کیسے ہیں یہ پیارے دلکش!
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے؟

غم و اندوہ میں محرم جو پاتا ہے تجھے　　سبقِ تازہ مسرت کا پڑھاتا ہے تجھے!
لے کے ہر روز جو ویرانے میں جاتا ہے تجھے　　مرحلے راہِ حقیقت کے دکھاتا ہے تجھے؛
بات جو غیب سے سُنتا ہے، سناتا ہے تجھے
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل! تو خطا کس کی ہے؟

رازِ ہستی

یعنی

تضمینِ غزلِ جناب طالب بنارسی

تجھے منزلِ دہر میں سوچ ذرا، یہ خیال ہے، خوف و خطر ہی نہیں
ترے سر پہ تنی ہوئی تیغِ قضا، وہ ہے جس سے کسی کو مفر ہی نہیں
ترا دائمی گھر ہے یہ دارِ فنا؛ کہ سوا دِ بقا پہ نظر ہی نہیں
سرِ کوچۂ حرص و ہوا سے ترا، سوئے راہِ نجات گذر ہی نہیں
اسے جانے تو کیا، اے اسیرِ بلا، تجھے آپ جب اپنی خبر ہی نہیں!

یہ جو صدمۂ دردِ فراق سہا، تو قصور ہے اس میں ترا ہی ترا
تری عقل پہ پردہ کچھ ایسا پڑا، کہ خیالِ دوا و دعا نہ رہا
یہ خودی نہیں موت ہے مردِ خدا، کہ یہ دیتی ہے جانِ جہاں کو چھپا
جو خودی کے مرض سے رہے تو جدا، تو ہو سامنے جلوۂ نورِ خدا
ابھی پردۂ رخ وہ اٹھا دے مگر، ترے جذبۂ دل میں اثر ہی نہیں!

پئے عزت و شوکت و حشمت و زر، تو جہان میں پھرتا ہے خاک بسر

ترے کینۂ دل میں ہیں لعل و گہر، یونہی مٹی تو اپنی خراب نہ کر
تری آبرو ہے ترے پاس مگر، تجھے رازِ دروں کی نہیں ہے خبر
تجھے آبرو کا ہے خیال اگر، تو بشک نہ تو بحرِ جہاں میں بشر
کہ جو قطرہ صدف میں بنائے نہ گھر، وہ گہر ہی نہیں وہ گہر ہی نہیں

کبھی ابرِ کرم سے نہ بوندگری، ہوئی آہ! نہ شاخِ اُمید ہری
ترے دل کی کلی نہ کھلی نہ کھلی، ترے باغ میں موجِ صبا نہ چلی!
نظر آئی نہ صبحِ وصال کبھی، شبِ غم نہ ٹلی، نہ ٹلی، نہ ٹلی!
جسے ڈھونڈ رہا تھا حرم میں کبھی، کبھی دیر میں جس کی تلاش رہی
رگِ جاں سے وہ تیری قریب رہا، تری آنکھیں نہیں ہیں نظر ہی نہیں!

تو ہے دربدر ہوا تجھ کو یہ کیا، کہ بصورتِ ذرہ ہے جلوہ نما
ترا آئنہ زنگ میں چھپنے لگا، اسے دے کے جِلا وہی رُوپ دکھا
ترے سامنے ہے یمِ صدق و صفا، یہیں غوطہ لگا، یہیں غوطہ لگا
جو ہے قطرۂ بحرِ عمیقِ بقا، تو بہ شکلِ حباب نہ سر کو اُٹھا
کہ جو سیلِ طریقتِ حق میں ملا، وہ اُٹھا سکے سر یہ جگر ہی نہیں!

نہ ہو کشتۂ تیغِ ثواب و خطا، نہ تڑپ تہِ خنجرِ بیم و رجا
نہ تو گنگ کو جا نہ چمن میں نہا، کسی دشت کی جا کے نہ خاک اُڑا
نہ ہی بن میں تو بیٹھ کے دھونی رما، نہ بدن پہ تو اپنے بھبوت لگا

نہ تو دیر و حرم کے طواف کو جا، نہ تو صدمۂ دورِ و دراز اُٹھا
جسے دل کے وطن میں وہ یار ملا، اُسے حاجتِ رنجِ سفر ہی نہیں!

نہیں طالعِ نیک جو ساتھ سدا، نہ نصیب بُرا نہ قضا کی خطا
تو ہے آپ ہی اپنا حسُود ہوا، تجھے اپنے کئے کی ہے ملتی سزا
تو اک ایسے عدو کو ہے پال رہا، ترے خونِ جگر سے ہے جس کی غذا
ترے بر میں جو موذی ہے نفس ترا، اُسے مار گرا، اُسے مار گرا
یہ وہ بد ہے بلا، یہ وہ بد ہے بلا، کوئی شقی اس سے بتر ہی نہیں!

اُٹھو دیکھو جہانِ خراب ہے یہ، نہیں زیست خمارِ شراب ہے یہ
نہیں منزلِ عیش جناب ہے یہ، اُٹھو، جاگو کہ دارِ عذاب ہے یہ
عدم اس کو کہیں تو صواب ہے یہ، کہ ازل سے عدم کا جواب ہے یہ
یہ گھر تو نہیں ہے حباب ہے یہ، یہ جہاں نہیں عالمِ خواب ہے یہ
نہیں آب ہے بلکہ سراب ہے یہ، اسے چھوڑے بغیر گذر ہی نہیں!

نہ بہارِ نشاطِ دو روزہ پہ مر، کہ ہے باغِ جہاں میں خزاں کا گذر
یہ طلسم ہے سارا فریبِ نظر، نہ ہے غنچہ تر، نہ شجر نہ ثمر
جو دکھے تو مآلِ جہاں کی خبر، تو اُٹھائے کبھی نہ ملالِ ضرر
رہا طالبِ عیشِ فنا تو اگر، تو حریمِ بقا کی اُمید نہ کر
یہ وہ دام ہے جس سے گذر ہی نہیں، یہ وہ شام ہے جس کی سحر ہی نہیں!

(۱۹۰۹ء)

سرورِ ازل

شہنشاہِ بابر اور گورو نانک دیو کا مکالمہ

بابر

ہماری بزمِ عشرت میں جو لے آیا خدا، بابا
تو بسم اللہ! جامِ بادۂ احمر چڑھا، بابا

جہاں میں آبِ رز سے کونسا ہے پاک تر پانی
کہ دھل جاتا ہے جس سے دفترِ ماوشما، بابا

نہ میخانے کو دیکھا چاہیئے چشمِ حقارت سے
کہ ہوتی ہے یہیں سے بیخودی کی ابتدا، بابا

نہ یوں ہی میکشوں کو خاک پر بیٹھا ہوا دیکھو
پہنچتی ہے نظر اُن کی سرِ فوق السما، بابا

صدا حق حق کی سُنتے ہیں سدا وہ شیشۂ مے سے
اسی سے دل ہیں رندوں کے حقیقت آشنا، بابا

صُراحی کھولتی ہے رازِ دل جب بانگِ قُلقُل سے
فلک سے ہیں پکار اُٹھتے ملائک مرحبا، بابا

نہ ہو گلبانگ مستوں کی تو دنیا بزمِ ماتم ہو
ہمارے دم سے کچھ کچھ زندہ ہے ارض الفنا، بابا

غنیمت جان کر صحبت کو اک دو جام پیتا جا
میانِ محفلِ رندانِ دُرد آشام پیتا جا!

گورو نانک دیو

مُبارک ہو مئے احمر تجھے، صاحبقران تیری
رکھے بس سُرخرو تجھ کو، شرابِ ارغوان تیری

دلِ فرخندہ تیرا، واقفِ رمزِ حقیقت ہے
اگر ہے ترجمانِ دل، حقیقت میں زبان تیری

مگر جب کیفیتِ دل میں ہے کیفِ مے کی حاجت کیا
غرض محفل سے کیا؟ خلوت ہو جب رشکِ جناں تیری

مئے انگور پی کر کوئی متوالا ہوا تو کیا؟
رہا بے کیف دل، شغلِ مئے مینا ہوا تو کیا؟

وہ مَے اپنی ہے جس سے بن پئے مخمور رہتے ہیں
خیالِ چشمِ ساقی کے نشے میں چُور رہتے ہیں

وہ میکش ہیں، کہ ہر دم ماہ اپنے جام و ساغر ہیں
جو صہبائے مروّق سے سدا بھرپور رہتے ہیں

ہمارا دورِ مے ہر ہر نفس کے ساتھ چلتا ہے
اسی سے ہر نفس، ہر لحظہ ہم مسرور رہتے ہیں

کثافت رُوح میں آلائشِ دُنیا سے آتی ہے
شرابِ ظاہری سے اہلِ باطن دُور رہتے ہیں

چڑھا دو اُن کو سُولی پر بھی تو حق حق سناتے ہیں
جو عاشق ہیں وہ سرشارِ مئے منصور رہتے ہیں

لُنڈھائے ہوں جنھوں نے خُم کے خُم صہبائے عرفاں کے
کہاں وہ طالبِ افشردۂ انگور رہتے ہیں

مناسب ہے یہی، ترکِ مئے انگور کر شاہا
ہمارے جام سے تھوڑی سی اب منظور کر شاہا!

(نومبر سنہ ۱۹۱۳ء)

جذباتِ فطرت

مُبارک بادِ نوروز

عشرت ہے صلائے عامِ نوروز	خورشیدِ سحر ہے جامِ نوروز
ہے بارشِ انبساط ہر سُو	عالم میں ہے فیضِ عامِ نوروز
اٹھلاتی ہوئی نسیم آئی	وہ پیکِ سُبک خرامِ نوروز
سُنتے ہی یہ مژدہ کھِل گئے پھُول	لایا ہے کوئی پیامِ نوروز
چھیڑا وہیں نغمۂ مسرّت	بُلبل نے سُنا جو نامِ نوروز
لالے نے اُٹھا لیا پیالہ	بھر مئے لعل فامِ نوروز
خوبانِ چمن ہیں محفل آرا	زوروں پہ ہے اہتمامِ نوروز
منزل گہِ نوبہار ہے یا	ہے صحنِ چمن مقامِ نوروز
طائر ہوئے قیدِ غم سے آزاد	ہو کر پابستۂ دامِ نوروز

لہراتے ہیں یل کے یہ ترانہ
نوروز! ترا مبارک آنا!

آنا نوروز کا مبارک — دنیا کو ہو دن نیا مبارک
خوش آمدی اے نگارِ نوروز — مقدم تیرا بسا مبارک
ہے جلوہ فروز مہرِ نوروز — یہ طلعتِ جانفزا مبارک
عالم ہے نگارخانۂ چیں — یہ منظرِ دل کشا مبارک
مرغانِ سحر ہیں نغمہ پیرا — دیتے ہیں جہاں کو یا مبارک
ہو سال نیا نشاط کا سال — اس سال کی ابتدا مبارک
ہر لحظہ ہو مایۂ سعادت — ساعت نہ ہو ایک نامبارک
ہر روز سنیں نئی بشارت — کانوں میں پڑے صدا مبارک

گونجے دنیا میں یہ ترانہ
نوروز! ترا مبارک آنا!

مہاتما بدھ

ایوانِ شاہی میں آخری رات

اے زمینِ خاک برسر! یوں نہ ہو اندوہ گیں — میں شریکِ غم ہوں تیرا، ہوں تری خاطر حزیں

تیری خاطر، اور ترے بچوں کی خاطر اے زمیں — مضطرب ہوں میں، مرے دل کو قرار اصلا نہیں

نیم بسمل میں بھی ہوں، تو ہے اگر نخچیرِ غم

لے لیا اپنے جگر پر میں نے تیرا تیرِ غم!

ماتمی صورت ہے تیری اے سیہ پوش آسماں — تو گھٹا ہے سوزِ غم کی، یا ہے آہوں کا دھواں

اشکِ خوں دامن پہ ہیں، یا ہیں شفق کی سرخیاں — داغِ تاباں ہیں مہ و خورشید سینے میں عیاں

تو ہے محزوں اہلِ عالم کے مصائب دیکھ کر

شامِ غم، صبحِ قیامت ہیں مرے شام و سحر!

اے ستارو! تم سراپا ہو گئے چشمِ انتظار — دیکھتے ہو میری جانب صورتِ امیدوار

لو اب آیا میں، اب آیا، تم پہ ہونے کو نثار — کب سے ہوں آوارگی کی آرزو میں بیقرار

آہ، میں جکڑا ہوا سونے کی زنجیروں میں ہوں
ہر گھڑی آزاد ہو جانے کی تدبیروں میں ہوں!

عشرتِ ایّامِ آغازِ جوانی، الوداع — الوداع اے ذوق و شوقِ عیشِ فانی الوداع
الوداع اے تاج و تختِ مرزبانی، الوداع — الوداع اے خرّمی، اے شادمانی، الوداع

الوداع اے حسرتِ لیل و نہارِ آرزو
اے دلِ غم دیدہ بن جا تو مزارِ آرزو!

آہ! یہ تیری جدائی آہ! اے آرامِ جاں — اُف! تڑپتا ہے مچلتا ہے دلِ ناشادماں
تجھ کو سوتا چھوڑ جاؤں سنگ دل ایسا کہاں — آئینہ رُو! تیری فرقت مجھ پہ ہے کوہِ گراں

عزم راسخ ہے مگر مُنہ تجھ سے موڑوں کس طرح؟
رشتۂ عہدِ وفا کو آہ! توڑوں کس طرح؟

تیری فرقت اور پھر اُس گوہرِ شہوار کی — اپنی تابش سے ہے جو زینِ تاجِ خسروی
جس کو نیسانِ محبّت نے عطا کی زندگی — آب و تابِ زیست بڑھ جائے گی جس سے قوی

شمعِ دل افسردہ ہو گا خانۂ جاں کے لئے
مایۂ نورِ بصارت چشمِ حیراں کے لئے!

اے فریبِ اُلفتِ فانی! نہ تو ٹھگا مجھے — آہ اے جھوٹی محبت، دے نہ اب دھوکا مجھے
دیدنی ہے رُوئے گُل، پر اس سے مطلب کیا مجھے — گھر نظر آیا ریاضِ دہر کانٹوں کا مجھے

یہ کشاکش ہائے بے جا ہیں سلاسِل کی طرح
توڑ دوں ان کو طلسمِ نقشِ باطل کی طرح!

رخصت اے ماں باپ، بیوی، رخصت اے اہلِ دیار
دیکھنا میری جدائی پر نہ ہونا اشکبار

کی تمہارے ہی لئے میں نے یہ فرقت اختیار
دیکھئے کیا کیا دکھائے گردشِ لیل و نہار

المدد! اے جستجوئے صادقِ راہِ نجات
کونسی خلوت میں ہے اے شمعِ رازِ کائنات؟

سُرورِ جہان آبادی

اے سُرورِ نکتہ داں، اے شاعرِ رنگیں بیاں — اے کہ گُل ریزی سے تیری ہے بہ باغِ جناں

بزمِ رازِ عالمِ بالا کا ہے تُو رازداں — تیرے نغموں پر لگے رہتے ہیں گوشِ قُدسیاں

حق نے بخشا ہے تجھے جاں بخش اعجازِ سخن

چُٹکیاں لیتا ہے دل میں تیرا اندازِ سخن!

سحر ہے، افسوں، جادو ہے تری گفتار میں — معنیٔ تاثیر پنہاں ہیں ترے اشعار میں

گُل کو رنگت تیری رنگینی سے ہے گلزار میں — تیری طبعِ موج زا کی موج ہے انہار میں

ہر نفس میں ہے ترے کیا کیا مسیحا پروری

ہنر کو حاصل ہے چوتھے آسماں پر برتری!

شاہدِ مضموں میں تیرے شوخیٔ جانانہ ہے — ہر ادا مستانہ ہے، ہر ناز معشوقانہ ہے

شمعِ معنی پر تری بزمِ سخن پروانہ ہے — داستاں جو ہے، دلِ پرسوز کا افسانہ ہے

ہوک اُٹھتی ہے جگر سے تیری اِک اِک آہ پر

تیر سے آ کر برستے ہیں دلِ آگاہ پر!

شاہدِ نیّر کا حُسنِ جاں فزا دیکھے کوئی | یا تری تحریر میں تیری ادا دیکھے کوئی
سازِ بزمِ راز کی سُن کر صدا دیکھے کوئی | ہے یہ کس کا نغمۂ رنگیں ذرا دیکھے کوئی

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا" (غالب)

ساقیٔ بزمِ سخن کے گو ہیں متوالے بہت | ہیں عروسِ شاعری کے چاہنے والے بہت
روتے ہیں چھم چھم دلوں میں پھُوٹ کر چھالے بہت | اُٹھتے ہیں دستِ دعا بن بن کے گونالے بہت

ہے مگر وہ شاہدِ رعنا ترے آغوش میں
جوششِ گریہ کا عالم غیر کے سر جوش میں!

حُسنِ معنی کی جھلک جلوہ ہے برقِ طُور کا | طبعِ روشن سے تری روشن ہے مضمون نُور کا
نت نیا پردہ اُٹھا کر طلعتِ مستُور کا | اہلِ عالم کو دکھاتا ہے تماشا نُور کا

دل ترا ہے یا کہ ہے گنجینۂ اسرارِ حق
یہ زباں ہے یا کہ ہے آئینۂ اسرارِ حق!

جو طبیعت میں تری ہے گُل میں رنگینی کہاں | شعرِ نازک کو ترے پہنچے بُت چینی کہاں
نکتہ چینوں کے لئے جائے سخن چینی کہاں | مجمعِ خوبی ہے تو بد بین و بد بینی کہاں

نثر پہ تیری کروں عقدِ ثریّا کو نثار
نظم پر قرباں تری صد سلکِ دُرِّ شاہوار!

ہے ترے نغموں سے باقی ہند میں شانِ سخن
ہو قیامت تک نہ بے یوسف یہ کنعانِ سخن

اے سرودِ نغمہ بار، اے ابرِ نیسانِ سخن
ہے برسنے سے ترے سرسبز بُستانِ سخن

کلکِ گُل افشاں ترا کرلے اگر عزمِ نشاط
ہند کی اُجڑی ہوئی نگری ہو پھر بزمِ نشاط

مرگِ آزادی پہ اک ماتم بپا بھارت میں ہے
رونا دھونا شاعرانِ ہند کی قسمت میں ہے

ماری ماری آہ پھرتی ہے، عجب آفت میں ہے
حاجبِ بابِ اجابت نشۂ غفلت میں ہے

کارواں نالوں کا بھیجیں کر کے اک تنہا ہم
تیرے نالوں کو بنا دیں کارواں سالار ہم

تجھ کو زیبا نازشِ بے حد، جہاں آباد ہے
تجھ میں ایسا مایۂ فخرِ جہاں، آباد ہے

کیا مبارک شہر ہے تو، وہ جہاں آباد ہے
دم سے جس کے نظمِ اُردو کا جہاں، آباد ہے

تیری گلیوں میں جو کوئی جلوہ پیرائی کرے
کیوں طواف آ کر نہ کوئی تیرا شیدائی کرے

دہر میں جب تک بوئے گُلہائے فن باقی رہے
نظمِ اُردو کا پھلا پھولا چمن باقی رہے

مایہ دارِ رونقِ بزمِ سخن باقی رہے
یادگارِ مشربِ دورِ کہن باقی رہے

جی میں آتا ہے کہ آ کر چُوم لوں تیرے قدم
آہ لیکن جاں گزا ہے دُوریِ منزل کا غم!

(سنہ ۱۹۱۰ء)

فلکِ خضری ہے جام مرا

تھوڑی سی شرابِ خندۂ گل
رنگیں جس سے کہ ہو تخیل!

پیمانۂ برگِ یاسمن میں
یا ساغرِ لالۂ چمن میں!

جس سے کہ خبر نہ ہو دہاں کو
کر دیجیئے تازہ کامِ جاں کو!

صہبائے شفق کے جام دو جام
یا نئی جس سے شرابِ گلفام

وہ بادۂ خوش گوارِ لعلیں
عالم نظر آئے جس سے رنگیں!

یا صبح کی وہ مئے نظارا
ہو جس سے چمک میں ماند تارا

چپ چاپ خموشیِ سحر میں
پی جائیے بس نظر نظر میں

خُم خانۂ اخضرِ کہن کی
جس میں ہو چمک ڈکرن کی

جامِ مہتاب سے چھلک کر
چھینٹے چھینٹے گرے زمیں پر

ہر مست بہ قدرِ ظرف پی لے
اور لطفِ سرورِ بیخودی لے

محروم بھی بہرہ یاب ہو جائے
مستِ مئے فکر تاب ہو جائے

او ساقیِ بزمِ مے گساری
کافی ہے مجھے یہ بادہ خواری!

بزمِ سُہا

سکُوتِ شام میں جب دل رہینِ یاس ہوتا ہے
نظر آتی ہے دُنیا مائلِ خوابِ فنا مجھ کو

در و دیوار پہ یُوں دیکھتا وحشت برستی سی
دکھاتا ہے یہ عالم عالمِ وحشت بلا مجھ کو

سیہ بختی میں ظلمت سے اضافہ اور ہوتا ہے
سوادِ شام کا ہر سین ہے حسرت فزا مجھ کو

بہت جب تنگنائے دہر میں گھٹتا ہے دم میرا
تصوّر لے کے اُڑتا ہے سُوئے بزمِ سُہا مجھ کو

زمیں سے اُڑ کے میں مُرغِ نظر کے ساتھ جاتا ہوں
طفیلِ واقفیت کچھ نہیں یہ فاصلہ مجھ کو

نکل کر خاکدانِ تیرہ سے دلشاد ہوتا ہوں
کیا ہے صانعِ مطلق نے طلعت آشنا مجھ کو

نظر آتا ہے کیا کیا ہر طرف اک نُور کا عالَم
زمیں سے دُور، تاروں میں، ہر اوجِ سما مجھ کو

وہاں ہوتا قیامِ دائمی میرا، تو پھر ہوتا
نہ کچھ بیمِ اجل مجھ کو، نہ کچھ وہمِ فنا مجھ کو

درخشاں اے ستارو! تا ابد تم کو خدا رکھّے
نظر آتا ہے تم میں جلوۂ نُورِ بقا مجھ کو!

ایک آرزو

آہ! یہ دُنیا کے جھگڑے اور یہ فکرِ بیش و کم
بیقراری ہائے اُمیدِ مسرّت، خوفِ غم

خارِ پہلو حسرتِ آرام و راحت رات دن
آرزوئے عیش و عشرت، رنجِ عسرت رات دن

ہر قدم پر آہ! نیرنگِ جہاں کا سامنا
شعبدہ آرائیہائے آسماں کا سامنا

ہے کہیں جور و جفا مہر و وفا کے روپ میں
اور کہیں مکر و دغا صدق و صفا کے روپ میں

شعلہ ہائے آتشیں کین و حسد کے ہیں کہیں
طعنہ ہائے زہر آگیں نیک و بد کے ہیں کہیں

زالِ دُنیا کی محبّت دشمنِ صبر و سکوں
ناشکیبائی جگر میں، دل میں اندازِ جنوں

یعنی مثلِ گیسوئے برہم پریشانی کبھی
صورتِ آئینۂ رُخسار حیرانی کبھی

ہرزہ کاری میں کٹے افسوس ساری زندگی
آہ! یوں برباد ہو جائے یہ پیاری زندگی

رُوحِ مضطر کو کسی ایسی جگہ لے جاؤں میں
کشمکش سے چھُوٹ جاؤں اور تسکین پاؤں میں

جو یہاں در پردہ ہے وہ آشکارا ہو جہاں ‏ حُسنِ مطلق بے تکلّف جلوہ آرا ہو جہاں

آسماں سے روز و شب روحانیت برسا کرے ‏ اور دلِ محبوس اپنی کھڑکیوں کو وا کرے

پاک ہو جائے جہاں آلائشِ دُنیا سے دل ‏ جوڑ دے اپنا تعلّق عالمِ بالا سے دل

صبح دم جنّت کے پھُولوں سے جہاں آئے شمیم ‏ اور جہاںِ قدس کا پیغام دے بادِ نسیم

حمد کے اشعار گاتے ہوں طیورِ خوش نوا ‏ نغمہ ہائے سرمدی کا اک تلاطُم ہو بپا

فکر کوئی بھی نہ ہو دل کو بجز فکرِ معاد ‏ ذکرِ خالق ہر گھڑی ہو، ہر گھڑی خالق کی یاد

درد کا میرے علاج اے ساحلِ گنگا نہیں؟
کیا ترے دامن میں کوئی بھی مقام ایسا نہیں؟

دل سے دو دو باتیں

دلِ غم نصیب و محزوں! تُو نحیف و زار کیوں ہے؟
یہی تجھ سے پوچھتا ہوں کہ تُو بے قرار کیوں ہے؟
تجھے اضطرار کیوں ہے؟

ہے عجیب تیری دھڑکن ہے تڑپ تری نرالی
تُو ہے دل مرا، کہ دشمن؟ مری جانِ زار کھالی
نہ ہُوا تُو غم سے خالی!

ترے غم کو میں بھی جانوں کہ وہ کس مآل کا ہے
وہ نتیجہ میں بھی دیکھوں جو ترے خیال کا ہے
جو ترے ملال کا ہے!

نہ شگفتہ فصلِ گُل میں نہ کسی چمن میں خنداں
نہ قرار شور و غُل میں نہ سکوت میں ہے شاداں

تجھے کیا ہوا ہے ناداں؟

تجھے لے گیا چمن میں | کہ کسی طرح کھلے تو
گُل و لالہ و سمن میں | کرے شکوے اور گلے تو
اگر اُن میں کچھ ملے تو!

مگر آہ! واں بھی دیکھا | نہ تری خوشی کا ساماں
گُل و سبزہ پر نہ رِیجھا | نہ ہوا ترانہ ریزاں
یہ نوائے عندلیباں!

تجھے بزمِ عیش میں بھی | تو بٹھا بٹھا کے دیکھا
تجھے جام دستِ ساقی | سے پلا پلا کے دیکھا
غرض آزما کے دیکھا!

نہ ملا قرار تجھ کو | کوئی اور آرزو ہے
گُلِ عیش خار تجھ کو | تِری خُو ہیں اور بُو ہے
کوئی اور جستجو ہے!

کسی ماہ وش کے غم نے | جو دیا ہے داغ تجھ کو
تُو بتا کہ اے پتنگے | ملے وہ چراغ تجھ کو
کہ ملے فراغ تجھ کو!

تُو بتوں میں ہیں کاش! پہلے | یہ خدا سے چاہتا ہوں

تُو یہ جانتا ہے پہلے — کہ فریب دے رہا ہوں
تجھے آزما چکا ہوں!

تُو یہ خوب جانتا ہے — یہ نگار و نقش کیا ہیں
جنھیں دِل رُبا کہا ہے — یہ کھلونے بے وفا ہیں
گُلِ گُلشنِ فنا ہیں!

تجھے لے چلوں وہاں میں — ہیں جہاں چمکتے تارے
کہ تجھے بُلا رہے ہیں — وہ فلک کے ماہ پارے
ہیں عجیب پیارے پیارے!

نہ تجھے ہے ان کی چاہت — نہ ہے تیرہ خاکداں کی
نہ زمیں سے تجھ کو اُلفت — نہ محبّت آسماں کی
تو ہے آرزو کہاں کی؟

(سنہ ۱۹۰۹ء)

مَوت

اے موت! جَور سے ترے نالاں زمانہ ہے — عالَم یہ تیرے تیرِ ستم کا نشانہ ہے
روزِ ازل سے طَورِ تیرا قاتلانہ ہے — خُوں سے لکھا ہوا ہے، جو تیرا فسانہ ہے
جو قافلہ ہے، یاں سے عدم کو روانہ ہے — ہر اک کا تیری راہ میں لُٹتا خزانہ ہے

بربادساز رونقِ بزمِ جہاں ہے تُو
اے مَوت! غایتِ ستمِ آسماں ہے تُو!

اے موت! بحر و بر پہ ہے سکّہ رواں ترا — ظالم! مطیعِ حُکم ہے سارا جہاں ترا
راہِ جفا پہ کوئی نہیں ہم عناں ترا — توسن رواں ہے صورتِ برقِ تپاں ترا
کچھ کچھ شریکِ جور ہے گو آسماں ترا — لیکن وہ دُوں خصال کبھی ثانی کہاں ترا

تُو پھُول توڑ لیتی ہے اُس کے چمن سے بھی
ہر صبح ہے رُخِ مہ و انجُم پہ مُردنی!

تیغِ ستم سے تیری کسی کو اماں نہیں — تجھ کو تمیزِ طفلک و پیر و جواں نہیں

تجھ کو ذرا غمِ اہلِ جہاں نہیں — کچھ دل میں تیرے رحم و کرم کا نشاں نہیں

تجھ سے بچا کوئی چمن و گلستاں نہیں — تو برقِ بیخ سوز ہے، بادِ خزاں نہیں

اک بار تو گرے جو کسی نونہال پر

آئے نہ سو بہار میں وہ اپنے حال پر!

ماتم کدہ یہ دہر جو ہے، تیرے دم سے ہے — ویراں ہر ایک شہر جو ہے، تیرے دم سے ہے

دریائے غم میں لہر جو ہے، تیرے دم سے ہے — نالوں میں لہر بہر جو ہے، تیرے دم سے ہے

امرت جہاں میں زہر جو ہے، تیرے دم سے ہے — جینا خدا کا قہر جو ہے، تیرے دم سے ہے

جو دل ہے تیرے داغ سے یاں لالہ زار ہے

ماہی سے ماہ تک جو ہے، سو داغدار ہے!

دنیا سے کیسے کیسے اُٹھے گلعذار حیف! — تھی جن کے دم سے رونقِ فصلِ بہار حیف!

کیا کیا سمندِ ناز کے تھے شہسوار حیف! — اے موت! تو نے سب کا اُڑایا غبار حیف!

اب ہے دمن نہ لیلیٰ اُلفت شعار حیف! — ڈھونڈے سے بھی ملے گا نہ اُن کا مزار حیف!

سُنتے ہیں آج جن کے فسانوں کو ہم غریب

نالاں ترے ستم سے گئے وہ ستم نصیب!

کیا کیا نہ دل میں حسرت و ارمان لے گئے — پہلو میں آرزوؤں کے پیکان لے گئے

عقدے تمام مشکل و آسان لے گئے — شغلِ عدم کے سینکڑوں سامان لے گئے

جب لوگ اُن کو پھونکنے شمشان لے گئے — یا گاڑنے کو سوئے بیابان لے گئے

ماتم تھا آرزو کا جنازے کے ساتھ ساتھ

تھا شور ہاوہُو کا جنازے کے ساتھ ساتھ!

مارا کسی غریب کو تو نے وطن سے دُور — ماں باپ سے بہت پرے، بھائی بہن سے دُور

لاشہ کوئی پڑا ہے مزار و کفن سے دُور — دستِ صدائے شیون و شورِ محن سے دُور

پھولوں کی آہ نازبھری انجمن سے دُور — گھونٹا گلا ہزار کا صحنِ چمن سے دُور

گھیرا کسی کو ورطۂ دریا کے درمیاں

پھانسا کسی کو دامنِ صحرا کے درمیاں!

اے موت جن کا قطب سے تا قطب راج تھا — خورشید طشتِ زر جنھیں دیتا خراج تھا

ہم رفعتِ کلاہِ فلک جن کا تاج تھا — با صد شکوہ زیرِ قدم تختِ عاج تھا

قانون جن کا لفظ، اشارہ رواج تھا — والا حشم کوئی، کوئی عالی مزاج تھا

اُن کو بھی تو نے تخت سے پھینکا اُتار کے

آئی دباؤ میں نہ کسی شہریار کے!

رُستم کا اب نشاں ہے، نہ اسفندیار کا — ملتا نہیں پتا کہیں اُن کے مزار کا

سُنتے ہیں ذکر ارجنِ گردوں وقار کا — تھا نام ایک منتخبِ روزگار کا

ہنگامہ جس سے گرم رہا کارزار کا — اک تیر چیرتا تھا کلیجہ ہزار کا

آخر نشانہ ہو کے رہا تیرے بان کا
تُو نے ہی خاتمہ کیا تیر و کمان کا!

ہے غم سے جاں بلب کوئی حرماں نصیب آہ
تُو لے گئی ہے پہلو سے جس کا حبیب آہ
روتا تڑپ تڑپ کے ہے بیکس غریب آہ
آزارِ ہجر کا نہیں کوئی طبیب آہ
اے موت تیرے کام ہیں کتنے مہیب آہ
مارا ہے اُس غریب کو یوں کر قریب آہ
جس دن سے تُو نے اُس سے کیا ہم نشیں جدا
ہوتی ہی چشم تر سے نہیں آستیں جدا!

تو جس کا بچّہ لے گئی، اُس ماں کا حال دیکھ
جاری ہیں اشک اگرچہ ہوئے ماہ و سال دیکھ
اے موت! دیکھ طُولِ زمانِ ملال دیکھ
اب تک اَٹے ہیں راکھ سے سب سر کے بال دیکھ
ایسی کبھی غم زدوں کی کہیں ہے مثال دیکھ
ہر وقت رونے دھونے سے ہیں آنکھیں ہیں لال دیکھ
نُورِ نظر کے غم میں یہ اتنا جو روئے گی!
آنکھیں تو خیر جان کو اک روز کھوئے گی:

اے موت! آہ تیرے ستائے ہوئے یتیم
نقشِ غلط کی طرح مٹائے ہوئے یتیم
وہ سیلِ اشکِ خوں میں نہائے ہوئے یتیم
سوزِ غمِ نہاں کے جلائے ہوئے یتیم
دوشِ پدر سے خاک پہ آئے ہوئے یتیم
گودی سے ماں کی آہ چھڑائے ہوئے یتیم
روتے ہیں اور دیتے ہیں رو رو دُعا تجھے
اُن کو رُلا کے موت! بھلا کیا ملا تجھے!

عاشق کو آ کے حُسن کا جلوہ دِکھا گئی
دل آ گیا کسی پہ تو بس موت آ گئی

پروانے کے شکار کو شمعیں جلا گئی
گُل بہرِ عندلیب چمن میں کھِلا گئی

جھونکوں میں جب سمومِ خزاں کے سما گئی
دم میں چراغِ ہستیٔ گُل کو بجھا گئی

صیّادین کے مُرغِ چمن زاد پر گری
اور برق ہو کے خانۂ صیّاد پر گری!

اے موت! مت ڈرا مجھے، مجھ کو فنا نہیں
چلنے کا مجھ پہ نام کو جادُو ترا نہیں

کچھ ابتدا نہیں ہے، مری انتہا نہیں
میں وہ ہوں مجھ سے چھیڑ کی لینا بجا نہیں

تیری رسائی جسم سے آگے ذرا نہیں
ہاں جسم تیرا مال ہے، بیشک مرا نہیں

شمشان! تیری آگ مجھے کب جلا سکے
آغوشِ قبر! تو مجھے کیوں کر دبا سکے!

(۱۹۰۹ء)

موت کا موسم[1]

ترجمہ از انگریزی

موسم خاص میں ہوتے ہیں شجر برگ فشاں
پھول مرجھاتے ہیں، جب باغ میں آتی ہے خزاں
صبح کے ہونے پہ ہوتے ہیں ستارے پنہاں
لیکن اے موت! مقرر ہے ترا وقت کہاں

(۲)

دن کو ہوتا ہے ہر اک کو غمِ دنیا سے کام
دوست مل جائیں بہم، آتی ہے اس واسطے شام
رات ہوتی ہے کہ ہو سب کو میسر آرام
لیکن اے موت! ترے آنے کے ہیں وقت تمام

(۳)

ہم کو معلوم ہے کب بدر کو ہونا ہے ہلال
اُڑ کے کب جانا پرندوں کو ہے پھر سوئے شمال
ہونا گلشن کو ہے کب بادِ خزاں سے پامال
کون بتلائے کہ کب کیجے ترا استقبال

---

[1] یہ ترجمہ میں نے زمانہ طالب علمی میں کیا تھا۔ غلطی سے یہ نظم کسی نے سرور مرحوم کے کلام میں بھی شامل کر دی ہے۔ (محروم)

(۴)

کیا وہ موسم ہے ترا جبکہ بہار آتی ہے
اور صبا حُسنِ گُلِ تر کو نکھار آتی ہے

یا کہ جب بادِ خزاں لے کے غبار آتی ہے
نہیں، ہر فصل میں تُو بہرِ شکار آتی ہے

(۵)

بحر و بر دونوں کو منظور اطاعت تیری
کر رہی کام ہوا میں بھی ہے طاقت تیری

دل سے راحت میں کبھی جاتی نہیں ہیبت تیری
ہم جہاں جائیں نظر آتی ہے صورت تیری

(٦)

تُو وہاں بھی ہے جہاں ملتے ہیں دو سینہ فگار
دُکھڑے رونے کے لئے بیٹھ کے زیرِ اشجار

تُو وہاں بھی ہے جہاں ملتی ہیں فوجیں خونخوار
اور جوہر ہے جہاں اپنے دکھاتی تلوار

بوئے گل

فضائے دامنِ گل میں ملا مقام تجھے ہوا نصیب نہ لیکن وہاں قیام تجھے
بہ ایں لطافت و جاں پروری و زیبائی کیا بوقتِ سحر عزمِ دشت پیمائی
وطن سے دوشِ صبا پر سوار ہو کے چلی چمن سے مشک فشاں، عطر بار ہو کے چلی

ترے نفس سے ہوا مایہ دارِ مستی ہے! یہ فصلِ گل ہے کہ دورانِ مے پرستی ہے
مئے سرور ٹپکتی ہے جام سے تیرے! ہے سب کو بہرہ وری فیضِ عام سے تیرے
غضب کی اُف! تری لپٹوں میں ہے فسوں کاری دل و دماغ پہ اک بیخودی سی ہے طاری

ہے مجھ کو تیرے مقدر پہ سخت حیرانی! جہاں کو مایۂ فرحت تری پریشانی
ریاضِ دہر میں خود ہو کے انتشار نصیب مشامِ خلق کو تو نے کیا بہار نصیب
اُجڑ کے خود جو ہوا کو بسا دیا تو نے سبق زمانے کو ایثار کا دیا تو نے!

انجامِ گُل

کل تک تو چمن میں ہنس رہا تھا — وہ خندہ عجیب جاں فزا تھا

شیدائی تھے سب طیورِ گلشن — ہر نغمۂ خوش تری ثنا تھا

بلبل کا تو خاص رشتۂ جاں — ہستی سے تری بندھا ہوا تھا

مطلب نہیں اس سے ہم کو اے گُل — شیوہ ترا لطف یا جفا تھا

معشوق تھا بے نظیر و رعنا — تُو شاہدِ شکّریں ادا تھا

غارت گرِ ہوش و صبر و تمکیں — عالم تیرے شباب کا تھا

خوبانِ جہاں کا ہے یہ آئین — یہ عیب نہیں کہ خود نما تھا

ظالم کے نہ دل میں رحم آیا — گلچیں ترے واسطے قضا تھا

کتنا اے شاہدِ دل آرام

آغاز سے مختلف ہے انجام!

کِس حال میں آہ! آج تُو ہے — وہ خوبیٔ رنگ ہے نہ بُو ہے

بِکھری ہوئی چند پتیاں ہیں — نکہت آوارہ سُو بسُو ہے

اے گُل! وہ ادائیں اب کہاں ہیں — بُلبُل اب بھی تو روبرو ہے

مُنہ بولتے اُف! وہ ناز تیرے
اب بزم تری مقامِ ہُو ہے
کیوں خاک بسر وہ ہے روئے پرخاک
حُسنِ رفتہ کی جستجُو ہے؟
کل تک شیدا تھا اک زمانہ
بیگانگی آج سب کی خُو ہے
سب آبرو و آب و تاب تک ہے
یہ دہر طلسمِ رنگ و بُو ہے
آغازِ گُل اور اُس کا انجام
حالت یہی سب کی ہُو بہُو ہے

آغاز ہے دل نواز سب کا
انجام ہے جاں گداز سب کا!

آغاز مہِ مسرّتِ تام
انجام شبِ سیاہِ آلام
آغاز شگفتنِ گُلِ تر
انجام فشارِ حُسنِ گُل فام
آغاز طلوعِ صبحِ انور
انجام سوادِ آمدِ شام
آغاز نگاہِ لطفِ ساقی
انجام شکستِ شیشہ و جام
آغاز وہ عہد ہے کہ جس کا
سب جانتے ہیں طفولیت نام
انجام وہ دَور ہے کہ جس کو
کہتے ہیں بد تریں ایّام
آغاز ہوائے شوقِ پرواز
انجام فریبِ دانہ و دام
آغاز وہ ہے کہ ہائے آغاز
انجام وہ ہے کہ وائے انجام

آغاز انجام دیکھ گُل کا
نقشہ یہی جانِ جز و کُل کا!

(۱۹۱۳ء)

ایک خاندان کی قبریں

(انگریزی سے ترجمہ)

(۱)

پروان ایک گھر میں چڑھے ایک ساتھ وہ — معمور اُن کے دم سے تھا کاشانہ ایک ہی
حائل ہیں درمیان میں اب دشت و بحر و کوہ — اک دوسرے سے دُور ہیں قبریں جُدی جُدی

(۲)

اک مادرِ شفیق! کہ اُٹھ اُٹھ کے رات کو — تھی مامتا سے ہر رُخِ زیبا پہ جھانکتی
مُنہ بند غنچے آہ! جو تھے اُس کے رُوبرو — وہ خفتگانِ ناز ہوئے محوِ نیستی

(۳)

جنگل میں ایک ہے نئی دُنیا کے سو رہا — دریا کنار، سبزۂ اخضر کے سائے میں
دیتے پتا ہیں انڈین[1] اُس کے مزار کا — آبادیوں سے دُور صنوبر کے سائے میں

[1] شمالی امریکہ کے اصلی باشندے۔

(۴)

ہے دوسرا پڑا ہوا آغوشِ بحر میں
نیچے، جہاں پڑے ہیں گہر جگمگا رہے

وہ ایک سامری تھا محبّت کے سحر میں
جو پائے قبر اُس کے ہیں آنسو بہا رہے

(۵)

ہے تیسرا جنوب میں مستِ مئے فنا
بیلیں چڑھی ہیں "تاک" کی خاکِ شہید پر

ہسپانیہ کے معرکۂ جنگ میں گرا
پرچم کو اپنے سینے پہ تھامے رہا مگر

(۶)

چوتھی وہ رشکِ گُل کہ نسیمِ بہار سے
مہندی کے برگ جھڑتے ہیں جس کے مزار پر

ملکِ اطالیہ میں پڑی زیرِ خاک ہے
تھی جس سے یادِ صحبتِ دیرینہ تازہ تر

(۷)

اک دوسرے سے دُور ہیں خوابیدہ زیرِ خاک
جو اک شجر کے سائے میں کھیلا کیے کبھی

کرتے تھے مل کے وقتِ دعا حمدِ ذاتِ پاک
وابستہ ایک دامنِ مادر سے تھے سبھی

(۸)

تھا گھر میں اُن کے نُورِ تبسّم سے چاندنا
نغموں میں وہ خوشی تھی کہ دیکھی سنی نہ ہو

کس درجہ یاس خیز ہے اُلفت کی انتہا
اِس زندگی کے بعد اگر زندگی نہ ہو!

(۱۹۱۵ء)

سبزۂ نو

نادان! پئے تماشا سر تو نکال بیٹھا   لیکن تو بارِ ہستی گردن پہ ڈال بیٹھا

یہ بار وہ ہے جس کو زور و روا اٹھائے گا تو   یہ خار وہ ہے جس سے دامن چھڑائے گا تو

صد کوہِ درد ہوگی اس بوجھ کی گرانی

بارِ گراں تریں ہے دنیا میں زندگانی!

اس بوجھ کو اٹھا کر کتنے ہی دکھ بھرے گا   یہ بوجھ وہ ہے جس کے نیچے تو دب مرے گا

آخر عذابِ ہستی سر سے ترے ٹلے گا   جس وقت کوئی تجھ کو پامال کر چکے گا

ارمانِ دیدِ گل ہے؟ دھوکا ہوا ہے تجھ کو   لے کر عدم سے آئی تیری قضا ہے تجھ کو

رخ پر ترے پسینہ گرمیِ شوق کا ہے   اے سبزہ! جس کو شبنم لوگوں نے کہہ دیا ہے

محرومِ راز تجھ سے رہ رہ کے کہہ رہا ہے   نو واردِ گلستاں! دھوکا تجھے ہوا ہے

ہے خندۂ گلِ تر برقِ فنا کا جلوہ

آیا نظر جو تجھ کو غافل! بقا کا جلوہ

حیرت کو تیری ہوں گے یاں انقلاب لاکھوں   ہستی کی رات میں تو دیکھے گا خواب لاکھوں

نازک اداؤں سے تیرا یہ لہلہانا
مستانہ لغزشوں سے یہ لوٹ لوٹ جانا

لوٹے ہے تو زمیں پہ پی کر شرابِ الفت
مستی شکن ملے گا لیکن جوابِ الفت

پڑ جائے گا چمن کا جس وقت رنگ پھیکا
مجھ کو تو فکر ہے یہ کیا حال ہو کسی کا!

پتوں سے جب ہوا کی کر جائے گی کنارا
ڈوبیں گے بحرِ غم میں صد برگ اور ہزارا

ہو جائے گا فضا سے ابرِ بہار رخصت
بادِ خزاں چلے گی، برسا کرے گی حسرت

آ کر قضا ہنسے گی جب گل کی جا چمن میں
اے سبزہ! خاک اُڑے گی بلبل کی جا چمن میں!

ہر اک کا مدعا ہے دنیا میں شادمانی
تیری طرح ہے عالم جویائے کامرانی

گلہائے لطفِ دنیا ہر چند چیدنی ہیں
نظارہ ہائے عالم دل کش ہیں پر فانی ہیں

لیکن غضب تو یہ ہے ان میں بقا نہیں ہے
افسوس دل لگی کا کچھ بھی مزا نہیں ہے!

ننھا سا تو کسی کا اک نخلِ آرزو ہے
پھلنے کی آرزو پر آیا کنارِ جو ہے!

لیکن ترا یہ سودا سودائے خام ہوگا
پھلنے سے پہلے تیرا قصہ تمام ہوگا!

جس خاک سے اُگا ہے اُس خاک میں ملے گا
گل تیری آرزو کا اگلے برس کھلے گا!

(ستمبر ۱۹۰۸ء)

(انگریزی سے ترجمہ)

سرد ہے دن، تیرہ و تاریک ہے اور خوفناک
مینہ برستا ہے، ہوائے تیز ہے گرمِ سفر

اب تلک گرتی ہوئی دیوار سے لپٹا ہے تاک
جھونکے جھونکے سے ہیں گرتے خشک پتے خاک پہ

اور دن ہے تیرہ و تاریک، سرد و خوفناک!

زندگی میری بھی ہے تاریک، سرد و خوفناک
بارشِ اشک رواں ہے، صرصرِ آہِ سحر

عہدِ ماضی سے مرے جذبات ہیں لپٹے ہوئے
اور جوانی کی امنگیں گر رہی ہیں خاک پر

آہ یہ ایام ہیں تاریک، سرد و خوفناک!

صبر، ہاں صبر اے دلِ مغموم، بے جا شکوہ ہے
ابر کے پیچھے ابھی تاباں ہے مہرِ تابناک

ساری دنیا کی یہی قسمت ہے، کیسا شکوہ ہے
زندگی ہر شخص کی رکھتی ہے یاں ایامِ ہلاک

سب کے کچھ ایام ہیں تاریک، سرد و خوفناک!

شمعِ سحر

محفل کا رنگ اُڑنے لگا، شب بسر ہوئی — بزمِ نجوم چرخ پہ زیر و زبر ہوئی
آخر حیاتِ شمع چراغِ سحر ہوئی — منہ فق ہے، رنگ زرد ہے، حالت بتر ہوئی

کرتا جہاں سے کوچ ہے گویا حسین کوئی
بیمار ہے رہینِ دمِ واپسیں کوئی!

چہرے پہ مُردنی ہے کہاں ہے بہارِ حسن — مثلِ بقائے گُل نہیں کچھ اعتبارِ حُسن
چمکا کبھی جہاں میں نہ بجھ کر شرارِ حسن — افسردگیِ شمع ہے انجامِ کارِ حُسن

مانندِ عشق حُسن بھی حسرت مآل ہے
شمعِ سحر کو دیکھ لو، روشن مثال ہے!

گزری شبِ عروج، یہ صبحِ زوال ہے — تھا رات کو جو بدر، وہی اب ہلال ہے
سیلاب تا کمر ہے، یہ اشکوں کا حال ہے — دھونا مگر نوشتِ جبیں کا محال ہے

بیتاب ہو رہی ہے اکیلی کھڑی ہوئی
قسمت کو رو رہی ہے اکیلی کھڑی ہوئی!

آنکھوں میں رنگِ محفلِ سوز و گداز ہے — حیرت فروزِ یادِ شبِ سوز و ساز ہے
کہتی ہے دل میں رہنے دو جو دل کا راز ہے — یعنی فسانۂ غمِ ہستی دراز ہے!

سر پر اجل ہے، فرصتِ گفتار کس کو ہے
جاں پر بنی ہے طاقتِ گفتار کس کو ہے!

حسرت برس رہی ہے رخِ رشکِ ماہ پر — حیرت نثار ہوتی ہے اک اک نگاہ پر
بجلی گرائی صبح کی اک بے گناہ پر — ہے داغِ تازہ دامنِ چرخِ سیاہ پر

تاراج ہو گیا چمنِ حسن و عشق حیف
برہم ہوئی وہ انجمنِ حسن و عشق حیف!

نخلِ مرادِ شمع جو شب گل فشاں رہا — محفل میں جوشِ خندۂ گل کا سماں رہا
جب تک زبانِ شمع میں لطفِ بیاں رہا — باغ و چمن میں خشک دمِ طائراں رہا

اب ہے وفورِ نور، نہ جلوہ نمائیاں
بے طرح منہ پہ چھٹنے لگی ہیں ہوائیاں!

پروانے جن کی خاک سے ظاہر ہے شانِ عشق — مضطر تھے آہ! کب سے پئے امتحانِ عشق
گر شوق ہو تو کیجئے سیرِ جہانِ عشق — کیا کیا ہیں بے مزار و کفن کشتگانِ عشق

بڑھ کر ہے اگنی بان سے بھی عشق کا خدنگ
کشتوں کے پشتے لگ گئے بے تیر بے تفنگ!

اے شمع تیری رونقِ بازار کیا ہوئی — گرمیِ ذوق و شوقِ خریدار کیا ہوئی؟
وہ آب و تابِ جلوۂ رخسار کیا ہوئی — وہ شب کدھر؟ وہ بزمِ پُرانوار کیا ہوئی؟
کیا ہو گئے وہ ناز، وہ انداز کیا ہوئے؟
وہ ننھے ننھے عاشقِ جاں باز کیا ہوئے؟

شب بھر غریب تختۂ مشقِ ستم رہے — لیکن اُمیدوارِ نگاہِ کرم رہے
مر کر بھی راہِ عشق میں ثابت قدم رہے — جل کر گرے تو یار کے قدموں پہ تھم رہے
ہیں مہربانیاں فلکِ دُوں نواز کی
یوں منتشر ہو خاک شہیدانِ ناز کی!

یکسر فغاں طیورِ سحر کی نوازنی — نغمے تمام نالے ہیں ہنگام جاں کنی
بگڑا تمام کھیل، نہایت بُری بنی — دل میں ہجوم یاس ہی صورت پہ مُردنی
دامانِ شوق کھول کے گُل گیر رہ گیا
صورت یہ دیکھ صورتِ تصویر رہ گیا!

کشتیِ عمرِ شمع پہ آفت بپا ہوئی — بادِ نسیمِ صبح مخالف ہوا ہوئی
بے چاری جلد نذرِ محیطِ فنا ہوئی — اک شب کی زندگی جو ہوئی بھی تو کیا ہوئی
محروم حالِ شمعِ سحر غیر ہو گیا
ہوتے ہی صبح خاتمہ بالخیر ہو گیا!

(دسمبر ۱۹۰۹ء)

فریادِ یتیم

زباں پر ماجرائے دردِ دل لائیں تو کیا لائیں
ہم اپنے سوزِ غم سے کس لئے اوروں کو تڑپائیں

جو دنیا شاد بستی ہے بسے وہ تا قیامت تک
ہم اپنے شور و شیون سے قیامت کس لئے ڈھائیں

دکھائیں کیوں امیروں کو ہم اپنے فاقہ کش چہرے
کسی کی عیش و عشرت میں بھلا ہم کیوں خلل لائیں

کسی کے رنگ میں کیوں ہم بھنگ ڈالیں اپنے نالوں سے
بلا سے زیست کے دن فاقہ مستی میں گزر جائیں

جگہ تھوڑی سی دیدے اے زمیں! تو اپنے دامن میں
کسی کو تا کہ ہم داغِ تنِ عریاں نہ دکھلائیں

نکل دل سے نہ یوں اے آہِ سوزاں بے تحاشا اب
کسی کے باغ میں کلیاں مسرت کی نہ کمہلائیں

یہ سب کچھ ہے بجا لیکن بسر ہو زندگی کیوں کر؟
اگر پہنیں تو کیا پہنیں، اگر کھائیں تو کیا کھائیں؟

کرم اے کاش! ہم پہ بے طلب اہلِ کرم کرتے
حیا آتی ہے ہم کو اس طرح اظہارِ غم کرتے

کسی کی چشمِ حیراں کے تھے نورِ نظر ہم بھی
کسی خستہ جگر کے آہ! تھے لختِ جگر ہم بھی

ریاضِ دہر میں حاصل ہوئے ہم کبھی یا غرت سے
ہوئے آخر کسی کی شاخِ ارماں کے ثمر ہم بھی

گہن قسمت میں تھا اپنی، وگرنہ نور برساتے!
کسی کے مطلعِ امید پر مثلِ قمر ہم بھی

بھٹکتے پھرتے ہیں بے خانماں اب دشتِ دنیا میں
کسی کے گھر میں تھے رونق فزائے بام و در ہم بھی

مقدّر میں تھا تاراجِ خزاں ہونا یونہی، ورنہ
شگفتہ آج ہوتے صورتِ گُل ہائے تر ہم بھی

بنا دی آج گردِ بےکسی نے اور ہی صورت
کبھی تھے آہ! آب و تاب میں مثلِ گہر ہم بھی

جو ناز اپنے اُٹھاتے تھے، اُٹھے ناکام دنیا سے
اُنھیں کے ساتھ کرتے کاش سامانِ سفر ہم بھی

نظر آتا نہیں دُنیا میں جز ذاتِ خدا کوئی
سُنے کیا اپنے دردِ بےکسی کا ماجرا کوئی!

رکھے گی آہ! قسمت کب تلک آشفتہ حال ہم کو
ملیں گی اے فلک! کھانے کو کتنی جھڑکیاں ہم کو

جگہ دیتا ہے باغِ دہر پھولوں میں نہ کانٹوں میں
اُڑا لے چل تو اپنے ساتھ اے برگِ خزاں ہم کو

کیا دے دے کے فاقے نیم جاں ہم کو مقدّر نے
نہ تابِ لب کشائی ہے نہ یارائے فغاں ہم کو

خدا وہ دن دکھائے جب نظر ہم اُس کو آ جائیں
سُنا ہے ڈھونڈتی پھرتی ہے مرگِ ناگہاں ہم کو

مجسّم نامرادی ہیں دکھائیں کس کو صورت ہم
چھپا لے اے زمیں ہم کو، مٹا دے آسماں ہم کو

ہمارے واسطے باقی نہیں کُنجِ قفس بھی کیا؟
نہیں صحنِ گلستاں کی ہوس اے باغباں ہم کو

وہ لاغر ہیں کہ احسانِ مروّت کا بھی اُٹھ نہیں سکتا
عدم کی سمت کوئی بے اجل کر دے رواں ہم کو

رہیں تجھ میں جنھیں دیتی ہے تو آرام اے دُنیا
یتیموں، بے نواؤں کا یہاں کیا کام اے دُنیا!

لکھی تھی خانہ ویرانی، پریشانی مقدّر میں گھروندے جو بناتے تھے بگڑ جاتے تھے خود گھر میں

ابھی سے خانماں بربادیِ طفلی کا رونا ہے بڑی ہے عُمر اور باقی نہیں کچھ دیدۂ تر میں

مدارِ زندگی اللہ والوں کے کرم پر ہے الٰہی اور بھر دے مہر قلبِ مہر پرور میں

ہماری یاد بھی دل میں رہے او دنیا کے منعم تُو اپنے بال بچّوں میں ہو شاداں جس گھڑی گھر میں

ہماری بے کسانہ سردیوں کا بھی خیال آئے تُو محوِ استراحت جب ہو نرم و گرم بستر میں

ہماری شامِ تنہائی کا منظر بھی نظر میں ہو ترا بچّہ ہو محوِ خواب جب آغوشِ مادر میں

تری چشمِ تصوّر میں تنِ عُریاں ہمارا ہو کرے تُو جب کبھی پوشاکِ نو آراستہ بر میں

یہ پیش و پس ہے کیا داتا! معاون بن اناتھوں کا
رُوپے پیسے کو دانا جانتے ہیں میل ہاتھوں کا!

شکوۂ صیّاد

(حادثۂ جلیانوالہ باغ سے متاثر ہو کر کہی گئی)

موسمِ گُل ہیں جو رہ رہ کے چمن یاد آئے
ہم نوا! لب پہ نہ کیوں شکوۂ صیّاد آئے

پھر سوئے کُنجِ قفس نکہتِ برباد آئے
آئے، پھر لُوئے غُبارِ دلِ ناشاد آئے

آتشِ حسرتِ گلگشت سوا ہوتی ہے
اُجڑے گلشن کی بھی کیا خوب ہوا ہوتی ہے؛

یادِ ایّامِ بہاراں کہ چمن تھا ہم تھے
باغباں بر سرِ کیں ہم سے نہ تھا، بےغم تھے

رُونما شام و سحر عیش و طرب باہم تھے
اپنے جلسے بھی کبھی غیرتِ جشنِ جم تھے

مستِ صہبائے مسرّت تھے کہ آزاد تھے ہم
اُڑتے پھرتے تھے ہر اک سمت کہ دلشاد تھے ہم؛

تھا کمیں میں مگر اے وائے مقدّر صیّاد
دشمنِ مہر، جفا پیشہ، ستمگر صیّاد

آگیا دامِ بلا دوش پہ لے کر صیّاد
ہوگیا بہرِ چمن فتنۂ محشر صیّاد

نغمۂ بلبلِ شیدا اسے فقط لاگ نہ تھی
کون سا برگ وہ تھا جس کے لئے آگ نہ تھی!

خلشِ خارِ چمن زیست سے کر دیتی تنگ　　اُن پہ خالی کیے سفّاک نے بھر بھر کے تفنگ
آزما ڈالے ہزاروں ستم و جور کے ڈھنگ　　جاں ستانی میں تامّل، نہ توقّف، نہ درنگ

موت سے بچ کے جو اندرِ قفس سہتے ہیں
اب وہ یوں نالہ کشِ جور و جفا رہتے ہیں!

بدلے تُو نے یہ لیے ہم سے بھلا کس دن کے　　ذبح کر ڈالے ہیں مرغانِ چمن گِن گِن کے
آشیانوں کے اُڑائے ہیں ستمگر! تنکے　　اب تری قیدِ مصیبت میں مکیں ہیں جن کے

بے خطاؤں پہ یہ غصّہ، یہ عتاب اے ظالم
کبھی دینا ہے خدا کو بھی جواب اے ظالم!

سرو و شمشاد کو بے مہر اکھاڑا تُو نے　　زرِ گُل دامنِ گلزار سے جھاڑا تُو نے
سبزہ بیگانہ تھا، اُس کو بھی لتاڑا تُو نے　　نقشۂ حُسنِ چمن آہ! بگاڑا تُو نے

دل ترے سینے میں تھا پاسِ وفا سے خالی
ترے جذبات تھے احساسِ وفا سے خالی!

جل اُٹھا پھول سے کیوں؟ داغِ تپاں تھا کوئی؟　　خار کھٹکا تری نظروں میں سناں تھا کوئی؟
کج ہوا سَر سے کیوں؟ غیرِ جہاں تھا کوئی؟　　لپکا ملنے پہ عبث، اس میں نہاں تھا کوئی؟

خفقاں تھا یہ تر جس نے ڈرایا تجھ کو
سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آیا تجھ کو![1]

ہائے وہ صحنِ چمن صحبتِ یارانِ چمن — شاہدِ بزمِ طرب وہ گُلِ خندانِ چمن
اور وہ لالہ کہ تھا شمعِ شبستانِ چمن — ہوگیا داغِ دلِ خانۂ ویرانِ چمن

تا سحر گاتے تھے جس باغ میں گانے والے
اب اُٹھا کرتے ہیں راتوں کو وہیں سے نالے!

حکم تیرا ہے کہ فریاد نہ ہونے پائے — کوئی بُلبل کہیں آزاد نہ ہونے پائے
دہر میں شہرتِ بیداد نہ ہونے پائے — اور مشہور یہ رُوداد نہ ہونے پائے

"نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گُھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے"

سنہ ۱۹

---

[1] استاد ذوق کا شعر ہے ؎
باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخِ گُل افعی نظر آتا ہے مجھے

بُلبُل کی فریاد

صیّاد نے چھُڑایا جب دن سے آشیانا
پہلو میں دل کے بدلے غم نے کیا ٹھکانا

گلزار سے نکالا، قیدِ قفس میں ڈالا
بے درد کچھ نہ سمجھا ظالم نے کچھ نہ جانا

آزاد تھا کبھی میں، دلشاد تھا کبھی میں
تھے وہ بھی دن الٰہی! تھا وہ بھی اک زمانا

روتا ہوں خوں کے آنسو آتا ہے یاد جس دم
غنچوں کا مسکرانا، پھولوں کا کھلکھلانا

موجِ صبا کا چلنا تھم تھم روشِ روش پہ
شاخوں کا جھوم جانا، سبزے کا لہلہانا

وہ جانفزا ہوائیں وہ دل کُشا گھٹائیں
مُرغانِ ہم نوا کا ساون کے گیت گانا

بارش کی وہ پھُواریں، برسات کی بہاریں
پتلی سی ٹہنیوں پر وہ جھولنا جھُلانا

صحنِ چمن میں پھرنا وہ شب کو چاندنی میں
دل میں سُرور آنا، آنکھوں میں نور آنا

وہ شام کے نظارے جگنو وہ پیارے پیارے
وہ صبح کے ستارے، اُن کا وہ جھلملانا

اِس قیدِ بے کسی کا کب تھا خیال مجھ کو
مِل جائیں کاش! واپس وہ ماہ و سال مجھ کو

بے رحم کے ستم کی کڑیاں اُٹھا رہا ہوں
بیداد سہ رہا ہوں دُکھ درد پا رہا ہوں

مجھ بے زباں کی بولی کوئی نہیں سمجھتا
ہر چند چیخ کر میں دُکھڑا سُنا رہا ہوں

قسمت کو رو رہا ہوں میں، اور سینہ گم گر دل میں سمجھ رہا ہے، خوش ہو کے گا رہا ہوں
اِک آگ سی لگی ہے یادِ وطن کی دل میں رو رو کے آنسوؤں سے اُس کو بجھا رہا ہوں

سب ہم صفیر میرے خوشیاں منا رہے ہیں
تن تن کے اُڑ رہے ہیں، اُڑ اُڑ کے گا رہے ہیں!

میرا نصیب مجھ سے گر ساز گار ہوتا میں بھی ترانہ سنجِ فصلِ بہار ہوتا
پھولوں کی انجمن سے ہوتی اگر نہ دُوری یہ دل مرا نہ ہرگز یوں داغدار ہوتا
شبنم کے وہ نظارے نظروں سے گر نہ چھپتے کیوں زار زار روتا؟ کیوں اشکبار ہوتا؟
اس قید سے رہائی ممکن اگر نہیں ہے میرا بھی کچھ تو چارا پروردگار ہوتا
شاخِ نہال پر یا پنجرا مرا لٹکتا پنجرے میں یا ہجومِ سرو و چنار ہوتا

پنجرے کا آب و دانہ یارب! ہے زہر مجھ کو
کھانا عذابِ جاں ہے، پینا ہے قہر مجھ کو!

اے کاش! جا کے بیٹھوں پھر کنجِ دلنشیں میں گاتا پھروں ترانے گلشن کی سرزمیں میں
سوزِ نہاں بجھاؤں جوئے چمن پہ جا کر پھر جا ملوں میں اپنے یارانِ دانہ چیں میں
یہ تیلیاں قفس کی، اے کاش! پھونک ڈالوں اتنا اثر تو یارب! ہو آہِ آتشیں میں
اُجڑا ہوا نشیمن پھر جا بساؤں اپنا اب کے جو تھا بنایا گلہائے یاسمیں میں

کب ہو مجھے رہائی، کب آشیاں میں پہنچوں
اپنے وطن کو جاؤں، اپنے مکاں میں پہنچوں

(۱۹۱۲ء)

چڑیا کی زاری

اے بد نہاد لڑکے! اے نابکار لڑکے
یہ کیا کیا؟ خدا کی تجھ پر ہو مار لڑکے

نازل غضب خدا کا تجھ پر اسی گھڑی ہو
اور موت لے کے خنجر سر پہ ترے کھڑی ہو

ظالم! خدا کرے تو بچپن میں جان کھوئے
میری طرح سے تیری ماں زار زار روئے

بے رحم! کیا بگاڑا ان بے پروں نے تیرا
نقصان کیا کیا تھا، اِن بے گھروں نے تیرا

مَوجِ فنا میں ان کو تُو نے بہا دیا کیوں؟
ان کا نشانِ ہستی ظالم! مٹا دیا کیوں؟

اب تک نہ ننھے اُنھوں نے سفّاک! پر سنبھالے
میرے غریب بے پر! میرے وہ بھولے بھالے

کن کن مصیبتوں سے ننھا آشیاں بنایا
لا لا کے تنکا تنکا گھر تھا یہاں بنایا

وہ گھر کہیں پڑا ہے بچے کہیں پڑے ہیں
دُور از مکانِ ویراں بیکس کہیں پڑے ہیں

وہ میرے پیارے بچے! لختِ جگر وہ میرے
چشم و چراغ میرے! نورِ بصر وہ میرے

وہ میرا گھر میں آنا، اُن کا وہ چہچہانا
اُن کا وہ لاڈ کرنا! میرا وہ صدقے جانا!

کن کن مصیبتوں سے بچوں کو میں نے پالا
پڑنا تھا وائے قسمت! اس پُر جفا سے پالا

مٹی پہ وائے قسمت! بیجان لیٹے ہوئے ہیں
کس نیند میں یہ میرے نادان پڑے ہوئے ہیں؟

اے میرے پیارے بچو! اماں تمھاری آئی
چُن چُن کے دانہ دانہ خاطر تمھاری لائی

میں نے سحر سے تم کو پانی نہیں پلایا
اُٹھو کہ اب تمھارے اُٹھنے کا وقت آیا

خاموش کیوں پڑے ہو منقار جلد کھولو!
کیوں رُوٹھتے ہو مجھ سے! ہاں کچھ تو مُنہ سے بولو

افسوس، نسلِ انساں تجھ میں وفا نہیں ہے
کہتے ہیں اُنس جس کو، تجھ میں ذرا نہیں ہے

نالاں رہے ہیں تجھ سے مہر و وفا ہمیشہ
باہر نیام سے ہے تیغِ جفا ہمیشہ

ہمسائگی میں تیری آکر ہوئے مکیں تھے
لچھّن ترے مگر ہم کچھ جانتے نہیں تھے

سختی تری ستمگر! کتنی ہے بے کسوں پر
یہ جبرِ بے تحاشا! یہ جورِ بے بسوں پر

غدّار! بے وفائی تیری سرشت میں ہے
تیرا ہی وتیرہ دنیائے زشت میں ہے

تجھ میں کہاں محبّت، جس کا ہے تجھ کو دعویٰ
تجھ میں کہاں صداقت جس کا ہے ناز زیبا

نزدیک نسلِ انساں ہرگز کوئی نہ آئے
اپنے جگر پہ زخمِ تیغِ ستم نہ کھائے

اِس میل جول کا گر انجام جانتی میں — کم بخت دل کا کہنا ہر گز نہ مانتی میں
جنگل میں جا کے اپنا میں آشیاں بناتی — شاخِ شجر پہ خس کا چھوٹا مکاں بناتی
رہتی ہنسی خوشی سے، بچّوں کو پالتی میں
خطرے میں اپنی جاں کو ہر گز نہ ڈالتی میں!

میں اُن کو لا کھلاتی جنگل سے جا کے دانے — جب تک نہیں ہوئے تھے کمسن مرے سیانے
مجھ پر ستم ہوا ہے اے جسم و جاں کے مالک — اے داد گر زمیں کے، اے آسماں کے مالک
میں بے زباں ہوں کرتی فریاد تیرے آگے — کہتی ہوں اپنے غم کی روداد تیرے آگے
اب کس طرف کو جاؤں میں بے زبان چڑیا
میں غم کی ماری چڑیا! میں خستہ جان چڑیا!

(اپریل ۱۹۰۶ء)

مچھلی کی بیتابی

میری خطا، جو تجھ سے کروں التجائے رحم
ظالم! تُو وہ نہیں کہ تجھے مجھ پہ آئے رحم

تھے لوگ رحم دل کبھی، وہ بھی زمانہ تھا
اُٹھ ہی گیا ہے اب تو زمانے سے ہائے رحم

دل میں ہے تیرے جور و جفا مہر کے عوض
آنکھوں میں تیری قہر ہے ظالم بجائے رحم

ہے دام تیرے دوش پہ اور ہاتھ میں چھری
صورت یہ ہو تو کس طرح نزدیک آئے رحم

سینے میں دل کہاں ہے ترے لختِ سنگ ہے
ناواقفِ کرم ہے تُو، ناآشنائے رحم

تڑپا نہ اب مجھے، مرا قصہ تمام کر
قدرت نے اختیار دیا قتلِ عام کر!

مسرور ہو نہ دیکھ کے بیتابیاں مری
سرپنجۂ عذاب میں ظالم! ہے جاں مری

اے بدگماں نہ رکھ مجھے الجھا کے دام میں
میں نیم جاں ہوں اب وہ تڑپ ہے کہاں مری

میں رہنے والی آہ! اُسی دنیائے آب کی
تفسیدہ گرم ریت پہ ہیں پسلیاں مری

کیوں کر سناؤں حالِ دلِ بے قرار کا — تابِ فغاں مجھے ہے، نہ گویا زباں مری

ہو دل میں درد اور سُنے گوشِ دل سے تو — صد محشرِ فغاں ہیں یہ خاموشیاں مری

تقدیر نے اجازتِ فریاد ہی نہ دی

مجھ کو زبانِ شکوۂ بیداد ہی نہ دی!

گہوارہ مجھ سے چھوٹ گیا موجِ آب کا — باعث نہ مجھ سے پوچھ مرے اضطراب کا

وہ نرم نرم کائی! وہ مخمل کا فرشِ سبز — چھوٹا سا آہ! خیمۂ آبی حباب کا

خشکی پہ آکے آہ! جھلستا ہے تن مرا — پیشِ نظر ہے چار سُو عالم سراب کا

ڈالا مجھے بہشت سے دوزخ میں کس لئے؟ — اے آسماں سبب کوئی اِس انقلاب کا؟

آبِ رواں نہ رو، مری تقدیر تھی یہی — گردابِ غم نہ کر تو مرے پیچ و تاب کا

روتے ہیں میرے غم میں رفیقانِ زیرِ آب

بزمِ عزا ہے آہ شبستانِ زیرِ آب

حیرت میں ہوں نہنگِ قضا ہے کہ آدمی؟ — جاں دار پر ہیں دانت، بلا ہے کہ آدمی؟

بھیجا گیا مرا ملک الموت کی طرح — پیغامِ مرگ مجھ کو بلا ہے کہ آدمی؟

شفقت بھری یہ شکل، یہ کرتوت ہائے ہائے — ہنگامۂ خموشِ جفا ہے کہ آدمی؟

اُف! چھری بغل میں ہے اور منہ میں رام رام — مجموعۂ فریب و ریا ہے کہ آدمی؟

جانیں قدم قدم پہ مسلتا ہے زیرِ پا — یا رب یہ کوئی فتنہ اٹھا ہے کہ آدمی؟

سو سو شرارتیں ہیں جہاں پر بشر ہے ایک
عنقا ہے خیر، جزوِ بشر آج شر ہے ایک!

مخلوق ہم بھی ہیں اُسی پروردگار کی
جس کے کرم پہ ہے نظر اُمیدوار کی

انصاف پر اسی کے بھروسا ہمیں بھی ہے
میزاں ہے جس کے ہاتھ میں روزِ شمار کی

کب تک بھلا چھپائیں گی خوں بیگناہ کا
نیرنگیاں یہ گردشِ لیل و نہار کی

دکھلاؤں گی وہاں دلِ بریاں کا داغ داغ
مجھ کو قسم ہے اپنے تنِ داغ دار کی

ہے شکر کی جگہ کہ وہ دن بھی قریب ہے
شاکی بہت ہوں میں ستمِ روزگار کی

کیا جو ترا خدا ہے، وہ میرا خدا نہیں
فریاد رس وہ "ماہیِ بے آب" کا نہیں؟

(اگست ۱۹۱۱ء)

کولھو کا بیل

رہٹ خود بھاری ہی، پھر اُس پہ یہ پتھر کیسا؟
جَور پر جَور، جفا کیش، ستم گر! کیسا؟

پٹّی آنکھوں پر مری، دیکھنے والو کیسی؟
ہائے اے گردشِ تقدیر! یہ چکّر کیسا؟

کس خطا پر یہ ملاتا ہے ہمیں مٹّی میں
آسماں ہم سے ہوا آہ! مکدّر کیسا؟

بارے کس دن کے لئے بیل بنا کر ہم کو
اس کو مِل جائے گا کیا اتنا ستا کر ہم کو

ختم ہونے نہیں پاتا وہ سفر ہے اپنا
ہم چلے جاتے ہیں دن رات، جگر ہے اپنا

کاش! اسی راہ میں آ پڑتا عدم کا رستہ
اُلٹا افسوس! نصیبا ہی مگر ہے اپنا

ہم جہاں ٹھہرے ذرا، پیٹھ پہ کوڑا سا پڑا
دم کہاں لیتے ہیں، اس میں بھی ضرر ہے اپنا

تیل ٹپکے ہے پڑا کولھو سے قطرہ قطرہ
خشک ہوتا ہے ادھر لوہو سے قطرہ قطرہ!

مرغزاروں میں نہ جا کر کبھی سبزہ دیکھا
بہتے دریا کا نہ سرسبز کنارا دیکھا

اپنے ہم جنسوں سے جا کر نہ ملے دم بھر کو
کھیل دیکھا نہ کبھی، کوئی تماشا دیکھا

چار دیواری یہی تیلی کے گھر کی دیکھی
اور اس قیدِ دوامی میں بھلا کیا دیکھا

بیل کولھو کے بنائے گئے تقدیر سے، ہم

نکلے گردش سے نہ ہرگز کسی تدبیر سے ہم!

تن بہ تقدیر، یہی کام کئے جاتے ہیں ۔ منتظر موت کے مر مر کے جئے جاتے ہیں

لختِ دل کھانے کو ملتا ہے، سو کھالیتے ہیں ۔ خون جب تک کہ جگر میں ہے پئے جاتے ہیں

داورِ روزِ قیامت کے لئے ہم دل پر ۔ داغ بے مہریٔ انساں کے لئے جاتے ہیں

کاش! ٹل جائے کہیں سر سے عذابِ ہستی

ہائے! کب تک رہیں ہم زیرِ عتابِ ہستی!

کام لیتے ہیں مگر، کھانے کو کیا دیتے ہیں ۔ کیسی بیدردی سے خدمت کا صِلا دیتے ہیں

دشمنِ اہلِ وفا ہیں یہ کدورت والے ۔ خاک میں رنگِ محبت کو ملا دیتے ہیں

لے کے آجاتے ہیں چُھریاں دمِ آخر سر پر ۔ حقِ خدمت کو بہت جلد بُھلا دیتے ہیں

کیسے ظالم ہیں، نہ کچھ مُزد نہ منّت! یارب

کوئی ایسوں کی کرے کس لئے خدمت! یارب!

اے اجل! آکہ ہے اک تیرا سہارا ہم کو ۔ تیری آنکھوں سے ہے ڈھارس کا اشارا ہم کو

ہائے تقدیر ہی تھی دشمنِ جانی اپنی ۔ زندگی دے کے جفا کار نے مارا ہم کو

قیدِ ہستی سے رہائی کا ہو چارا کوئی ۔ اب ہے درکار نہ کچھ گھاس نہ چارا ہم کو

اے خدا ملکِ عدم میں نہ ہو کولھو کوئی

ہم کو مل جائے نہ پھر آہ! جفا جُو کوئی!

یادِ ایّام

یادِ ایّامِ کامرانیٔ دِل — درحقیقت ہے نوحہ خوانیٔ دل!
دل کہ ہنگامہ زارِ محشر تھا — اب ہے وقفِ سکوتِ حیرت زا
یاد آتا ہے سادہ پن اُس کا — ہائے وہ ذوقِ خوں شُدنِ اُس کا
آہ! وہ بیقراریاں اُس کی — اور وہ شعلہ باریاں اُس کی
وہ تپش یہ فسردگی افسوس — وہ خلش اور یہ بے حسی افسوس
شوق کے دِن وہ ذوق کی راتیں — اب ہیں عہدِ گزشتہ کی باتیں
اُف وہ ہنستی ہوئی شبِ مہتاب — وہ جنوں آشنا دلِ بیتاب
مہ و انجم سے ہم کلام کبھی — کشتۂ برقِ اوجِ بام کبھی
جلوۂ شاہدِ سحر ہے ہے! — طالبِ حُسن وہ نظر، ہے ہے
ہائے کتنی حسین تھی یہ دُنیا — حُسنِ مطلق کا عکس تھی گویا

اِس کی وہ دلفریبیاں، افسوس
دل کی وہ ناشکیبیاں، افسوس

چھُپ گیا حُسن اب نگاہوں سے
ہم ہوئے دُور اس کی راہوں سے

قحط ہے دل لگی کے ساماں کا
زندگی ہے سفر بیاباں کا

جس میں خنداں تھے انبساط کے پھول
منظر اس راستے کا اب ہے ملُول

گو وہی کائنات ہے ساری
ہوگئی رنگِ حُسن سے عاری

دل کشی ہے نہ خندۂ گُل میں
نہ اثر ہے نوائے بُلبل میں

سبزہ و گُل کی وہ ادا نہ رہی
باغِ عالم کی وہ فضا نہ رہی

منظرِ دھر جا بہ جا بدلا
رنگ لیل و نہار کا بدلا

ہے وہی آسماں وہی خورشید
نظر آتی نہیں شعاعِ اُمید

گو وہی چاند اور ستارے ہیں
چشمکیں ہیں نہ وہ اشارے ہیں

لطف باقی نہیں بہاروں میں
نہ ہے برسات کے نظاروں میں

ہے اسی طور اب نہیں رہنا
پھر غضب یہ کہ شعر بھی کہنا!

کبھی کی یاد

(۱)

بیتابیاں تھیں دن کو اور بے قراریاں تھیں
بیخوابیاں تھیں شب کو اختر شماریاں تھیں
ہر صبح چشم تر سے خوننابہ باریاں تھیں
کیا تجھے بہار کے دن کیا لالہ کاریاں تھیں!

(۲)

کیا لالہ کاریاں تھیں کیا تھے بہار کے دن
وہ بے کلی کی راتیں وہ انتظار کے دن
وہ اضطراب پیہم وہ خلفشار کے دن
تھے اس سکوں سے بہتر وہ اضطرار کے دن!

(۳)

وہ اضطرار کے دن تھے اس سکوں سے بہتر
جب دل رہینِ غم تھا اور جاں بحالِ ابتر
جب داغہائے دل تھے مانندِ مہرِ انور
پہلو میں جب کہ دل تھا ہنگامہ زارِ محشر!

(۴)

ہنگامہ زارِ محشر پہلو میں جب کہ دل تھا
دل آہ! جب کہ وقفِ فریادِ منفصل تھا
ناواقفِ ادائے دُنیائے آب و گِل تھا
فطرت میں وہ تپش تھی جس سے شرر خجل تھا!

(۵)

جس سے شرر خجل تھا فطرت میں وہ تپش تھی
ہر آرزوئے مضطر محوِ ودار و دش تھی
کیا عشق میں تپش تھی کیا حُسن میں کشش تھی
لذّت فزائے ہستی پہلو میں اک خلش تھی!

(۶)

اب دل ہے اور نہ دل میں احساسِ زندگی ہے

جو غم ہے بے مزا ہے — بے کیف ہر خوشی ہے
اے عہدِ رفتہ تیری — کیوں یاد آ رہی ہے
ہاں یاد تیری آخر — کیا ہم سے چاہتی ہے
اشکِ رواں؟ گہر ہیں بے آب کیا کرے گا؟
آہ و فغاں؟ اب اِن کو تاثیر کون دے گا؟

محبّت کے کرشمے

جانبِ مشرق گئی جب صبحدم خالی نظر
دفعتہً مستانہ میں نے اُس پہ اک ڈالی نظر
واژگوں اِک کاسۂ حسرت فزا تھا آفتاب
جامِ زرّیں میں چھلکتی تھی محبّت کی شراب!

آسماں کو میں نے دیکھا پھر نگاہِ غور سے
سر اُٹھا کر میں نے دیکھا پھر نرالے طور سے
گنبدِ ویراں نظر آیا وہ نیلے سنگ کا
تھا وہ اک قصرِ طلسمی لاجوردی رنگ کا!

بہ رہا تھا لے کے پانی پست سا اک رہگذر
آہِ حسرتناک میں نے کھینچ کر دیکھا اُدھر
تنگیِ دل کا سبب تھی وسعتِ پہنائے سندھ
یک بیک بحرِ محبّت ہو گیا دریائے سندھ!

بسکہ مجھ کو آرزوئے منظرِ زیبا رہی
جاتے جاتے اتفاقاً اک نظر ایسی پڑی
چھان مارا میں نے پھر کر پتّا پتّا باغ کا
عکسِ فردوسِ بریں تھا آہ! نقشہ باغ کا!

غنچہ و گُل میں ادائے دلبری ایسی نہ تھی
شورِ مہمل عندلیبوں کی تھی ہاؤ ہُو مجھے

کھل کے جب لوئے محبت میرے اپنے دل نے دی
گُل نظر آیا نگارستانِ رنگ و بُو مجھے!

سرِ گلشن کچھ نہ تھا اک سیدھا سادہ پیڑ تھا
دیدۂ رقص آفریں کا جبکہ جادو چل گیا
کھُب سکا آنکھوں میں کب پہلو کوئی انداز کا
چھا گیا اُس پر وہیں عالم خرامِ ناز کا!

ہو گیا خورشید اوجھل آنکھ سے اور سربسر
ہو گیا محروم لیکن چشمِ اُلفت کھول کر
گرد سی اُڑتی نظر آئی سوادِ شام میں
زُلفِ جاناں کا تماشائی سوادِ شام میں!

محفل آرائے شبستانِ فلک غائب رہا
لیکن انجم سے لڑیں جب پیار کی آنکھیں ذرا
گرچہ شمعوں کی طرح روشن ستارے ہو گئے
انکشافِ راز کو کیا کیا اشارے ہو گئے!

اک تماشا اے محبت! ہیں تری گُلکاریاں
تیری آنکھوں سے نظر جس چیز پر ڈالی یہاں
صرف کر دیتی ہے ہر اک چیز میں صنعت نئی
ہو گیا پیشِ نظر جلوہ نیا، رنگت نئی!

بدنما چہروں میں تُو نے حُسن پیدا کر دیا
دل کی ٹھنڈک کے لئے صحرا کو دریا کر دیا
جلوہ افگن جب ہے تُو ہی خال و خطِ انساں میں تُو
رحمتِ باری ہے دُنیائے سفر ساماں میں تُو!

(ستمبر ۱۹۱۱ء)

موہنی

(روی ورما کی ایک تصویر اور پرانوں کی ایک روایت پر)

ابتدائے آفرینش، جلوۂ صبحِ بہار
روکشِ گلزارِ جنّت تختہ ہائے مرغزار

جلوۂ حسنِ ازل کی، آہ! وہ پہلی جھلک
نو عروسانِ چمن کا، آہ! وہ پہلا نکھار

پتّہ پتّہ شاخ کا وادیِ ایمن در بغل
ذرّہ ذرّہ خاک کا سامانِ طور اندر کنار

بارشِ حسنِ سکوت آمیز کوہ و دشت پر
جیسے ساونوں میں ہو کم کم ابرِ رحمت کی پھوار

حسنِ فطرت کا تقاضا یوں تماشائی سے ہے
جاں کو کر دیجئے فدا، اور دل کو کر دیجے نثار

منظرِ قدرت تو ایسا ہی سہانا ہے مگر
کون دیکھے؟ دیکھنے والے ہیں محوِ کارزار

دیوتا دیت ہیں مصروفِ جدال اک بحر میں
ہیں بلوتے اس کو اور ہوتا ہے امرت آشکار

کون اب امرت پیئے، یہ فیصلہ آساں نہیں
زندگی اور موت کی سی کشمکش ہے بار بار

ہو کے منصف، دیکھئے، ثالث کہاں سے آئے گا
کون ہے ایسا زمیں پر، آسماں سے آئے گا!

ہے لبِ بحرِ رواں اک گلشنِ خاطر نشیں
سبزۂ تر سے زمرّد پوش ہے جس کی زمیں

سایہ افگن لمبی لمبی دوب پر اشجار ہیں
وہ گھنے اشجار جن سے دھوپ چھن سکتی نہیں

اِک تناور پیڑ کی شاخوں میں ہے جھولا پڑا
وا ہے یا آغوشِ شوقِ عاشقِ اندوہ گیں

اور اس جھولے پہ اک مستِ مئے اندازِ حسن
نازپرور، نازنیں، نازک بدن، ناز آفریں

برق طلعت، ماہ وش، خورشید و زہرہ جمال
ہے پرستاں کی پری، یا حورِ فردوسِ بریں

جھولتی بیٹھی نظر آتی ہے کس انداز سے
ناز سے ٹکائے ہوئے ڈوروں پہ دستِ نازنیں

ہے یہ وہ تصویرِ خوبی، یہ وہ نقشِ ناز ہے
غرقِ حیرانی ہو جس کو دیکھ کر ارژنگِ چیں

چاند سا چہرہ اِدھر، اور گیسوئے مشکیں اُدھر
ابر کے پردے سے نکلا ہے ابھی ماہِ مبیں

شانِ رعنائی عیاں ہر عضو سے ہر رنگ سے
اور پھر سب سے سوا اک ادائے شرمگیں

ایک ساڑھی زیبِ بر ہے جو گلے سے پاؤں تک
جسمِ گلگوں سے ہوئی دامانِ گلچیں بالیقیں

موتیا کے ہاتھ میں گجرے ہیں یا موتی کے ہیں
ہم بتائیں، گر نظر جمنے دے حسنِ آتشیں

ڈھونڈھ چلا سبزہ کہ وہ پائے نگاریں چوم لے
بوسۂ دستِ حنائی کے لئے شاخیں جھکیں

تازیانہ اور ہوتا ہے سمندِ ناز پر
ہیں بکھر جاتے ہوا میں جب کہ موئے عنبریں

اے صبا! کھولے ہوئے آغوشِ حسرت سے، فلک
تھام لے پٹڑی کہ ہو جائے نہ کچھ دھوکا کہیں

موہنی ہے نام اُس کا، کیسا پیارا نام ہے
نام و صورت میں تفاوت نام کو اِس جا نہیں

دیکھنے والو! ادب سے دیکھنا اس کو کہ ہے
دونوں عالم کے حسینوں سے نرالا یہ حسیں

یہ مقدس نازنیں دیوی ہے حُسنِ پاک کی
ہے بجا دھو کر پیے گر پاؤں اس کے حور عیں

جلوہ گر حُسنِ حقیقی اس کی صورت میں ہوا
ہیں سبھی خوبانِ عالم جس کی ہستی کے رہیں

موہنی اعجازِ حُسن اپنا دکھانے آئی ہے
یعنی امرت دیوتاؤں کو پلانے آئی ہے!

(جولائی ۱۹۱۰ء)

ۓ راکھشس موہنی کا حُسن و جمال دیکھ کر مبہوت اور بیخود ہو گئے۔ دیوتاؤں نے امرت پی لیا۔

مدرسہ کی یاد

یاد آیا میکہ! خوش طفلِ دلِ بے چارہ تھا ۔۔۔ میری امیدوں کا تو اے مدرسہ گہوارہ تھا

آہ! جب میں وقفِ حسرت ہائے گوناگوں نہ تھا ۔۔۔ آہ! جب میں واقفِ نیرنگیٔ گردوں نہ تھا

میری نظروں میں تھی جب دنیا مسرت کا مقام ۔۔۔ ہاں یہی دنیا جو اب ہے لاکھ عبرت کا مقام

تجھ سے تھا وابستہ میرا روزگارِ خرمی ۔۔۔ آہ جب ہر صبح تھی صبحِ بہارِ خرمی

عافیت کا کنج تھا تو امن کا گھر تھا مجھے

تیرا دامن صورتِ آغوشِ مادر تھا مجھے!

عندلیبِ خوش نوا تھا، دام سے آزاد تھا ۔۔۔ بے قراری ہائے صبح و شام سے آزاد تھا

مثلِ بلبل مجھ کو رہتا جلوۂ گل کا سرور ۔۔۔ ہلکا ہلکا اُف وہ صہبائے تخیل کا سرور

زندگی خود موسمِ گل تھی، بہار آمیز تھی ۔۔۔ انبساط افزا، دلاویز و نشاط انگیز تھی

مجھ سے دنیا، اور دنیا کے بکھیڑے دور تھے ۔۔۔ جن میں ہیبت کا اثر ہے وہ نظارے دور تھے

یوں مرے دل پر مسلط یاس کا عالم نہ تھا

دل تو تھا پہلو میں، لیکن دل میں کوئی غم نہ تھا!

سامنے تھا ہر گھڑی روئے دلآرائے اُمید
اب کہاں وہ لذّتِ ذوقِ تماشائے اُمید

آہ! وہ ایامِ دلکش واپس آسکتے نہیں
اور ہم کھوئی ہوئی خوشیوں کو پاسکتے نہیں

طفلی و عہدِ مسرت ہائے طفلی اب کہاں
ہم کہاں اور تیرے دیوار و درِ اے مکتب کہاں!

ساتھ کے کھیلے ہوئے وہ آشنایانِ عزیز
یاد جن کی اب بھی ہے فرحت دہِ جانِ عزیز

وہ کہاں اور ہم کہاں اے گردشِ لیل و نہار
لے گئی بہتی بہاتی آہ! سیلِ روزگار!

یاد وہ بھی کرتے ہوں گے آہ! ان ایّام کو
اور بہلاتے یونہی ہوں گے دلِ ناکام کو

وہ بھی جن کو تجھ سے اے مکتب ذرا وحشت رہی
اپنی نافہمی کے باعث تجھ سے کچھ نفرت رہی

وہ بھی، ہاں خود وہ بھی جو سمجھا کیے زنداں تجھے
یاد کرتے ہوں گے اب با دیدۂ گریاں تجھے

کیوں کہ دنیا میں میسّر گو انھیں عشرت بھی ہو
اور آزادی بھی ہو، عزّت بھی ہو، شہرت بھی ہو

کس کو مل سکتے ہیں پھر اے مدرسہ طفلی کے دن
خوابِ نوشیں کی وہ راتیں اور بے فکری کے دن!

(۱۹۱۴ء)

اپنا گھر

دُنیا میں اگر مسکنِ راحت ہے تو گھر ہے — ممکن جو کوئی جائے مسرّت ہے تو گھر ہے

درخوردِ تمنائے اقامت ہے تو گھر ہے — اِس دارِ فنا میں کوئی جنّت ہے تو گھر ہے

در ہوتے ہیں وا اس کے لیے جوشِ محبّت

زیبا ہے جو کہئے انھیں آغوشِ محبت!

گھر کانِ مسرّت ہے محبّت کے اثر سے — ایوانِ سعادت ہے صداقت کے اثر سے

سرمایۂ دولت ہے قناعت کے اثر سے — ہمسایۂ جنّت ہے یہ راحت کے اثر سے

گھر ساحلِ دریائے حوادث ہے جہاں میں

رہنا ہے یہیں آکے بشر امن و اماں میں!

گو عالمِ گلزار ہو ہر سمت سفر میں — گلگشت کا سودا ہو سمایا ہوا سر میں

کانٹا سا مگر ایک کھٹکتا ہے جگر میں — گھر دل میں جو رہتا ہی تو دل رہتا ہے گھر میں

ضبطِ دلِ ناکام کا چارا نہیں رہتا

مُدّت جو گزر جائے تو یارا نہیں رہتا!

وحشت سے جو گھر میں کبھی کھجلاتے ہیں تلوے
کانٹوں کے لیے گھر سے نکلواتے ہیں تلوے
جب ہوتے ہیں چھلنی تو مزا پاتے ہیں تلوے
پھر خیر سے خود راہ پہ آجاتے ہیں تلوے

دل تنگ کئے دیتی ہے صحراؤں کی وسعت
خود گھر پہ سکڑتی ہے تمناؤں کی وسعت!

تسکین طلبوں کے لئے گھر دارِ سکوں ہے
رم گھر سے جو کرتا ہے گرفتارِ جنوں ہے
نیرنگ سفر مثمرِ آزارِ فزوں ہے
آوارگیٔ دشتِ سفر کارِ زبوں ہے

نقشہ سا کھچا رہتا ہے گھر کا جو نظر میں
ہوتا ہے یہی باعثِ آرام سفر میں!

کتنا ہی غریبانہ ہو، بیکار نہیں ہے
گھر رفعتِ بام و حد و دیوار نہیں ہے
کچّا ہو کہ خس پوش ہو کچھ عار نہیں ہے
پستی سے کوئی گھر کی نگونسار نہیں ہے

ہو قصرِ شہنشاہ کہ درویش کا چھپّر
دونوں ہیں بحیثیتِ کاشانہ برابر!

بستا ہوا گھر رحمتِ باری کا نشاں ہے
افلاک سے ہر دم پہ برکت جلوہ کناں ہے
نکہت گلِ اُلفت کی وہاں عطر فشاں ہے
ہے گلشنِ شاداب کہ بے نقصِ خزاں ہے

یارب رہے آباد زمانے میں گھر ایسا
ناکام زمانہ ہو مٹانے میں گھر ایسا!

سپاہی کا خواب

(انگریزی سے ترجمہ)

دُورِ اُفق پہ گرنے لگے پردہ ہائے شام   دینے لگی صدائے بگُل امن کا پیام
پہرے پہ مستعد جو کواکب ہوئے تمام   فرشِ زمیں پہ لشکریوں نے کیا قیام
جو تھک گئے تھے مائلِ خوابِ گراں ہوئے
گھائل جو تھے وہ ملکِ عدم کو رواں ہوئے!
میں بھی گیاہِ خشک کے بستر پہ سو گیا   روشن وہیں الاؤ پئے دفعِ گُرگ تھا
دی تھی وہ آگ ہم نے سرِ شام ہی جلا   لاشیں نہ کھوئی جائیں، یہ تھا اس سے مدعا
آدھی بجی تو خواب وہ دیکھا کہ واہ رے
تا صبح تین بار وہ آیا نظر مجھے!
دیکھا کہ دُور ہوں میں صفِ کارزار سے   جنگل کو کاٹتا ہوں کسی رہگزار سے

ظاہر اثر خزاں کا ہے ہر برگ و بار سے　　سورج عیاں ہُوا ہی ابھی کوہسار سے
اور میں رَدواں ہوں جانب کاشانۂ پدر
لیتا ہے وہ بلائیں مری رہ میں آن کر!
جب کھیت وہ سہانے سہانے نظر پڑے　　جو سیرگاہ تھے مری فصلِ شباب کے
بے اختیار دوڑ پڑا فرطِ شوق سے　　نقشے پرانے سب مری نظروں میں پھر گئے
آواز بکریوں کی وہی تھی چٹان پر
اور مست تھا کسان اُدھر اپنی تان پر!
پہنچا میں اپنے گھر جو بصد شوق بے قرار　　مل مل کے مجھ سے روتے تھے احباب زار زار
وعدہ کیا کہ اب میں جاؤں گا نہ یہاں سے　　لیے بطورِ عہد پیا جامِ خوشگوار
بچّوں نے چوم چوم کے بتلائیں اُلفتیں
بیوی نے آہ کھینچ کے کیں لاکھ منّتیں!
"للّٰہ اب نہ جاؤ یہاں سے یہیں رہو　　کافی سہے ہیں رنج، بلا میں نہ اب پھنسو
جھیلی ہیں سختیاں بہت، آرام بھی تو لو"　　میں خستہ جاں بھی سُن کے یہ بولا کہ "جو کہو"
لیکن نمودِ صبح نے مجھ پر ستم کیا
بیوی تھی وہ، نہ بچّے، نہ وہ یار و آشنا!

(اپریل ۱۹۱۲ء)

سرورِ قناعت

بے تاج اگرچہ سر ہے میرا   جانکاہ نہیں ہے دردِ سر بھی

بے داغ ہے دل بھی اور جگر بھی!

دولت مجھے گو نہیں میسّر   محفوظ ہیں جسم و روح میرے

عشرت کے نتائجِ زبوں سے!

شہرت نہیں گو نصیب مجھ کو   حاصل ہے راحتِ یقینی

بے خوفِ گزندِ نکتہ چینی!

ہیں دوست اگرچہ میرے دو ایک   دشمن نہیں ایک بھی جہاں میں

کانٹا نہیں میرے گلستاں میں!

گو حاکمِ مقتدر نہیں ہوں   پکڑے گا نہ کوئی میرا دامن

محشر میں میانِ شور و شیون!

لمبے چوڑے خطاب والے   کھاتے پسِ پشت گالیاں ہیں

گو سامنے اُن کے ڈالیاں ہیں!

شہرت

عبث ہے در پئے شہرت خیالِ خام ترا　　ملے گا کیا تجھے، شہرہ اگر ہو عام ترا
زبانِ خلق پہ جاری رہا جو نام ترا　　سنور نہ جائے گا اے دوست اس سے کام ترا

مدارِ زیست ہو آوازۂ عوام پہ کیوں؟
جو تجھ سے دور ہے مرتا ہے ایسے نام پہ کیوں؟

یہ آرزو ہے؟ کہ جب تجھ کو دیکھ پائیں گے لوگ　　تو ایک دوسرے کو شوق سے دکھائیں لوگ
بغور دیکھیں تجھے، سامنے جب آئیں لوگ　　کہیں سے گزرے جو تو، انگلیاں اٹھائیں لوگ

مگر یہ شان تو رکھتے ہیں ریچھ، بندر بھی
ہیں بہرہ یاب بقدرِ ہنر قلندر بھی!

نہ اوڑھنے کی ہے یہ چیز اور نہ کھانے کی　　نہ دردمند غریبوں کے کام آنے کی
نہ ساتھ تیرے عدم کے سفر میں جانے کی　　دوا نہیں یہ کسی درد کے مٹانے کی

جہاں سے رشتہ جو مشہور لوگ توڑ گئے
یہیں وہ "شہرت بے انتہا" کو چھوڑ گئے!

کبھی یہ ٹال سکی ہے کسی مصیبت کو؟ سبک کیا ہے کبھی اس نے بارِ کلفت کو؟
بدل سکی ہے یہ عشرت سے گاہ عُسرت کو؟ بڑھا دیا ہے کہیں شانِ آدمیت کو؟

کسی کو موت کے مُنہ سے چھڑا لیا ہے کبھی؟
کسی کے واسطے شہرت نے کچھ کیا ہے کبھی؟

اگر پڑا ہوا لاہور میں ہے تو رنجور خراب و خستہ و غمدیدہ، بیکس و مجبور
ہے نام کابل و کشمیر تک ترا مشہور تو اس سے کیا تجھے مل جائیں گے نشاط و سرور

غرض نہیں ہے کسی درد کی دوا شہرت
ہے نام ایک خیالی سراب کا شہرت!

بچّہ
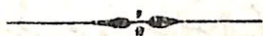
اے کہ اپنے ساتھ گھر بھر کی خوشی لایا ہے تُو
کس وطن کی یاد میں روتا ہوا آیا ہے تُو

کون سی دُنیائے خنداں یاد آتی ہے تجھے؟
رونے والے! یاد کس کس کی رُلاتی ہے تجھے؟

کیا کوئی زرّیں جزیرہ چھوڑ کر آیا ہے تُو
گلشنِ فردوس سے منہ موڑ کر آیا ہے تُو؟

یاد ایسے ہی تو کچھ آتے ہیں نظارے تجھے
اجنبی سے اس جہاں کے نقش ہیں سارے ہیں تجھے

کس لیے حیرت سے یوں ہر اک کا منہ تکتا ہے تُو
کچھ تو کہنا چاہتا ہے، کہہ نہیں سکتا ہے تُو

ہم کو بھی معلوم ہے، تُو ہے مسافر دُور کا
مطلقاً اس دیس کی بولی سے ہے ناآشنا

ہاں بتا! وہ سرزمینِ عافیت تھی کون سی؟
بستی ہے دل میں ترے دل خواہ بستی کون سی؟

روشنی ہوتی ہے کیسی چاند سورج کی وہاں؟
تیرے چہرے پر ہویدا ہیں ابھی حسن کے نشاں

کس چمن کا گُل ہے تو؟ کس عرش کا تارا ہے تو؟
کس قدر ہے پاک و روشن! کس قدر پیارا ہے تو؟

آہ! اے نو واردِ ہستی! تجھے معلوم کیا!
انقلاباتِ زمانہ ہیں مچاتے دُھوم کیا!

آج تو روتا ہے جس دُنیا کو زندان جان کر
کل نہ چھوڑے گا اسی کو باغِ رضواں جان کر

اِس قدر مانوس ہو جائے گا اِس دُنیا سے تُو
پھر وطن کی یاد ہوگی اور نہ اُس کی آرزو

یاد بُھولے سے نہ آئے گا تجھے اپنا وطن
تو سمجھے گا اسی غربت کو ہی پیارا وطن

حاصل اک دن بھی نہ ہوگا، گرچہ اطمینانِ دل
پھر بھی دنیا ہی رہے گی شاملِ ارمانِ دل!

(۱۹۱۹ء)

بچّے کی مُسکراہٹ

نہ ہجومِ آرزو ہے نہ وہ حسرتوں کا جمگھٹ
وہ نقوشِ داغِ حرماں ہوئے دل سے محو جھٹ پٹ
کہ اُنھیں مٹا گئی ہے
تری ایک مُسکراہٹ!

تری ایک مسکراہٹ ہے دوا ہزار اَلَم کی
تجھے دیکھ کر نہ دیکھے دلِ زار شکل غم کی
مرے دل کو بھا گئی ہے
تری ایک مُسکراہٹ!

رُخِ یاس کو چھپا دے　　　اُثرِ اُمید جیسے
شبِ تار پر ہو غالب　　　سحرِ سعید جیسے
یُونہی دل پہ چھا گئی ہے
تری ایک مُسکراہٹ!

نہ قمر کے نور میں ہے　　　نہ سحر کی روشنی میں
نہ شفق کے رنگ میں ہے　　　نہ ہے پھول کی ہنسی میں
جو سماں دکھا گئی ہے
تری ایک مُسکراہٹ!

ہیں غضب کے خار پنہاں　　　گُلِ خندۂ بُتاں میں
نہ نظر اُٹھاؤں اُن پر　　　کبھی گلشنِ جہاں میں
کہ پسند آ گئی ہے
تری ایک مُسکراہٹ!

نہ کہے گا کوئی شاعر　　　اسے برقِ خرمنِ دل
یہ ہے صبحِ نو بہاراں　　　بفضائے گُلشنِ دل
گُلِ تر کھلا گئی ہے
تری ایک مُسکراہٹ!

کوئی چشمۂ مسرت　　　ترا دل ہے، طفلِ ناداں

یہ تبسم ہیا پئے ہے بہ رنگِ موجِ رقصاں
مجھے خود بتا گئی ہے
تری ایک مسکراہٹ!

نئی بزمِ دہر میں ہے ابھی انبساط تیری
ہے بہت سرور افزا یہ مئے نشاط تیری
جو مجھے پلا گئی ہے
تری ایک مسکراہٹ!

تو گناہ سے بری ہے یہ ہے وجہِ شادمانی
وہ تری صفائے دل ہے کہ ہو آئینہ بھی پانی
یہ مجھے بتا گئی ہے
تری ایک مسکراہٹ!

(سنہ ۱۹۲۰ء)

عجیب و غریب

طالب ہوئے جو نظمِ عجیب و غریب کے
بکھرے ہوئے حواس ہیں شاعر غریب کے

سکتے نہیں ہے قلم کہ لکھے بھی تو کیا لکھے
جو واقعی عجیب ہو وہ ماجرا لکھے

کوئی نہیں یہاں نظر آتی عجیب شئے
جو چیز اپنے زیرِ نظر ہے سو کہنہ ہے

روشن بہت کواکب و خورشید و ماہ ہیں
پر وہ بھی پائمالِ سمندِ نگاہ ہیں

دیکھی ہوئی ہے سب کی فضائے چمن بہت
ہے داستانِ بلبل و گل بھی کہن بہت

ہرگز نہیں حکایتِ مہر و وفا نئی
ہے عشق میں نہ حسن میں کوئی ادا نئی

ہیں حسن کی طرف سے دل آزاریاں وہی
اور آج تک ہیں عشق کی لاچاریاں وہی!

کب تازہ بزم و رزم کے منظر دکھاتی ہو
تاریخ اپنے آپ کو دہرائے جاتی ہے

سو بار کی کہی ہوئی باتوں کو کیا کہیں
کس بات کو عجیب کہیں یا نیا کہیں؟

ہیں نظمِ کائنات کے مضموں کہن تمام
ہوتا ہے اس خیال سے ذوقِ سخن تمام

ہاں ایک بات ہے جو نہایت عجیب ہے
حیراں اسی پہ یہ دلِ حیرت نصیب ہے

ہیں سب مآلِ ہستیٔ فانی کو جانتے
اور اپنی زندگی کو ہیں دو روزہ مانتے

پھر بھی یہ زورِ حرص و ہوا ہے کہ الاماں
ہنگامہ زا وہ جہدِ بقا ہے کہ الاماں

غالب طلوعِ فکر پہ غفلت کی رات ہے
اس سے عجیب تر بھی کوئی اور بات ہے؟

نیند

راحت افزائے جانِ زار ہے تُو — مرہمِ خاطرِ فگار ہے تُو
نکہتِ صبحِ نو بہار ہے تُو — کہ نہایت ہی خوشگوار ہے تُو

بس کہ دل کش ادا ملی تجھ کو
چشمِ عالم میں جا ملی تجھ کو؛

جب پری بن کے شب کو آتی ہے — کیا عجب شعبدے دکھاتی ہے
گو حیا سے بدن چُراتی ہے — سو کرشمے دکھائے جاتی ہے

تیرے ہوتے نگارِ پردہ نشیں
پردے مژگاں کے مطلق اُٹھتے نہیں!

کھچ سکے ہم سے کیا ترا نقشہ　　کہ دکھاتی ہے نت نیا نقشہ
سارے نقشوں میں دلربا نقشہ　　وہ ترا خوابِ ناز کا نقشہ

نرگسِ نیم باز کا عالم
خمِ زلفِ دراز کا عالم!

خوابِ معصوم طفلِ ناداں کا　　جلوہ صاف ماہِ تاباں کا
نام حسرت کا ہے نہ ارماں کا　　چہرہ آئینہ روحِ فرحاں کا

تو جو سوتے میں گدگداتی ہے
مسکراہٹ لبوں پہ آتی ہے!

کہیں خوابِ گراں کی صورت میں　　اور کہیں شکلِ خوابِ راحت میں
بزمِ عشرت میں، کنجِ عسرت میں　　طرب و عیش میں، مصیبت میں

دل سے ہر ایک کو عزیز ہے تو
خوابِ نوشیں! عجیب چیز ہے تو

انقلاب

عالم کا ذرّہ ذرہ ہے دُنیائے انقلاب — ہوتا ہے صبح و شام تماشائے انقلاب

فطرت نے باغِ دہر میں کیا کیا کھلائے گُل — غنچوں کے دل میں بھر کے تمنّائے انقلاب

ساحل کو موج، موج کو ساحل بنا گیا — آیا جو اپنی موج پہ دریائے انقلاب

منظر تمام اُس کے تغیّر پذیر ہیں — یہ وادیٔ کہن ہے تہِ پائے انقلاب

غم سے ملول دل ہو نہ شاداں خوشی سے ہے — دُنیا مری نگاہ میں ہے جائے انقلاب

بدلے کبھی ہماری خزاں کبھی بہار سے — نیرنگ کوئی ہم کو بھی دکھلائے انقلاب

قائم جو اپنی ذات میں محوِ ثبات ہیں
محروم اُن کو کچھ نہیں پروائے انقلاب!

کیا سے کیا!

ولیم ورڈزورتھ کے اشعار کا ترجمہ

(۱)

پٹی پڑی تھی چشم حقیقت نگر پہ اور
بے خوف دل مرا تھا فنا کے خیال سے
ایسا ہی تھا طلسم کہ میرا گمان یہ تھا
ہے اس کا حسن دور فنا سے زوال سے!

(۲)

زیر زمیں ہے بے حرکت اب پڑی ہوئی
وہ باز دید ہے نہ وہ گفت و شنید ہے
چکر میں ہے زمیں کے ہنڈولے میں رات دن
اک تو وہ گل کا سنگ و شجر پر مزید ہے!

مارِ آستیں

تیرا کاٹا بچ نہیں سکتا ہے، مارِ آستیں
کارگر تریاق تیرے زہر پر ہوتا نہیں

اشرف المخلوق میں ہوتا ہے تو عزت پذیر
کو برا ہے تو، نہ چیت کبرا، نہ مارِ یاسمیں

روز و شب رہتی ہے تجھ کو اپنے ہم جنسوں کی تاک
آہ! اے سفاک کچھ پاسِ وفا بھی ہو کہیں

تجھ سے اچھے سانپ گو دشمن ہیں آدم زاد کے
اپنے ہم جنسوں سے لیکن وہ نہیں سرگرمِ کیں

تجھ سے اچھے سانپ جو دشمن ہیں دشمن کی طرح
زہر کو وہ زہر بتلاتے ہیں، اور تو انگبیں

تجھ سے اچھے سانپ جو ڈستے نہیں چھیڑے بغیر
ہاں عدو کو وہ چکھا دیتے ہیں زہرِ آتشیں

تجھ سے اچھے سانپ جو ہیں واقفِ حسنِ ازل
مست کر دیتا ہے جن کو جلوۂ ماہِ مبیں

بین کے نغمے سناتے ہیں جنھیں پیغامِ دوست
خوب لہراتے ہیں سن سن کر نوائے دل نشیں

معنیِ خذ ما صفا کا ہم کو دیتے ہیں سبق
ہو کے محوِ جستجوئے شاخ ہائے صندلیں

تجھ سے اچھے سانپ جن کو نازِ دل بستگی
موشگافانِ سخن کہتے ہیں زلفِ عنبریں

تو بھی اک مارِ گزندہ، وہ بھی مارِ جانستاں
آستیں میں گھر ہے تیرا، دور رہ خلوت گزیں

اُن سے بڑھ کر کاٹنے والا سمجھتا ہوں تجھے
میں تو سو کالوں کا اک کالا سمجھتا ہوں تجھے!

ہو گئے اے ظالم! رہ و رسمِ وفا سے بے نیاز
دستِ جور اپنے ہواخواہوں پہ کرتا ہے دراز

کھیلتا ہے آہ! جن ہاتھوں پہ اُن کو کاٹ کر
ہاتھ کیا آتا ہے تیرے! اے اسیرِ بندِ آز

تیری باتوں میں تملّق، تیری گھاتوں میں فساد
تُو بباطن دشمنِ جاں، اور بظاہر دل نواز

خم بہ خم ہیں تیری چالیں مارِ پیچاں کی طرح
ہائے تیرے جوڑ توڑ، اے وائے تیرے ساز باز

راستی تجھ میں نہیں ہے کیونکہ تُو اک سانپ ہے
سانپ بھی ایسا کہ ہو پھُنکار جس کی جانگداز

کاٹ لیتا ہے اِسے اور پھُونک دیتا ہے اُسے
دوست دشمن میں نہیں ہے تجھ کو ظالم امتیاز

تیرے چھپن میں آہ! اے ظالم غرض کا زہر ہے
تیرے حیلے ہیں بُرے، سَم کی قسم اے حیلہ باز

بیچ ہی ڈالا اُسے بدباطنوں کے ہاتھ حیف
جس کے قدموں پر ادا کی تھی یوحنا نے نماز

داستانِ چاہِ یوسف جب سے دُنیا میں چھڑی
بھائی کو بھائی کی ہمدردی پہ نازیبا ہے ناز

کون بتلائے کہ سرہنگانِ دارا کون تھے
کھول مارِ آستیں کچھ فتحِ اسکندر کا راز

تُو نہ ہے گیسوئے مُشکیں، تُو نہ زُلفِ عنبریں
تیرا سودا ہو جہاں میں کس کو مارِ آستیں!

شاعر اور شاعری

شاعر

شکوہ سنجی آج کرتے ہیں بھری محفل میں ہم
گرچہ ہیں دلدادہ تیرے نام کے اے شاعری

جب سنبھالا ہوش تو پایا اسے تیرا اسیر
دل پہ سو پھندے ہیں تیرے دام کے اے شاعری

تیری اُلفت نے ہمیں آخر نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے اے شاعری

تیری نسبت سے ہوئے ناکارہ ہم، آوارہ ہم!
ہو گئے مورد ہر اک الزام کے اے شاعری

تُو اگر مقبولِ دوراں ہے تو پھر ہوتے ہیں کیوں
وار ہم پر گردشِ ایّام کے اے شاعری

کس لئے رکھتا ہے یوں ہم کو زباں تلخ کام
ہم نہ طالب نغمے کے نے جام کے اے شاعری

ہو گئے کافی ہماری بے خودی کے واسطے
صبح کے جلوے ستارے شام کے اے شاعری

پختہ کارانِ جہاں کا کعبۂ مقصد ہے اور
ہم پُجاری ہیں خیالِ خام کے اے شاعری

اے فدائے روئے رنگینت دلِ حیرانِ ما
شعلۂ مضطر چرا انداختی در جانِ ما؟

شاعری

میں جواب اس کا تجھے دیتی ہوں سن اے شکوہ سنج
آنکھ سے تیری ابھی پردہ اٹھا دیتی ہوں میں

جو نگاہِ جستجو کی منزلِ مقصود ہے
وہ جہانِ حسن شاعر کو دکھا دیتی ہوں میں

آئینے اس خاکداں میں صاف رہ سکتے نہیں
دل اگر کوئی مکدر ہو، جلا دیتی ہوں میں

کفر و دیں سے ہو گیا بالا مرا محوِ جمال
اک نظر سے تفرقے سارے مٹا دیتی ہوں میں

عشق کے چرچوں کو دیتی ہوں نویدِ زندگی
حسن کے جلووں کو پیغامِ بقا دیتی ہوں میں

اور کر دیتی ہوں اس اجڑی ہوئی محفل کا رنگ
اپنے افسوں سے اسے جنت بنا دیتی ہوں میں

گامزن جس پر رہے ہیں صوفیانِ باصفا
عالمِ قدسی کی وہ راہیں دکھا دیتی ہوں میں

جس کی نے پر بزمِ انجم میں رہا کرتا ہے رقص
گوشِ باطن کو وہی نغمے سنا دیتی ہوں میں

طائرانِ خوشنوا کو پھانسنے کے واسطے!
دامِ رنگینِ حسنِ ظاہر کے بچھا دیتی ہوں میں

تربیت کے ہوں جو قابل ان کو رکھ لیتی ہوں پاس
باقیوں کو ہاتھ سے اپنے اڑا دیتی ہوں میں

اس پہ جاں اپنی چھڑکتی ہوں بصد ذوقِ وفا
دہر میں دلدادہ اپنا جس کو پا لیتی ہوں میں

چاہنے والے کا اپنے از رہِ عزّ و وقار
مرتبہ شاہانِ عالم سے بڑھا دیتی ہوں میں

فکرِ دنیا کے عوض دیتی ہوں فکرِ معنوی
سوچ اے محروم! کیا لیتی ہوں، کیا دیتی ہوں میں

شکوہ تیرا ابھی سنا لیکن مجھے جو تجھ سے ہے
وہ شکایت ایک مطلع میں سنا دیتی ہوں میں

کب مری زلفوں کے پھندوں میں الجھ کر رہ گیا،
دل ترا دنیا کے دھندوں میں الجھ کر رہ گیا!

دُنیا

نقشِ بر سطحِ آب ہے دُنیا — بلکہ موجِ سراب ہے دُنیا

ہوشیار اس سے بچ کے رہتے ہیں — کہ نہایت خراب ہے دُنیا

ایک حالت پہ رہ نہیں سکتی — پیکرِ انقلاب ہے دُنیا

شبِ غفلت ہے زندگی اپنی — اس میں نیرنگِ خواب ہے دُنیا

چند روزہ ہے اور فانی ہے — پھر بھی کیا لاجواب ہے دُنیا

تا جوانی ہے دل کشی اس میں — ہیچ بعدِ شباب ہے دُنیا

ہم نے دیکھا ہے خوب اسے محرومؔ
منزلِ پیچ و تاب ہے دُنیا

مناظرِ قدرت

صحرا

شہر کی گلیوں میں گھبراتا ہوں میں
دل کو بہلانے یہاں آتا ہوں میں

دل کی آسایش یہیں پاتا ہوں میں
تیری وسعت پر مٹا جاتا ہوں میں

گو نہیں مجھ کو جنوں، سودا نہیں
تجھ سے بڑھ کر جا کوئی صحرا نہیں!

شہر ہے میرے لئے دشتِ جنوں
دل کو واں حاصل نہیں ہوتا سکوں

شعلہ زن ہے آتشِ دنیائے دُوں
رکھتی ہے دل کو سدا سیماب گوں

آہ! پر تیری نسیمِ خوش گوار
ہے مجھے سرمایۂ صبر و قرار!

ہیں قریبِ شہر کچھ باغ و چمن بے گماں ہے دل کُشا جن کی پھبن
ہیں شگفتہ اُن میں نسریں و سمن طائرانِ خوش نوا ہیں نغمہ زن

بُلبل و گُل کے مگر جھگڑوں کے خار
پہلوئے تسکیں کو کرتے ہیں فگار!

ہے جو حاصل تیرے دامن میں قرار وہ کہاں؟ پھرتا رہوں شہر و دیار
خاک تیری مرہمِ قلبِ فگار سوزنِ زخمِ جگر ہر نوکِ خار

ہے تپِ دنیا اُتر جاتی یہاں
رُوح کچھ کچھ چین ہے پاتی یہاں!

ناقۂ رعنائے لیلائے خیال تجھ میں آتا ہے نظر با صد جمال
دل سے مٹ جاتے ہیں فرقت کے ملال تیری محفل ہے مجھے بزمِ وصال

تیری جلوت میں ہے خلوت کا سماں
تیری کثرت میں ہے وحدت کا سماں!

دم تخیّل کا نہیں گھٹتا یہاں ہے زمیں پھیلی ہوئی، دُور آسماں
دیکھ کر افکار کی جولانیاں گرد میں ہوتا ہے خود صحرا نہاں

ہے یہاں وسعت خیالوں کے لئے
ہے یہ میداں فکر والوں کے لئے!

روبرو ہے ہر طرف ساری زمیں صاف آتا ہے نظر چرخِ بریں

واہ! جنگل کی فضائے دل نشیں کوہ و دریا کے مناظر ہیں کہیں

گھومتا ہے ہر طرف خطِ نظر

مرکزِ ادوارِ عالم ہے بشر!

ہے ترا ہر فصل میں منظر نیا دیکھتا ہوں میں تجھے اکثر نیا

سبز جوڑا ہے کبھی تن پر نیا لالہ و گل کا کبھی زیور نیا

سال میں کیا کیا بدلتا رنگ ہے،

اِک سے اِک بڑھ کر نکلتا رنگ ہے!

تُو ٹھکانا غم کے ماروں کے لیے امن کا گھر بے قراروں کے لئے

دل کی راحت دل فگاروں کے لئے الغرض ایسے ہزاروں کے لئے

دہر میں اک بے بدل ٹھاہے تُو

جنّت الماوا ہے یا صحرا ہے تُو!

(۱۹۱۴ء)

آندھی

توصیف لب پہ لالہ و گُل کی سدا رہی — پیشِ نظر خرامشِ بادِ صبا رہی
محروم! دل فریب یہ طرزِ ادا رہی — اِک ڈھنگ پر مگر تری طبعِ رسا رہی

اب یہ دکھا کہ رنگ بدلتی ہے کس طرح
آندھی کلُور کوٹ کی چلتی ہے کس طرح!

وہ گرد کا پہاڑ اُٹھا پھر شمال سے — بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت میں ہے اگرچہ یہ باہر مثال سے — آتی ہے فوجِ دیو نظر چال ڈھال سے

رُوپوش اُس کے خوف سے کوہِ گراں ہُوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رُخِ آسماں ہُوا!

ہر سمت آرہی ہے سراسیمگی نظر — بے چارگی کی بن گئے تصویر سب شجر
شاخوں میں چھپتے پھرتے ہیں طائر ادھر اُدھر — مامن کی راہ دوڑ کے لینے لگے بشر

چوپائے بھانپ کر یہ مصیبت کہاں گئے؟
ان بیکسوں کے سینگ سمائے جہاں، گئے!

آتی ہے مثلِ اژدرِ صحرا پھُنکارتی — للکارتی فلک کو، زمیں کو پکارتی
ذرّوں کو تا بہ چرخِ چہارم اُبھارتی — اُڑتے ہوؤں کو اوجِ فضا سے اُتارتی

یکساں بلند و پست پہ چھاتی ہوئی چلی
ہل چل زمیں زماں میں مچاتی ہوئی چلی!

جڑ سے اُکھڑ کے نخلِ تناور کہیں گرا — ٹہنا کسی غریب کے سر پر کہیں گرا
چھپّا اُڑا کہیں سے تو چھپّر کہیں گرا — دیوار سے اُکھڑ کے کوئی در کہیں گرا

جو چیز صحن میں تھی وہ صحرا میں جا پڑی
اہلِ زمیں پہ کیسی یہ اُفتاد آ پڑی!

چکر سے گرد باد کے چکرا گئی زمیں — دیکھا یہ زور شور تو گھبرا گئی زمیں
جھونکوں کے ساتھ اُڑتی ہوئی آ گئی زمیں — بس اب کسی ستارے سے ٹکرا گئی زمیں

آثار ہیں ظہورِ قیامت کے سر بسر
اجزائے دہر ہوتے ہیں جھونکوں سے منتشر!

جب آسماں پہ اس کا عَلَم ہو گیا بلند — کرنے لگے بچاؤ کی تدبیر ہوشمند

تا بامِ چرخ جس کی رسائی ہو بے کمند — کس کی مجال ہے جو کرے اس کی راہ بند

چھپ چھپ کے لاکھ بیٹھیے کب چھوڑتی ہے یہ
دروازے کھٹکھٹاتی نہیں، توڑتی ہے یہ

آندھی نہیں نمونۂ قہرِ خدا ہے یہ — شعلوں سی تند خو ہے بظاہر ہوا ہے یہ
بارش ہے جس کی خاک وہ کالی گھٹا ہے یہ — تھمنے پہ اب تو آ گئی، شکرِ خدا ہے یہ

صحرا کی طرح بند مکانوں میں گرد ہے
نتھنوں میں، منہ میں، آنکھوں میں، کانوں میں گرد ہے

افسوس میں ہوں اور یہ صحرائے ہولناک — اڑتی ہے جس میں شام و سحر آسماں پہ خاک
ہاں جشنِ جائے سرد تو گلبن کے بدلے آگ — دل اس الم میں دامنِ گل کی طرح ہے چاک

ان خاکباریوں سے گئی وہ صفائے طبع
اب بھول کیا زمینِ سخن میں کھلائے طبع؟

عالمِ آب

دریائے سندھ کی طغیانی کا نظارہ

جامِ لبریز کی مانند چھلک کر دریا — دُور تک اپنے کناروں سے پرے پھیل گیا
ہر طرف پانی ہی پانی کا جو نقشہ دیکھا — مصرعۂ تر یہ کسی کا مرے لب پر آیا

ہر کُجا مے نگرم، عالمِ آب است ایں جا!

ہوئی اس درجہ سرِ سطحِ زمیں وسعتِ آب — کہ فلک مجھ کو نظر آنے لگا مثلِ حباب
آب در آب ہے یا پانی میں ہے عکسِ سحاب — نیچے اوپر یہی پانی کے نظارے ہیں جناب

ہر کُجا مے نگرم، عالمِ آب است ایں جا!

فوجِ امواج نے ہر سمت جو مارے میداں — کثرتِ آب سے اب بحر ہیں سارے میداں
دُور پانی سے جو تھے ایک کنارے میداں — سر بسر ہو گئے غرقاب بچارے میداں

ہر کُجا مے نگرم، عالمِ آب است ایں جا!

قریہ و دیہہ میں دکھاتا ہے روانی پانی　　　گلی کوچوں میں خرابی کا ہے بانی پانی
گاؤں والوں کا ہوا دشمنِ جانی پانی　　　غرض آبادی و ویرانہ ہے پانی پانی

ہر کجا مے نگرم، عالم آب است ایں جا!

ہے کہیں ڈوبا ہوا سبزۂ تر پانی میں　　　اور پودے ہیں کہیں تا بہ کمر پانی میں
کیا تعجب؟ ہیں گر استادہ شجر پانی میں　　　یہ جگہ وہ ہے کہ رہتے ہیں بشر پانی میں

ہر کجا مے نگرم، عالم آب است ایں جا!

پانی رُک رُک کے ہوا جاتا ہے بیتاب کہیں　　　موجیں اُٹھتی ہیں کہیں، اور ہے گرداب کہیں
کہیں اِک زور کا ریلا ہے تو سیلاب کہیں　　　تا بہ گردن ہے کہیں، اور ہے پایاب کہیں

ہر کجا مے نگرم، عالم آب است ایں جا!

بُلبُلہ

پُھولا ہوا ہے کس لئے ؟ کیا بُلبلے میں ہے　　اللہ ! کون سی یہ ہَوا بُلبُلے میں ہے

اُف ! کس قدر غرُور بھرا بُلبلے میں ہے　　فرعون کوئی آکے چُھپا بُلبُلے میں ہے ؟

کِتنا اُبھار، کِتنی اکڑ، کیسی شان ہے

پانی کی ایک بُوند میں کیا آن بان ہے !

ہے آب و تاب خوب، مگر یہ گُہر نہیں　　ہے تاج یہ کِسی کا، مگر زیبِ سر نہیں

گنبد عجیب سا ہے، مگر کوئی در نہیں　　سر میں ہَوا ہے اس کے مگر نیشتر نہیں

دَم خم کے ساتھ کبھی نہیں تلوا یہ بُلبُلہ

پھر چیز کیا ہے اے اُولوالابصار بُلبُلہ ؟

یارب ! کِسی کا آبلۂ پا ہے بُلبُلہ　　یا دل جلوں کے دل کا پھپھولا ہے بُلبُلہ

فوراً نہاں نظر سے جو ہوتا ہے بُلبُلہ　　مجھ کو یقیں ہے بیضۂ عنقا ہے بُلبُلہ

یہ بُلبُلہ ہے یا کہ طلسمِ حیات ہے

پیدا ابھی ہُوا ابھی نذرِ ممات ہے !

چھوٹا سا ایک خیمۂ آبی کہُوں اسے　　یا گُنبدِ فلک سے میں تشبیہ دُوں اسے

جامِ بلور ہے جو کروں واژگوں اسے   کس مستِ بادہ خوار نے پھینکا نگوں اسے!

کس نازنیں کی بزم کا یارب! یہ جام ہے

سارے جہاں کی جس پہ نزاکت تمام ہے!

محروم! اس کو چشمِ بصیرت سے دیکھئے   اپنی نگاہِ عاشقِ قدرت سے دیکھئے

کچھ سوچئے جناب! نہ حیرت سے دیکھئے   ہر ایک شئے کو دیدۂ عبرت سے دیکھئے

جویائے گنجِ رازِ نہاں کے لئے یہاں

عالم کا ذرّہ ذرّہ ہے اسرار کا جہاں!

ہے وقت موجِ آبِ رواں اور یہ شرر   ہے بُلبلہ کہ اپنی فنا سے ہے بے خبر

آجائے ایک موجۂ بادِ فنا اگر   رہ جائے بُلبلے کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر

کرتا ہے بُلبلہ سبق آموزیٔ فنا!

دیتا ہے آدمی کی حقیقت کا یہ پتا!

پانی کی بُوند بُوند بشرا اور حباب ہیں   اور دونوں اس جہان میں نقشِ برآب ہیں

دونو نشۂ غرور سے مست و خراب ہیں   اور اس لئے غریقِ یمِ پیچ و تاب ہیں

دل میں اگر خودی نہ ہو، سر میں ہوا نہ ہو

ہوں اپنی اپنی ذات میں، صورت جُدا نہ ہو!

(جولائی ۱۹۰۰ء)

سِندھ کو پیغام

اے رودِ کُرم! کیجیو پیغام رسانی — جب دُور سے آجائے نظر سندھ کا پانی

جو کچھ کہوں، لِلّٰہ! اُسے یاد سے کہنا — حسرت بھری آواز میں، فریاد سے کہنا

کہنا کہ مسافر کوئی آوارۂ غربت — دیتا تھا سلام اور یہ کہتا تھا بہ حسرت!۔

اے آبِ اباسین کہ بصد موج رواں ہے

معلوم ہے تجھ کو، ترا شیدائی کہاں ہے؟

با چاکِ گریباں وہ کہیں خاک بسر ہے — مشغول تری یاد میں با دیدۂ تر ہے

آتے ہیں اُسے یاد ترے سبز کنارے — بیچارے کی آہوں سے نکلتے ہیں شرارے

وہ سبزۂ ساحل کا ترے نرم بچھونا — ساون میں مرا زیرِ شجرِ چین سے سونا

ساون کی گھٹاؤں کا وہ پھر جھوم کے آنا
وہ ناچنا موجوں کا، پرندوں کا وہ گانا!

طفلی وہ مری، اور وہ معصوم اُمنگیں — اے وائے! وہ دل خوش کُن موہوم اُمنگیں
وہ کھیلنا میرا تری امواج سے دن بھر — وہ چھیڑ مری بُلبلے کے تاج سے دن بھر
خورشید جہاں تاب کا وہ چھپ سے نکلنا — سحر دم کا وہ شوق میں بستر سے اُچھلنا

نورانی دوپٹے میں کرن کا وہ بکھرنا
سو ناز سے اُس کا وہ عروسانہ اُترنا!

تعظیم میں اُس کی، وہ تری ناصیہ سائی — اور ذوقِ تمنا میں وہ آغوش کشائی
وہ چھیڑنا اُس کا تجھے اور آ کے نہانا — اے سندھ! وہ تیرا اُسے چھاتی سے لگانا
کیا خوب تھے برسات میں قدرت کے نظارے — کثرت نے دکھائے مجھے وحدت کے نظارے

وہ کونسا قطرہ تھا جو ہستی کو مٹا کے
آگاہ نہ کرتا گیا اسرارِ بقا سے؟

پھرتا ہوں اسی خوابِ پریشاں میں ابھی تک — نقشے ہیں وہی دیدۂ حیراں میں ابھی تک
اے آہ! وہ بجروں کی روانی کے نظارے — بھولیں گے نہ مجھ کو کبھی پانی کے نظارے
ملاحوں کے ہیں گیت مجھے یاد ابھی تک — چُپکے سے ہے گاتا دلِ ناشاد ابھی تک

کشتی کا کبھی حلقۂ گرداب میں آنا!
ملاح کی عورت کا وہ یوں شور مچانا!

"اللہ بچا لے! مرے اللہ بچا لے! — عاجز ہوں میں، سب کچھ ہے مرا تیرے حوالے

او ورطۂ خوں خوار! یہ بیداد نہ کرنا — اے میرے خدا! مجھ کو تو برباد نہ کرنا

ہاں، المدد اے حضرتِ الیاس بچانا — بے کس ہوں، بچانا، ہے تری آس بچانا

کس کنج میں خوابیدہ ہو پورب کی ہوا تم — پہنچو، مری کشتی کو تمھیں آکے بچاؤ

تقدیر نے کشتی جو پھنسائی ہے بھنور میں
کشتی مری امید کی آئی ہے بھنور میں!"

(اپریل سنہ ۱۹۰۶ء)

کنارِ راوی

غمِ دل آفتِ سماوی ہے — زندگی موت کے مساوی ہے
زخمِ پنہاں جگر پہ حاوی ہے — اشک ریزی جگر تراوی ہے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

ہم کہاں اور سیرِ باغ کہاں — ذوق و شوق و دل و دماغ کہاں
گلشنِ دہر میں فراغ کہاں — چین دیتے ہیں دل کے داغ کہاں

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

اُڑ چلے طائر آشیانوں کو ملا آرام باغبانوں کو
نغمے یاد آئے نغمہ خوانوں کو کیا کروں سُن کے میں ترانوں کو

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے:

خواہ چڑواہے، خواہ چوپائے شوق سے اپنے گھر کو لوٹ آئے
خانہ ویراں کو گھر جو یاد آئے کیا کرے؟ ہائے! کوئی بتلائے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

مہرِ تاباں تھا مائلِ آرام کوہِ مغرب میں جا کیا بسرام
سو گیا لے کے تن پہ چادرِ شام اُس کے آرام سے مجھے کیا کام

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے:

آنکھ کھولی اِدھر ستاروں نے جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے
گو اشارے کئے ہزاروں نے آنکھ اُٹھائی نہ غم کے ماروں نے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

جلوے دکھلائے گورے گالوں نے	جال پھیلائے کالے بالوں نے
دل گئے نذرِ شوق والوں نے	مجھ کو گھیرا مرے خیالوں نے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

کئی بچھڑے ہوئے ملے ہوں گے	شکوے کچھ ہوں گے، کچھ گلے ہوں گے
آرزوؤں کے گُل کھلے ہوں گے	دامنِ شوق میں صلے ہوں گے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

میکدوں میں چراغ روشن ہیں	نُورِ مَے سے ایاغ روشن ہیں
کہ بہ شب چراغ روشن ہیں	یا مرے دل کے داغ روشن ہیں

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

بیقراری ہے، کیا خبر کیوں ہے؟	آہ و زاری ہے کیا خبر کیوں ہے؟
دل فگاری ہے، کیا خبر کیوں ہے؟	اشکباری ہے، کیا خبر، کیوں ہے؟

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

آہ! اے دردِ نوجوانی، آہ!	آہ! اے موت کی نشانی، آہ

کیا ہوئی دل کی شادمانی، آہ! ہے کدھر مرگِ ناگہانی، آہ!

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

دلِ وحشی کا مُدّعا غم ہے ابتدا غم ہے، انتہا غم ہے

یُوں تو دل پر مرے سدا غم ہے غمِ مرگِ پدر[1] نیا غم ہے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

المدد اے سیلِ گریۂ خوناب سوزِ پنہاں سے ہو چلا ہوں کباب

گلخنِ غم میں ہے دلِ بیتاب کہ تڑپتا ہے صورتِ سیماب

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

عید بھی ہو تو مجھے محرّم ہے میرا سینہ ہے، خنجرِ غم ہے

خوں فشاں کب سے چشمِ پُرنم ہے دشتِ غربت ہے، شامِ ماتم ہے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے!

(سنہ ۱۹۰۶ء)

---

[1] سنہ ۱۹۰۶ء جبکہ محروم اپنے گھر سے دُور لاہور میں زیرِ تعلیم تھا۔

گنگا جی

جوش زن رحمتِ یزداں ہوئی دریا ہو کر | تجلیِ عالمِ اجسام میں گنگا ہو کر
آئی ہے راہروِ عالمِ بالا ہو کر | رہ گئے کچھ ترے قطرات ثریّا ہو کر

عرش اور فرش ہوئے تجھ سے منوّر گنگا
مظہرِ نورِ ازل ہے تو سراسر گنگا!

نورِ سیّال ہے یا جلوۂ رقصاں ہے تو | حیرت افزائے دل و دیدۂ حیراں ہے تو
کس دلآویزی و تیزی سے خراماں ہے تو | مجھ کو حیرت ہے نمایاں ہے کہ پنہاں ہے تو

حسنِ بیتاب! نمائش سے پشیماں کیوں ہے؟
پردۂ رخ ترا جلوہ ہے، گریزاں کیوں ہے؟

کیوں گریزاں ہو؟ کہ دُنیا کو ضرورت ہے تری — ماحیِ ظلمتِ عصیاں ابھی طلعت ہے تری

رُوح کو چین ملے جس سے، وہ صورت ہے تری — دافعِ آفتِ آلام محبت ہے تری

یاد آجاتی ہیں جس دم تری گنگا موجیں

مارتا دل میں ہے، تقدیس کا دریا موجیں!

منزلِ عالمِ اسرار کنارا تیرا — ساحلِ بحرِ حوادث ہے نظارا تیرا

چشمِ جویا کو غنیمت ہے سہارا تیرا — کہ ہے فردوسِ نظر حُسنِ دل آرا تیرا

پاک روحوں سے تری انجمن آباد رہے

نغمۂ اوم سے تیرا چمن آباد رہے!

(۱۹۰۹ء)

ہلالِ عید

دیکھو دیکھو! وہ ہیں نے دیکھ لیا — قلّۂ کوہ سے ذرا اُو نچے
چُھپ گیا! چُھپ گیا! کہیں دیکھو! — پھر نظر آئے گا وہیں دیکھو
وہ جو ہے سامنے شجر، دیکھو! — اُس سے اوپر اُٹھا نظر دیکھو

اے لو! اے لو! وہیں نظر آیا
مژدہ! اے شائقیں نظر آیا!

مرحبا! اے ہلالِ شامِ سعید — لے کے آیا ہے تُو بشارتِ عید
مخبرِ صبحِ عیش و عشرتِ عید — تجھ سے وابستہ ہے سعادتِ عید
مژدۂ عید ایک شب پہلے — لائے گا، جانتے تھے سب پہلے

پہ یہ تھی انتظار کی صورت — کہ نہ دیکھی قرار کی صورت

تھا تری جستجو میں پیاسِ نظر — دشتِ بالا میں گرمِ قطعِ سفر

کہ یکایک کرم کیا تُو نے — اپنا چہرہ دکھا دیا تُو نے

تُو کفیلِ نشاطِ عالم ہے — باعثِ انبساطِ عالم ہے

تُو عجب شے ہے میکشوں کے لئے — کشتیِ مَے ہے میکشوں کے لئے

دُور سے یہ ترا اشارا ہے

اَوج پہ عیش کا ستارا ہے!

واہ! اے شاہدِ کماں ابرو — کس ادا سے تنا ہوا ہے تُو!

خود نمائی بھی ہے، ادا بھی ہے — اس پہ پھر کاہشِ حیا بھی ہے

یہ ترا بانکپن! یہ رعنائی — بزمِ بالا میں خلوت آرائی

ہے سزاوار تجھ کو ناز و غرور — کھینچ بیشک تو اپنے آپ کو دُور

سارا عالم ہے تیرا شیدائی — سب کو دکھا ترا تماشائی

تھی زمانے کو جستجو تیری — محفلوں میں تھی گفتگو تیری

چشمِ بد دُور! کیا نزاکت ہے

تجھ پہ بارِ نظر بھی آفت ہے!

یوں عیاں ہے شفق کے دامن میں — جیسے مہ رُو ہو کوئی گلشن میں

یا کوئی جیسے خنجرِ نازک — زینتِ دستِ دلبرِ نازک

خونِ عاشق سے سُرخ زُدہ ہو کر
نازکرتا ہوا اپنی تپرِش پر
یا کوئی جیسے نقرئی کشتی
قُلزمِ سُرخ پہ ہو تیر رہی
اِک جہاں اُس کا ہو تماشائی
کرتی جائے وہ بحر پیمائی
رفتہ رفتہ نظر سے غائب ہو
تکتے رہ جائیں لوگ سب اُس کو

اے لو! سچ مچ وہ صورتِ زورق
ہو گیا گُم میانِ شام و شفق!

(۱۹۰۶ء)

ماہِ تاباںؔ

چرخ پر کس کا چراغِ انجمن روشن ہوا　　نُور سے جس کے مرا بیت الحزن روشن ہوا

چاندنی گلگشت کو اُتری، چمن روشن ہوا　　آشیانِ عندلیبِ نغمہ زن روشن ہوا

مرحبا اے ماہِ تاباں، حبّذا اے چاندنی

دیر باش اے ماہِ تاباں، خوش بیا اے چاندنی!

او مہِ تاباں! ترا کب سے تماشائی ہوں میں　　تیرے جلووں سے جنوں بڑھتا ہے سودائی ہوں میں

سربسر وارفتۂ شانِ دل آرائی ہوں میں　　حُسنِ دلکش کی قسم! تیرا تمنّائی ہوں میں

شاہدِ اوجِ فلک! ہاں مُسکرائے جا یوں ہی

اور مجھ کو پیکرِ حیرت بنائے جا یوں ہی!

تھا کبھی، تو ایک جادُو کا کھلونا ہائے ہائے　　وہ نظر آنا ترا، حاصل نہ ہونا ہائے ہائے

رات کو پہروں مچلنا۔ اور نہ سونا ہائے ہائے　　　نیند کی وادی ہیں آخر تجھ کو کھونا ہائے ہائے

وہ ہجومِ ذوقِ پنہانی دلِ بے تاب میں

تیرے پیچھے اُڑ کے جانا آسماں پر خواب میں!

تجھ کو خالق نے بنا کر آہ! پُتلا نُور کا　　　نُور کی پوشش عطا کی، اور سراپا نُور کا

دے دیا تاروں کا جُھومر، یعنی گہنا نُور کا　　　اور نُورانی گلے کا زیب، ہالا نُور کا

موہنی مورت نے پایا کیا مزاجِ نرم ہے

اے حسینانِ تکبّر خُو! مقامِ شرم ہے!

دیکھتا ہے کس نظر سے آہ ہیئت داں تجھے　　　ہے بتا دیتا وہ ظالم خطّۂ ویراں تجھے

کیوں بنائے اک معلّق گول کوہستاں تجھے　　　اس کے کہنے سے مگر کیا اے مہِ تاباں تجھے

اس کی باتوں سے تری رونق بھلا کیونکر ہو ماند

یہ مثل ہے "خاک ڈالے سے کہاں چھپتا ہے چاند"

تجھ کو یہ الزام بھی ملتا ہے اے دشمن عذار　　　روشنی مانگی ہوئی ہے، حُسن تیرا مُستعار

اُن کے طعنوں سے نہ کر تُو اپنے دل کو داغدار　　　ہاں اسی قانون پر ہے سارے عالم کا مدار

وہ بھی لیتا ہے کسی سے، جس سے تو لیتا ہے نُور

اور ہے وہ نُور والا، سب کو جو دیتا ہے نُور!

چاند سورج جس کے لاکھوں ہیں ستارے بے حساب　　　کتنے ساکن ان میں ہیں، کتنے ہیں سرگرمِ شتاب

ہے ضیا جن کی انوکھی، حُسن جن کا لاجواب　　　تیری صورت کے بھی ہیں ان میں کئی اے ماہتاب

نور کا مخزن ہے اک، سب کو دیئے جاتا ہے نُور
وہ سراپا نُور ہے، دُنیا میں پھیلاتا ہے نُور!

آہ! پھر اس خاکدانِ تیرہ میں ظلمت ہے کیوں؟
سایۂ عصیاں سے کالی رات کی صورت ہے کیوں؟

بحرِ ہستی میں بپا طوفانِ پُر آفت ہے کیوں؟
کیوں جہازِ عمر چکراتا ہے؟ یہ ہیبت ہے کیوں؟

کیوں یہ ہیبت ناک چیخیں ہیں؟ یہ کیسا شور ہے؟
بڑھتا جاتا کیوں مصیبت کی گھٹا کا زور ہے؟

تُو کدھر ہے آہ! اے حُسنِ ازل کے آفتاب
تا کجا اوڑھے رہے گا مُنہ پہ دامانِ سحاب؟

خانۂ دل ہو نہ جائے اس اندھیرے میں خراب
ڈال دے کوئی شعاعِ شفقت آلودہ شتاب؟

تیرے جلوے کاش! ہو جائیں قریبِ چشمِ دل
خوابِ غفلت ہو نہ پھر ہرگز نصیبِ چشمِ دل!

(مئی سنہ ۱۹۱۲ء)

وقتِ سحر

ستاروں کا گلزار وقفِ خزاں ہے
بہارِ سحر سے جہاں شادماں ہے
شفق سے فلک تختۂ ارغواں ہے
زمیں رو کشِ ساحتِ گلستاں ہے

مسرّت سے لبریز سارا جہاں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

نسیمِ سحر دل کُشا، رُوح پرور
شمیمِ گُلِ تر سے عالم مُعطّر
پرندوں کے جاں بخش نغمے ہوا پر
وہ تانیں کہ ہر آن جن سے برابر

سرورِ مئے شادمانی عیاں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

پیامِ مسرّت صبا لے کے آئی
ہنسے پھُول، ہر اک کلی مُسکرائی
شگوفے ہوئے مائلِ لب کُشائی
طیورِ چمن محوِ رنگیں نوائی

ہجومِ طرب باغ کے درمیاں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

وہ سوتا ہے شب بھر جو بیمار جاگا　　وگرنہ نہیں کون جاں دار جاگا
عبادت کو مردِ نکوکار جاگا　　خرابات میں رندِ مے خوار جاگا

اُٹھا طفلِ کم سِن تبسّم کناں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

اذاں اور ناقوس نے غُل مچایا　　کہ اے غافلو! وقت اُٹھنے کا آیا
مبارک ہیں بیشک وہ انساں خدایا　　ترے سامنے سر جنھوں نے جھکایا

یہی وقتِ خرّم سعادت نشاں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

شہنشاہِ خاور کا پاکر اشارا　　ہوئی ہے وہ پہلی کرن جلوہ آرا
سرِ تاجِ زرّیں ہوا آشکارا　　وہ ظاہر ہوا روئے خورشید سارا

زمیں تابِ شبنم سے گوہر فشاں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

چمکتا ہے سورج، دمکتی ہے دُنیا　　لپکتی ہیں موجیں، جھمکتے ہیں دریا
چٹکتی ہیں کلیاں، لہکتا ہے سبزہ　　مہکتا ہے گلزارِ عالم سراپا

چہکتی اُڑی بُلبلِ نغمہ خواں ہے
سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

وہ ہل چل مچی شہر و دشت و جبل میں　　تموّج سا پیدا ہوا جل میں، اتھل میں

نئی تازگی آگئی پھول پھل میں　　　چمک اُٹھے شبنم کے قطرے کنول میں

رگِ دہر میں خونِ فرحت رواں ہے

سُہانا سہانا سحر کا سماں ہے!

سنہری ہوئی کوہساروں کی رنگت　　　روپہلی ہوئی آبشاروں کی رنگت

غضب ڈھا گئی لالہ زاروں کی رنگت　　　ہے اک رنگ میں سو بہاروں کی رنگت

زمینِ چمن عکسِ باغِ جناں ہے

سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

اُٹھا ذوقِ نظّارہ میں مُنہ اندھیرے　　　نظر آئے نورِ سحر کے پھُریرے

لکھی نظمِ دل کش سویرے سویرے　　　ہوئے پیکرِ نُور اشعار میرے

خصوصاً یہ مصرعہ کہ وردِ زباں ہے

سُہانا سُہانا سحر کا سماں ہے!

بندرابن کی ایک صبح

آثار عیاں ہوئے سحر کے ساماں ہونے لگے سفر کے
ہل چل میں ہے کاروانِ انجم مغرب کو چلا نشانِ انجم
وہ شب کا سیاہ شامیانہ اب لے کے قمر ہوا روانہ
تارے سب ایک ایک کر کے آگے پیچھے چلے قمر کے

مشرق میں ہے نور ہلکا ہلکا
طلعت کا ظہور ہلکا ہلکا!

صبحِ خنداں عروسِ تازہ آئی مل کر شفق کا غازہ
آئی اور کس ادا سے آئی شانوں پر کاکلیں طلائی
چہرہ اُس کا وہ، یعنی خورشید بے پردہ، عدوِّ حسرتِ دید
ہر چیز کو پرتوِ سحر سے قدرت نے رنگا ہے رنگِ زر سے

جمنا ابھی خواب سے اُٹھی ہے
پیدا اُبشرے سے تازگی ہے

کرنیں جمنا سے کھیلتی ہیں ظلمت کو پرے دھکیلتی ہیں
ہے محوِ خرامِ ناز جمنا عشّاق کی دل نواز جمنا
ساحل پر دوب، دوب پر اوس مخمل تو ہے دوب اور گہر اوس
جمنا کا لباس مخملی ہے اور موتیوں سے لدی ہوئی ہے

جنگل کے وہ پھول آہ! خودرو
بھینی بھینی وہ اُن کی خوشبو!

دھیمے دھیمے صبا کے جھونکے اندازِ خرام وہ گلوں کے
طائر ہر سمت نغمہ زن ہیں یہ مطربِ محفلِ چمن ہیں
ہر چند ہے دل پذیر جمنا! کب دل کو مگر یہاں ہے تھمنا
جمنا سے نہیں ہے کام ہم کو ہے ذوقِ لقائے شام ہم کو

مِل جائے ہمیں کہیں کنھیّا
آرامِ دلِ حزیں کنھیّا!

(۱۹۱۴ء)

بانسری کی کوک

لعلِ معجز نما سے بنسی | اے لو! وہ شام نے لگادی
پیدا ہوا اک نفس سے اعجاز | اب اس سے زیادہ کونسا ساز؟
ہر ایک ترانہ دل رُبا ہے | جنگل نغموں سے گونج اُٹھا ہے
عالم طاری ہے بیخودی کا | نغمہ ساری ہے بانسری کا
طائرِ اشجار پر ہیں خاموش | محوِ لذّاتِ جنّتِ گوش
مُرغِ تصویر ہر پرندہ | پا در زنجیر ہر چرندہ
سکتے میں کھڑے ہوئے ہیں آہو | گویا کوئی کر گیا ہے جادُو
دُم ناچنے کو ہوئی پھنُو رہے | پر اپنے سے مور بے خبر ہے
اِک جذبۂ بے خودی میں آکے | لہراتے ہیں سانپ پھن اُٹھا کے
مسحور ہر ایک جانور ہے | چیتا یا شیر یا مگر ہے
جنگل کی ہر ایک بھینس اور گائے | سکتے میں کھڑی ہے کان پھیلائے

جب وحشیوں کا ہوا ہے یہ طَور
حالت انساں کی کیوں نہ ہو اَور!

قــریہ سارا گوالیوں کا | ہے محوِ سکوت اب کچھ ایسا
گویا آباد ہی نہیں ہے | خالی انساں سے یہ زمیں ہے
بے کار ہیں، جو ابھی تھے مشغول | کس شغل میں تھے؟ یہ سب گئے بھول
کھیتوں میں جو ہل چلا رہے تھے | اور ساتھ ہی گنگنا رہے تھے
چُپ چاپ وہ اب کھڑے ہوئے ہیں | گویا کہ وہیں گڑے ہوئے ہیں
بچّے گلیوں میں گھر کے اندر | ہیں ناچتے بانسری کی لَے پر
سب عورتیں، مائیں، بیویاں سب | خاموش ہیں، تھیں جہاں جہاں سب
ڈالا ہے وہ زیر و بم نے پھندا | چھوڑے بیٹھی ہیں گھر کا دھندا!
جوبن جن پر شباب کا ہے | یہ نغمہ اُنھیں تو فتنہ زا ہے
دل کو ہے یہ بے قرار کرتا | آنکھوں کو ہے اشکبار کرتا
رہ رہ کے ہے دل میں درد اٹھاتا | دل کو ہاتھوں سے ہے اُڑاتا
تھامے ہوئے ہیں جگر کو دل کو | سُنتی ہیں نوائے متّصل کو
جو واقفِ رازِ معرفت ہیں | شنوندۂ سازِ معرفت ہیں

یہ بنسی اُنھیں بھی ہے رُلاتی
پیغام ہے دوست کا سُناتی!

(سنہ ۱۹۱۴ء)

صبح کے ستارے

صورتِ رہروِ سحر تیار　　میہماں کوئی دم کی ہے شبِ تار
سُوئے مشرق ہے جلوۂ انوار　　کہ نمایاں ہیں صبح کے آثار

اوس تاروں پہ پڑنے والی ہے
اب یہ محفل اجڑنے والی ہے!

نُور کے بحر میں ہے طغیانی　　ہوئے تارے غریقِ حیرانی
اب کہاں رونقِ درخشانی　　آہ! سر سے گزر گیا پانی

تابِ طوفانِ نُور لا نہ سکے
رہ نکل بھاگنے کی لا نہ سکے!

اِس طـرح آتے ہیں نظر بے نُور | جیسے دُھندلا کوئی چراغ ہو دُور
یا کوئی جیسے خوشۂ انگور | سُوکھ کر تاک سے گرے مجبُور

یا ہوں جیسے فسردہ اور ملُول
آخرِ موسمِ بہار کے پھُول!

جس طرح یا طفیلِ سوز و گداز | کہ ہے دستورِ طالعِ ناساز
اشکِ بیمار سال ہائے دراز | کھو چکے آب و تاب کے انداز

نظر آتے ہیں یُونہی بے رونق
مُنہ ہے شمعِ سحر کی صورت فق!

ماہ دل گیر، اُداس تارے ہیں | چشمکیں ہیں نہ وہ اشارے ہیں
گویا بجھنے کو یہ شرارے ہیں | پھر بھی دلکش ہیں پیارے پیارے ہیں

اُترے چہرے ہیں مہ جبینوں کے
سُرخ پژمُردہ ہیں حسینوں کے!

نمودِ شام

رنگِ عشرت کا اہتمام ہوا — دامنِ چرخ لالہ فام ہوا

دورِ خورشید کا تمام ہوا — وقتِ بزمِ سکوتِ شام ہوا

سایۂ کوہِ سرفراز بڑھا

صورتِ گیسوئے دراز بڑھا!

آخری شور ہے سرِ اشجار — سخت گھبرائے پھرتے ہیں پڈار

اب کہاں نغمۂ مسرت بار — بدحواسی کے ان میں ہیں آثار

جس طرح کوئی کاروانِ عظیم

کوچ کرنے لگے بحالتِ بیم!

وقت ہے اپنے گھر کو جانے کا | دل نے پوچھا پتہ ٹھکانے کا
ہوش پینے کا ہے نہ کھانے کا | لے اُڑا شوق آشیانے کا

باغ اِک محفلِ خموش ہوا
دور ہنگامۂ خروش ہوا!

یوں ہیں اِستادہ سرو اور چنار | جس طرح منتظر ہوں پہریدار
دِھیما دِھیما ترنّمِ انہار | ہلکا ہلکا سا بج رہا ہے ستار

ایک گوشے میں لالۂ دل سوز
یک بیک ہو گیا چراغ افروز!

آفت آئی مریضِ ہجراں پر | حسرت افزا ہے شام کا منظر!
ہنستے روتے گیا ہے دن تو گزر | رہِ ظلمات ہو گی طے کیوں کر؟

رات بھر بیقراریاں ہوں گی
اور اختر شماریاں ہوں گی!

شامِ سرما

فصلِ سرما کا مختصر سا دن — خاتمے کے قریب آیا دن
دُھوپ سے تھا مسرّت افزا دن — اب ہے افسردگی سراپا دن

جس کو کہتے تھے مہرِ عالمتاب
شامِ سرما میں ہو گیا کمتاب!

شبِ سرما کے خوف سے لرزاں — نظر آتی ہے ہر کرن بے جاں
کہ مسافر ہے کوئی بے ساماں — گرم رَو ہے یہ نیّرِ تاباں

دامنِ کوہسار پر ہے نظر
مامنِ سازگار پر ہے نظر!

پہنچے منزل پہ راہرو کب کے　　گھونسلوں میں طیور جا دبکے
کہیں ساماں ہیں راحتِ شب کے　　کہیں شکوے ہیں نحسِ کوکب کے

بےکسی اور آہ! لمبی رات
بن کے آئی ہے پیکرِ آفات!

دشت و صحرا و کوہسار خموش　　موجِ دریا و رود بار خموش
باغ میں مرغِ نغمہ بار خموش　　شہر میں اہلِ کاروبار خموش

چل رہی ہے ہوا مگر چُپ چاپ
کانپتی ہے فضا مگر چُپ چاپ!

تکیئے خالی ہوئے فقیروں کے　　ہوئے رخصت مُرید پیروں کے
گھر ہیں عشرت کدے امیروں کے　　رہزنِ ہوش راہگیروں کے

ہیں غریبوں کے آہ! کاشانے
بےچراغ اور فسردہ غم خانے!

شفقِ شام

جوشِ گُل دامنِ فلک پر ہے
اُڑ رہی یا شرابِ احمر ہے
واہ کیا دل فریب منظر ہے
شفقِ شام جلوہ گستر ہے

یا اُڑاتا ہے چرخِ شعبدہ کار
باغ ہائے زمیں سے رنگِ بہار!

یہ نمائش ہے لالہ زاروں کی
یا کہ بستی ہے شعلہ کاروں کی
بزم ہے کوئی گُل عذاروں کی
انجمن یا ہے نو بہاروں کی

کسی قاتل کا ہے یہ دامنِ سُرخ؟
کسی بسمل کا یا ہے مدفنِ سُرخ؟

دیدنی ہے یہ منظرِ رنگیں　　دل ربائی میں دلبرِ رنگیں
شاہدِ شام پیکرِ رنگیں　　زیرِ داماں چھپا دہرِ رنگیں

دشمنِ ہوش ہے یہ رنگینی
گو نہیں رنگِ مے یہ رنگینی!

قدسیوں نے رچائی ہے ہولی　　رنگ اُڑتا ہے، آئی ہے ہولی
آسماں نے مچائی ہے ہولی　　واہ! کیا رنگ لائی ہے ہولی

یہ سحر اور یہ قبائے رنگ آلود
مسخرا بن گیا ہے چرخِ کبود!

آتشِ گُل ہو لاکھ جلوہ فگن　　یہ بھڑک کب دکھا سکے گُلشن
نظر آتا ہے جلوۂ گلخن　　لمبی چوڑی ہے اک چِتا روشن

صورتِ پدمنی کوئی اُس پر
شانِ جوہر دکھاتی ہے جل کر!

فصلِ خزاں

گرمی کا ہوا جو سرد بازار
ایّامِ خزاں ہوئے نمودار
اشجار کھڑے ہیں مثلِ بیمار
ہر برگِ شجر ہے زرد رُخسار

تھی دھوپ جو گرمیوں میں کھائی
تاثیر ہے اُس نے اب دکھائی!

گُل ہے نہ کہیں، کوئی ثمر ہے
بے رونقی برگ و شاخ پر ہے
آلودۂ خاک ہر شجر ہے
رنگِ چمنِ جہاں دگر ہے

حسرت کی ہے چھا رہی گھٹا سی
ہر سُو ہے برس رہی اُداسی!

بے لطف نوائے طائراں ہے　　　وہ جوششِ نغمہ اب کہاں ہے
جو نَے ہے وہ صورتِ فغاں ہے　　　اظہارِ شکایتِ خزاں ہے
اب گرم نہیں لہو جگر میں
آمادسرما کی ہے نظر میں!

بادل کی کہیں کہیں یہ جالی　　　ہے مثلِ غبارِ مینہ سے خالی
ہر برگ ہو گو کفِ سوالی　　　ہرگز یہ نہیں برسنے والی
غمگیں اسے دیکھ کر ہے دل اور
برسات کا یاد آگیا دَور!

چڑھ چڑھ کے اُتر گئے ہیں دریا　　　خالی ساحل ہے حسرت افزا
سُوکھا سرِ کوہسار سبزہ　　　گرد اُڑتی ہے درمیانِ صحرا
فطرت کے فسردہ ہیں مناظر
کیوں کر ہو شگفتہ طبعِ شاعر!

رخصتِ سرما

ہیں نکلتی سردیوں کے وہ نظر فریب منظر
کبھی جاتی ہے نظر میں، کہ ہے تازگی پہ نیچر
کہ پلٹتا مہرِ تاباں کبھی سوئے شمال آیا
یہ بدل رہا ہے موسم، کہ پلٹ رہی ہے کایا

نظر آگیا، کہ سرما کا شباب ڈھل چکا ہے
جو تھما ہوا تھا پانی وہ سرک کے بہ چلا ہے
نظر آتی ورنہ برفِ سرِ کوہ کیوں پگھلتی
جو ندی جمی ہوئی تھی وہ ذرا ذرا ہی چلتی

نہ صبا میں ہے وہ خنکی، نہ نسیم میں ہے ٹھنڈک
نہ وہ کڑکڑاتا جاڑا، نہ وہ سردیاں ہیں بیشک
کہ دل و جگر کو لگتی ہے یہ خوش گوار ایسی
یہ بسنت کی ہوا ہے، یہ ہے رُت بہار ایسی

نہ چمن کے رہنے والوں کی وہ زرد زردیاں ہیں — کہ اُتر رہا ہے تن سے، جو لباس تھا خزانی
نہ بدن کی لاغری ہے نہ وہ رُخ کی زردیاں ہیں — کہ ہر اک شجر کا جوڑا نظر آ رہا ہے دھانی:

کہیں پھولتی ہے سرسوں کہیں پھوٹتا ہے سبزہ — نئی کونپلیں نکلتی ہیں کہیں کسی شجر سے
"وہ کب آئے گا چمن میں مجھے جس کی ہے تمنا" — کہیں کر رہی ہے بلبل یہ سوال برگِ تر سے

گُل و غنچہ سے بھرے گا وہ چمن کے جیب و داماں — اسی دیکھ بھال میں ہے ابھی باغبانِ قدرت
پسِ پردہ ہو رہے ہیں جو بہار کے یہ ساماں — دل و دیں کو لوٹ لے گا وہ دکھا کے شانِ قدرت

نکل آئے فصلِ گُل کے وہ طیور گھونسلوں سے — کوئی دن میں گونج اُٹھیں گے بہار کے ترانے
چلی آئیں گی مسرت کی عنادلیں جنگلوں سے — کوئی شادیوں میں گاتا ہو خوشی کے جیسے گانے

مگر آہ جس چمن کا میں ہوں عندلیبِ نالاں[1] — ہوئیں مدتیں کہ اُس میں نہ کبھی بہار آئی
جو گری فلک سے شبنم، رہی تا سحر وہ گریاں — جو صبا کہیں سے آئی تو لئے غبار آئی

(۱۲-۹-۶ء)

---

[1] دَورِ غلامی کا رونا ہے!

نوائے بہار

خوشا بہار و خوشا فصلِ دلکشائے بہار
خوشا مناظرِ جاں بخش و جانفزائے بہار

نہ زندہ کیوں ہو دلِ کُشتۂ ادائے بہار
دمِ مسیح ہوئی جُنبشِ ہوائے بہار

بہائے اشکِ مسرت نہ کیوں جب آئے بہار
ہے چشمِ حُسنِ نگر عاشقِ ادائے بہار

ہر ایک گُل شررِ طُور ہے بجلوہ گری
کہاں ہے آہ! مجھے تابِ جلوہ ہائے بہار

اُترنے قافلہ در قافلہ لگے ہیں پھُول
زمیں تمام ہوئی کارواں سرائے بہار

ہجومِ گُل سے زمیں پر جگہ نہیں باقی
شفق کے پھُول فلک پر نہ کیوں کھلائے بہار

ظہورِ صبح ہے نُورِ رُخِ عروسِ چمن
سوادِ شام ہے گیسوئے مُشکسائے بہار

یہ گہنے پھُولوں کے، اور یہ زمردیں پوشاک
ہے برقِ خرمنِ دل حُسنِ فتنہ زائے بہار

چمن پہ، دشت پہ صحرا پہ، ایک جوبن ہے
ہر اک فضا میں ہے نیرنگیِ فضائے بہار

اُڑا رہے ہیں چمن میں بہار کے جلسے
طیورِ زمزمہ پرواز و خوشنوائے بہار

ترانہ ریز ہے محرومِ موسمِ گُل ہیں
کہ مثلِ بلبلِ گلشن ہے آشنائے بہار!

نسیمِ بہار

آسائشِ جگر ہے نسیمِ بہار! تُو — دلکش ہے، دلفریب ہے، اور خوشگوار تُو
عیسیٰ نفس ہے دہر میں اے تازہ کار تُو — ہے باعثِ شگفتگیِ روزگار تُو

جاں تیرے دم سے تازہ ہے دل باغ باغ ہے
اور بُوئے خوش سے تیری معطّر دماغ ہے!

تجھ سا ہے کون محرمِ خلوت سرائے گُل — کرتی ہے چپکے چپکے تُو جذبِ ادائے گُل
جاں بخش تجھ کو ہے نفسِ عطر سائے گُل — لاتی چُرا چُرا کے ہے بُوئے قبائے گُل

تاثیرِ فیضِ صحبتِ گُل اے نسیم ہے
نکہت ندیم ہے تری، ہمدم شمیم ہے!

خوشبو سمیٹ صحنِ چمن سے جو تُو گئی — بیخود اُسے بنا ہی گئی جس کو چھو گئی
جب تُو کسی قفس کے کبھی رُوبرو گئی — بُلبل تڑپ تڑپ گئی بے تاب ہو گئی

تیرے نفس سے آئی جو بُوئے قبائے گُل
بُلبُل غریب چیخ اُٹھی "ہائے ہائے گُل"!

تاروں کی چھاؤں میں جو تو آتی ہے باغ میں ٹھنڈک سی ڈال دیتی ہے لالے کے داغ میں
خوبانِ صحنِ باغ کی بزمِ فراغ میں بھرتی مئے نشاط ہے گُل کے ایاغ میں

جھونکے ترے ہیں ساقیِ سرشار، اے نسیم
مستانہ جھوم جاتے ہیں اشجار، اے نسیم!

گاتے ہیں طائرانِ چمن تیرے ساز پر رقصاں ہے سبزہ چمن کی نواہائے راز پر
اور گوشِ گُل ہے وا ترے رازِ و نیاز پر نرگس کی چشمکیں ہیں ادا ہائے ناز پر

آ کر طلسمِ خوابِ چمن توڑتی ہے تُو
مُہرِ سکوتِ صبر شکن توڑتی ہے تُو!

نکلی چمن سے سُنبل و ریحاں کو چھیڑتی بالائے بام کاکُلِ خُوباں کو چھیڑتی
بن میں چراغِ گورِ غریباں کو چھیڑتی عاشق کے شعلۂ دلِ سوزاں کو چھیڑتی

رم کر کے دم زدن میں کہیں سے کہیں گئی
بحر و جبل کو پھاندتی گردِ زمیں گئی!

جب پرتوِ سحر سے ہو روشن طبق طبق اور رنگِ گُل سے صحنِ گلستاں شفق شفق
دفتر ہو عیش کا گُلِ تر کا ورق ورق ہو بے حجابیوں سے تری گُل عرق عرق

تُو کُشتگانِ ہجر کو چھیڑے نہ اے نسیم
زخمِ کہن کے بخیئے اُدھیڑے نہ اے نسیم!

فصلِ بہار

مژدہ اے دیدۂ تماشائی　　حُسنِ فطرت ہے وقفِ برنائی
صحنِ گلشن میں پھر نظر آئی　　غنچہ و گُل کی محفل آرائی

پیکرِ ناز بُوٹا بُوٹا ہے
حُسن کیا کیا زمیں سے پھُوٹا ہے!

نہیں نرگس پہ خواب کی مستی　　بلکہ ہے یہ شباب کی مستی
واہ بُوئے گلاب کی مستی　　"ہے ہوا میں شراب کی مستی"

ذوقِ مستی کے اے تمنّائی
"بادہ نوشی ہے بادپیمائی"!

خندۂ صبح ہے بہار آمیز　　جلوۂ شام ہے نشاط انگیز
شب کو مہتاب ہے تبسّم ریز　　جس سے بحرِ جنوں ہو طوفاں خیز

اُف! یہ لیل و نہار کا عالم
اور اُس پر بہار کا عالم!

جوشِ گُل سے جہاں ہو رنگیں　　　دامنِ چرخ جا بجا رنگیں
دشت و صحرا کی ہے فضا رنگیں　　　نغمۂ مرغِ خوش نوا رنگیں

ہیں یہ رنگِ بہار کے جلوے
صنعتِ کردگار کے جلوے!

یہ دمِ صبح عطر بار نسیم　　　نفسِ شاہدِ بہار نسیم
سحر پرور، فسوں شعار نسیم　　　گُل و بُلبل کی راز دار نسیم

اِس سے ٹھنڈا جگر کسی کا ہے
اور دل آگ پر کسی کا ہے!

حُسن اسی فصل میں نکھرتا ہے　　　عشق اسی دور میں اُبھرتا ہے
صورتِ گُل کوئی سنورتا ہے　　　پیرہن کوئی چاک کرتا ہے

کر ہی دیتی ہے آہ! بُوئے بہار
آرزو ہائے خفتہ کو بیدار!

آمدِ گُل کا ہم کو کیا احساس　　　دل ہی پہلو میں کب ہے کُشتۂ یاس
یہ جو نالے ہیں زینتِ قرطاس　　　ہے فقط اپنی شاعری کا پاس

ورنہ ہم کو خزاں بہار ہے ایک
برگِ گُل اور نوکِ خار ہے ایک!

تصویرِ بہار

دامنِ کوہسار سے ساحلِ رودبار تک
ساحلِ رودبار سے دامنِ کوہسار تک

مسندِ شاہِ بہار تختۂ سبزہ زار ہے
شبنم تر سے کشت زار تختِ گہر نگار ہے
مظہرِ جلوۂ طرب ساحتِ روزگار ہے
رُوح نواز کس قدر نغمۂ آبشار ہے
منظرِ صافِ سطحِ آب آئینۂ بہار ہے
دشت میں الغرض عیاں قدرتِ کردگار ہے

دامنِ کوہسار سے ساحلِ رودبار تک
ساحلِ رودبار سے دامنِ کوہسار تک

شاخ بہ شاخ سُو بہ سُو — نغمہ سرا طیُور ہیں

گرم ہے محفلِ نشاط — بادہ کشِ سرور ہیں

جُھومتے ہیں شجر تمام — مست نشے میں چُور ہیں

رقصِ شعاعِ مہر کے — جلوے قریب و دُور ہیں

ذرّے تمام خاک کے — رُوکشِ کوہِ طُور ہیں

قدرتِ صانعِ ازل — سب یہ ترے ظہُور ہیں

دامنِ کوہسار سے — ساحلِ رود بار تک

ساحلِ رود بار سے — دامنِ کوہسار تک!

ابرِ بہار

ابرِ نیساں ہے سحابِ فیض کہلاتا ہے تُو
مستِ صہبائے کرم ہے، جھومتا آتا ہے تُو

خوشنما دوشِ ہوا پر ہے ترا تختِ رواں
اُس کی کیا توصیف ہو جس شان سے آتا ہے تُو

جب زمینِ خشک پھیلاتی ہے دامانِ سوال
رحمتِ باری کے موتی اس پہ برساتا ہے تُو

ہوتی ہیں جب وقفِ عریانی عروسانِ چمن
خوب صورت سبز جوڑے اُن کو پہناتا ہے تُو

بے بسی میں اُٹھتے ہیں شاخوں کے جب دستِ دُعا
دستگیرِ اُن بیکسوں کا بن کے آجاتا ہے تُو

کر ہی دیتا ہے تجھے دردِ اخوت اشکبار
ساحلِ دریا کو جب تفسیدہ لب پاتا ہے تُو

تازگی پاتے ہیں تیرے نام سے اہلِ زمیں
آسمانوں سے پیامِ زندگی لاتا ہے تُو

رونقِ گلزارِ ہستی کو بڑھانے کے لئے
باغ میں پھولوں کے میلے آکے لگواتا ہے تُو

گُل بداماں ایک چھینٹے سے ہوئے دشت و جبل
آسماں سے حُسن برساتا ہوا آتا ہے تُو

آہ! مشتاقِ ترنم کس قدر ہے یہ ترا
سبزۂ خوابیدہ چونک اُٹھتا ہے جب گاتا ہے تُو

جلوۂ رخسارِ گُل کو آتشیں کرتا ہوا
آتشِ اُلفت دلِ بلبل میں بھڑکاتا ہے تُو

عارضِ خوباں میں رنگِ روئے گُل بھرتا ہوا
مثلِ بلبل عاشقوں کے دل کو تڑپاتا ہے تُو

یاد آجاتے ہیں وہ دن جو نہ آئیں گے کبھی
نالہ کش سحر دم ہو جاتا ہے جب آتا ہے تُو!

بادِ بہاری چلی

گُلشنِ آفاق میں پھُول کھلاتی ہوئی
ناچتی گاتی ہوئی
جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی ہوئی
عطر اُڑاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

سبزہ و گُلزار کو کرتی ہوئی شادکام
بھرتی مسرّت کے جام
دہر کو دیتی ہوئی دورِ طرب کا پیام
ہنستی ہنساتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

غنچے جو لب بستہ تھے اُن کو ہنساتی ہوئی

پھول کھلاتی ہوئی؛
سبزہ جو خوابیدہ تھا   اُس کو جگاتی ہوئی
شور مچاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

دورِ زمستاں میں تھے   ولولے چمن کے خموش
اب ہیں وہ محوِ خروش؛
زمزمہ پیرائی کا   بھرتی ہوئی ان میں جوش
وجد میں لاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

صحنِ چمن سے چلی   چھیڑتی اشجار کو
برگ و گُل و خار کو؛
وصل کے ایّام کا   بُلبلِ بیمار کو
مژدہ سُناتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

رنگ بدلتی ہوئی حُسنِ فسوں یار کے
عشوۂ دلدار کے!
ڈھنگ بدلتی ہوئی عشقِ جنوں کار کے
جوش بڑھاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

اگلی بہاروں کے دن یاد دلاتی ہوئی
صبر اُڑاتی ہوئی!
پھر دلِ افسردہ میں آگ لگاتی ہوئی
درد اُٹھاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

خاطرِ محزوں کو دیتی ہوئی اضطراب
کشمکش و پیچ و تاب!
صبر کو آرام کو کرتی ہوئی وقفِ خواب
فتنے اُٹھاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

ترانۂ بسنت

نمبر ۱

سردی گئی بسنت کے ایام آگئے
طائر نوائے فصلِ بہاراں سُنا گئے

ظاہر ہوئے وہ پیش روانِ جلوسِ گُل
سرسوں کے زرد پھول نگاہوں کو بھا گئے

چشمے سرک کے دامنِ کہسار سے چلے
مشقِ خرامِ ناز کے پھر دن وہ آگئے

کیفیّتیں کچھ اور ہیں لیل و نہار کی
جن میں فسردگی تھی وہ صبح و مسا گئے

صحنِ چمن میں سبزۂ خوابیدہ جاگ اُٹھا
انوارِ صبح موسمِ دل کش جگا گئے

اشجار جی اُٹھے ہیں، کہ جھونکے نسیم کے
اعجازِ عیسوی کے کرشمے دکھا گئے

سرما کے جَور سے جو تھے منقار زیرِ پر
اب اُن کے نغمے تا سرِ فوق السّما گئے

عالم نہ پُوچھ چاندنی راتوں کے لطف کا
یہ جلوے بجلیاں دل و دیں پر گرا گئے

کیا ہے کلّور کوٹ[1] میں محرومِ لطفِ زیست
صحرا میں دن بہار کے کیا آئے کیا گئے!

---

[1] ضلع میانوالی (مغربی پنجاب) کا ایک قصبہ، جہاں مصنف آٹھ نو سال مقیم رہا۔

ترانۂ بسنت

نمبر ۲

پھر گلشنِ عالم میں
پیغامِ بسنت آیا!

پھر گونجتے ہیں نغمے — مسرور فضاؤں میں
اک کیف کا عالم ہے — صحرا کی ہواؤں میں
رعنائیِ دل کش ہے — پھولوں کی اداؤں میں
بیتابیٔ الفت ہے — بلبل کی نواؤں میں

بلبل کی نواؤں نے
ہر ذرّے کو تڑپایا!

•

رخصت ہوئی دنیا سے
افسردگیِ سرما!

پھر تازگی و تیزی — سورج کی چمک میں ہے

اِک شانِ دل آویزی شبنم کی دمک میں ہے
پھر ولولہ انگیزی پھولوں کی مہک میں ہے
اندازِ جنوں خیزی بلبل کی چہک میں ہے
پھر گلشنِ عالم میں
ہنگامہ ہوا برپا!

•

ہنگامہ ہوا برپا
فطرت میں مچی ہل چل
یخ بستہ جو دریا تھے پھر ہو گئے وہ جاری
پھر سبزۂ خوابیدہ ہے مائل بیداری
پھولی ہوئی سرسوں سے کھیتوں میں ہے زرکاری
شبنم کی گہر پاشی سورج کی ضیا باری
ہر شاخِ چمن رقصاں
ہر برگِ شجر بے کل!

پھر بسنت آیا

صبا نے مژدہ سنایا کہ پھر بسنت آیا
گلوں نے جلوہ دکھایا کہ پھر بسنت آیا

کلی کلی نے چٹک کر "خوش آمدید" کہا
یہ کس نے اُن کو بتایا کہ پھر بسنت آیا

طیورِ زمزمہ پرداز نے برنگِ دگر
چمن میں جشن منایا کہ پھر بسنت آیا

نکھرتا جاتا ہے پھر حسنِ شاہدِ فطرت
پلٹتی جاتی ہے کایا کہ پھر بسنت آیا

چمن کو وادی و صحرا کو دستِ قدرت نے
یہ ذوق و شوق سجایا کہ پھر بسنت آیا

سحابِ فیض نے سبزے کی نرم اطلس کا
زمیں پہ فرش بچھایا کہ پھر بسنت آیا

پلٹ کے نیرِ اعظم سوئے شمال آیا
سمٹ کے رہ گیا سایا کہ پھر بسنت آیا

زمیں نے سرسوں جمائی ہے کیا ہتھیلی پہ
کرشمہ خوب دکھایا کہ پھر بسنت آیا

رہا فسردہ و پژمردہ کیوں دلِ محروم
اُسے یقین نہ آیا کہ پھر بسنت آیا!

(فروری سنہ ۱۹۲۳ء)

پنجاب کے میدان

کس قدر ہے آہ! دامنگیرِ دل تیری زمیں
دل کشی پنجاب! کتنی تیرے میدانوں میں ہے
تیری وسعت میں ہوئی گم رفعتِ چرخِ بریں
ایک ایوانِ فلک بھی تیرے ایوانوں میں ہے!

دور تک آتی نظر ہیں لہلہاتی کھیتیاں
سامنے جن کے خجل ہے کشتِ خضرائے فلک
اور چاندی کی چمک والی یہ تیری ندیاں
کہکشاں ایسی اگر رکھتا ہے دکھلائے فلک!

دیدہ و دل جس سے روشن آریاؤں کے ہوئے
آج بھی تیری فضاؤں میں جھلکتا ہے وہ نور
نغمۂ مستانۂ توحید کی تاثیر سے
آج بھی تیری ہواؤں سے ٹپکتا ہے سرور!

عاشقی پرور سماں تیری چراگاہوں میں ہے
اور غبارِ ریں سا جو منظرِ دشت کی راہوں میں ہے
یاد جس سے تازہ ہیر رانجھے کی اور سوہنی وال کی
خاک اُڑتی ہے یہ عُشّاقِ پریشاں حال کی؛

دل تڑپ اُٹھتا ہے پہلو میں یکایک جب کہیں
بائلِ فریاد ہوتا ہے دلِ اندوہ گیں
بانسری کی کُوک اُٹھتی ہے سکوتِ شام میں
اور جگر سے ہُوک اُٹھتی ہے سکوتِ شام میں!

کچھ خیاباں بہرِ گلگشتِ بتانِ نازنیں
بُلبل و گُل کی ہے خلوت گاہ تیری گل زمیں
کچھ بیاباں دشت پیمایانِ وحشت کیلئے
بزمِ زیبا اختلاطِ حُسن و الفت کیلئے!

حُسن و اُلفت ہی نہیں ہے تیری شانِ امتیاز
جذبۂ حُبِّ وطن پر خاک کو تیری ہے ناز
کونسا میداں ترا ہے جو نہ تھا میدانِ جنگ
سُورماؤں کے لہو سے آج تک ہے لالہ رنگ!

رشکِ فردوس ہے محروم فضا شملے کی
نفسِ حور سے بڑھ کر ہے ہوا شملے کی!

چہرۂ شاہدِ فطرت نہیں مستور یہاں
نہیں اے ذوقِ نظر! پردے کا دستور یہاں

راجہ اِندر کا اکھاڑہ ہے یہ کہسار نہیں
سبز پریوں کے ہیں انبوہ، یہ اشجار نہیں

اس کی رفعت کا بھلا کس سے ہو اندازہ ٹھیک
ہوں گی جنّت کی فضائیں کہیں اس کے نزدیک

نگہِ شوق جدھر اُٹھ کے چلی جاتی ہے
مخملی فرش بچھا زیرِ قدم پاتی ہے

کیا خبر کیسا ہو نیرنگِ تماشائے بہار
کہ خزاں میں ہے یہاں منظرِ زیبائے بہار

چشمِ مشتاق کو سامانِ تماشا ہیں بہم
شجر و سبزہ و گُل انجمن آرا ہیں بہم

بے تکلّف ہے یہاں عشوۂ عُریانِ بہار
خلوتِ ناز ہے یہ بزمِ عُروسانِ بہار

حیرت افزا ہیں بہت چیل کے اشجارِ بلند
اُن کی توصیف کو درکار ہیں افکارِ بلند

کوئی دیکھے تو ذرا اُن کی فلک فرسائی	بے ستوں کب ہے یہ سقفِ فلکِ مینائی
تازگی جلوۂ انوارِ سحر میں ہے یہاں	طفلِ معصوم اُٹھے خواب سے جیسے خنداں
منظرِ شام نیا لطف دکھا دیتا ہے	سایۂ زُلفِ حسیناں کا پتا دیتا ہے!
قمقمے دامنِ کہسار سے تا دامنِ چرخ	جن کی طلعت سے ہی ممنونِ ضیا دامنِ چرخ
نظر آتے ہیں ستاروں سے زیادہ روشن	رو برو اِن کے ستارے ہیں دیئے بے روغن
سامنے ان کے نہ کیوں ماند ہوں سارے تارے	ٹکڑے بجلی کے ہیں یہ اور وہ بچارے تارے

جس طرف دیکھئے اک نُور نظر آتا ہے
جو شجر ہے شجرِ طُور نظر آتا ہے!

سبق آموز ہے کیا خوب یہاں کی بستی	ہر بلندی کی بغل میں ہے برابر پستی
دُھوپ چھاؤں کے مناظر بھی غضب ڈھاتے ہیں	رنگ نیرنگیِ دوراں کا دکھا جاتے ہیں
سایۂ ابر کہیں جلوۂ خورشید کہیں	عالمِ یاس کہیں پرتوِ اُمّید کہیں
سایہ و نُور کا باہم یہ بدل کر چلنا	یاس و اُمّید کے جادو کا ہے یکسر چلنا!

پھر کبھی شملے کی تعریف میں لکھیں گے کچھ اور
اب تو بدلا ہے خیالات نے پہلو بے طَور!

(۱۹۲۵ء)

رامائن
کے
سین

عزمِ صحرا

یعنی

شری رام چندر جی کی بن کو تیاری اور اہلِ اجودھیا کی بیقراری

رخصت اجودھیا سے وہ جانِ جہاں ہوا
یا اتفاقِ تفرقۂ جسم و جاں ہوا!

پہلو سے دل گیا، کہ چلا رام شہر سے
بھاگے نکل کے راحت و آرام شہر سے

گویا بہار چھوڑ کے صحنِ چمن چلی
پر وہ کبھی اس طرح نہ کبھی دفعتہً چلی!

آنکھوں سے چہرہ رام کا جب دُور ہو گیا
یکدہ تمام دیدۂ بے نُور ہو گیا

غم کا غُبار لے کے جو آہ رسا گئی
کالی گھٹا سی چرخ پہ گھنگھور چھا گئی!

آہوں میں جو شرار دلوں سے نکل گئے
وہ آسماں پہ برق بنے اور جل گئے

عالم وہ بجلیوں پہ غضب اضطراب کا
اس پر وہ جوشِ گریہ پیہم سحاب کا

انساں تو خیر صدمۂ غم سے نڈھال تھے
وحش و طیور تک بھی اسیرِ ملال تھے

بیگانہ طرزِ رقص سے باغوں میں مور تھے
غم سے پروں میں گردنیں ڈالے چکور تھے

دلگیر چلے کہ شہرِ خموشاں اودھ ہوا
آباد دشت ہو گیا، ویراں اودھ ہوا!

صحرا کو رام و لچھمن و سیتا جو چل پڑے
بیتاب ہو کے لوگ گھروں سے نکل پڑے

زار و قطار روتے ہوئے بیقرار سب
تھے پیچھے پیچھے رام کے باحالِ زار سب

ہر اہلِ شہر خستہ و زار و نژند تھا!
ہر گھر سے شورِ نالہ و شیون بلند تھا

تھا اردگرد رتھ کے وہ خلقت کا اژدہام
گھوڑوں کو گام گام پہ لیتے تھے تھام تھام

کہتے تھے "مر ہی جائیں گے اے پران ناتھ ہم
ہم کو نہ چھوڑ جائیے، جائیں گے ساتھ ہم"

یہ حال دیکھ کر وہ عزیزِ دلِ انام
یوں ہو گیا عوامِ اجودھیا سے ہم کلام

"جاتا ہوں بن کو میں کہ یہ فرماں ہو باپ کا
آئے ہیں آپ چھوڑنے احساں ہو آپ کا

بہلاؤ جا کے دل شہِ پیرانہ سال کا
کم تا کہ اُن کے دل پہ ہو صدمہ ملال کا

تشویش کیا تمھیں کہ بھرت تاجدار ہے
عالم ہے، رحم دل ہے، صداقت شعار ہے

ہے تم پہ فرض اُس کی اطاعت بجان و دل
کرتا ہے جب وہ تم سے محبت بجان و دل

ہوگی اُسے تمھاری اطاعت سے تقویت
پاتے ہیں شہریار رعیّت سے تقویت

پرماتما کا شکر کرو شادماں رہو!
سرزیرِ منّتِ شہِ امن و اماں رہو

اور میری واپسی کا جو تم کو خیال ہے
یہ ہے خیالِ خام! یہ امرِ محال ہے"

یہ کہہ کے سارتھی سے اشارہ کیا کہ ہاں
لگتی ہے دل پہ چوٹ سی سُن سُن کے نالہ ہائے

بہتر ہے اس ہجوم سے رتھ کو نکال کے
گرمِ سفر ہو دشت کے رستے پہ ڈال کے"

چلنے سے رتھ کے اور قیامت بپا ہوئی
یعنی بلند شورشِ آہ و بُکا ہوئی

رکھے ہوئے جگر پہ، کلیجے پہ ہاتھ سب
روتے ہوئے روانہ ہوئے رتھ کے ساتھ سب

جو تھے جواں وہ گھیر کے رتھ کو رواں ہوئے
جو ناتواں ضعیف تھے پیچھے رواں ہوئے

کہتے ہوئے کہ" اتنے تو ہم سے خفا ہو رام
صحرا نوردصورتِ موجِ صبا ہو رام

یوں تیز تیز کس لیے رتھ کو اُڑا چلے
بوڑھوں کو خاکِ راہ میں رگھبر! ملا چلے

لیکن رہے خیال کہ مڑنے کے ہم نہیں
یہ زیست ہم کو موت سے اے رام کم نہیں

ہم سر کے بل چلیں گے اگر پاؤں ٹوٹ جائیں
مل جائے کاش موت اگر تجھ سے چھوٹ جائیں

حیرت ہے! آج قفلِ دہن کھولتے نہیں!
مُہرِ سکوت لب پہ ہے، کچھ بولتے نہیں!

سُنتے نہیں ہو آج برہمن کی التماس
تکریم کا خیال کدھر ہے؟ کہاں ہے پاس؟

اے رام! کیا ہوئیں وہ ترے دل کی نرمیاں
کیوں سرد پڑ گئیں وہ محبت کی گرمیاں؟

بیٹھے تھے ہم تو جشن کا ساماں کئے ہوئے
جاتے ہیں آپ عزمِ بیاباں کئے ہوئے

واپس اودھ کو جائیں تو کس منہ سے جائیں ہم
اپنا اودھ وہی ہے جہاں تجھ کو پائیں ہم!

وہ پھول تو ہے جس کی پھبن سے سماں رہا
لطفِ بہارِ شامِ اودھ اب کہاں رہا

جنگل اجودھیا ہے تو صحرا دیکھیئے
کچھ بے طرح ہے مائلِ بیداد دیکھیئے

یہ آگ سب اسی کی لگائی ہوئی تو ہے
خلقت تمام اسی کی ستائی ہوئی تو ہے

جسرتھ کا حال غیر، کوشلیا کا حال غیر
تیرے بغیر ساری اجودھیا کا حال غیر!"

یوں گرتے، اٹھتے، بیٹھتے، روتے ہوئے تمام
ساتھی رہے غریب پئے بازگشتِ رام

ہر چند اپنے جی کو کیا رام نے کڑا
لیکن وہ تھا ہجوم کہ رتھ روکنا پڑا!

ٹھہرا جو رتھ تو دل ہوئے سب کے شاد شاد
کہنے لگے کہ دل کی بر آئی ہے اب مراد

رتھ سے اتر کے رام جو پیدل رواں ہوئے
پھر لوگ محوِ گریہ و آہ و فغاں ہوئے!

نورِ افق پہ گرنے لگے پردہ ہائے شام
تمسا ندی پہ رام نے آ کر کیا قیام

سب کوشلا کے سو گئے ساحل پہ آپ بھی
سوتے ہوئے رہائی کی تجویز سوچ لی

اہلِ اجودھیا تھکے ماندے تھے سو گئے
قدموں میں آ کے رام کے بے فکر سو گئے

ازبس کہ دوڑ دھوپ سے دن بھر کی چُور تھے
سونا ضرور تھا اُنھیں، غافل ضرور تھے!

رگھبر بہت سی رات رہے اُٹھ کھڑے ہوئے
جس وقت اہلِ شہر تھے غافل پڑے ہوئے

راہی ہوئے وہ لے کے اجازت سومنت سے
اور ساتھ ہی کہا یہ بمنت سومنت سے

"لے جاؤ رتھ اودھ کو مگر ہیر پھیر سے
تا اہلِ شہر کو نہ ذرا کچھ پتا چلے"

پَو پھٹتے پھٹتے تینوں وہ دریا کے پار تھے
تلوے تھے آہ پھُول سے اور خارزار تھے!

(۱ اکتوبر ۱۹۱۱ء)

ویران کُٹیا

مایا کا ہرن مار کے جب رام اِدھر آیا — کُٹیا میں نہ سیتا کا نشاں تک نظر آیا
باہر بہ دلِ خوں شُدہ و چشمِ تر آیا — ہر اشک لئے حالتِ دل کی خبر آیا

نظروں سے وہ خورشید سا چہرہ جو نہاں تھا
آنکھیں جدھر اُٹھتیں، شبِ تیرہ کا سماں تھا!

جی تھام کے، باہر در و دیوار کے ڈھونڈا — اور دونوں طرف پہلوئے کُہسار کے ڈھونڈا
اُس گُل کو ہر اک برگ میں گلزار کے ڈھونڈا — ہر ڈال میں، ہر پات میں اشجار کے ڈھونڈا

اُس سروِ رواں نے جو کہیں سر نہ نکالا
حسرت سے گرا خاک میں بس ڈھونڈھنے والا!

اُمّید کا اب دل کو سہارا نہیں باقی — اور سعی کا، تدبیر کا یارا نہیں باقی

دل بیٹھ گیا، کوئی اُبھارا نہیں باقی — آنکھوں کے لئے ذوقِ نظارا نہیں باقی

لچھمن سے کہا بھائی! مصیبت یہ کڑی ہے

حیرت میں ہوں کیوں جانِ حزیں لب پہ اڑی ہے!

کہسار میں وہ آئنہ سیما نہیں ملتا — صحرا میں کہیں نقشِ کفِ پا نہیں ملتا

گلزار میں اپنا گلِ رعنا نہیں ملتا — دریا میں بھی وہ گوہرِ یکتا نہیں ملتا

پہلے ہی تھا ویرانے میں کاشانہ ہمارا

اب اور بھی ویراں ہوا ویرانہ ہمارا!

کُٹیا تھی اگر جسم تو جاں اُس میں تھی سیتا — رہتی صفتِ رُوح رواں اُس میں تھی سیتا

ہر شام و سحر جلوہ فشاں اُس میں تھی سیتا — جب میں ہوا صحرا کو رواں اُس میں تھی سیتا

مقدور یہاں کس کا، زمیں کھا گئی اُس کو

یا تیری نظر، چرخِ بریں! کھا گئی اُس کو!

اشجار مجھے اُس کا پتا کیوں نہیں دیتے — پتوں کی زباں ہے تو صدا کیوں نہیں دیتے

مُرغانِ ہوا! تم ہی بتا کیوں نہیں دیتے — سیتا پہ جو گزری ہے سُنا کیوں نہیں دیتے

بھرتا نہیں دم کوئی بھی فریاد رسی کا

سچ ہے کہ نہیں کوئی مصیبت میں کسی کا!

سُنبل سے جو قدرت نے لئے گیسوئے سیتا — پھولوں سے لیا رونق و رنگِ رُوئے سیتا

قوسِ قزحِ چرخ سے تھے ابروئے سیتا — غنچوں سے دہن، نکہتِ گُل سے بُوئے سیتا

اور نرگسِ پُرسحر اُڑائی تھی ہرن سے
لب لعل سے اور دانت لئے دُرِّ عدن سے!

صنعت گرِ بےچوں نے سراپا یہ بنایا
چُن چُن کے ہر اک عنصرِ چیدہ کو کھپایا
وہ پیکرِ دل کش مری آنکھوں میں سمایا
لیکن مرے برگشتہ مقدّر کو نہ بھایا

مجموعۂ خوبی کو پریشاں کیا آخر!
غربت میں مجھے کُشتۂ حرماں کیا آخر!

واپس دیئے اجزائے رُخ و زلف چمن کو
قد سرو کو، خوشبو ملی ریحان و سمن کو
لب سُوئے بدخشاں گئے اور دانت عدن کو
پھر دیدۂ سیتا کا ملا سحر ہرن کو

یوں درہم و برہم ہوئی وہ ناز کی پُتلی!
بن آئے گی پھر کس سے اِس انداز کی پُتلی؟

(۱۹۱۵ء)

سیتا جی کی فریاد

تیرے ترکش میں ابھی تک او کماندارِ قضا
تیر باقی تھا کوئی مجھ پر چلانے کے لئے؟

کم تھی وہ صحرا نوردی؟ کم تھے وہ ادن کے رنج؟
آہ! یہ ایام بھی باقی تھے آنے کے لئے؟

وہ زمانِ جانگزا جب ہر گلِ باغِ اشوک
شعلۂ نارِ عقوبت تھا جلانے کے لئے

آہ! تھے اس قید میں سامانِ جہنم کے تمام
تھی مگر اُمید دل کو گدگدانے کے لئے

روکنا جاں کو نکلنے سے کہ آئیں گے ضرور
دل سے یوں کہنا کہ ہیں تیار آنے کے لئے

ہائے! میں مجبور اب کس پر رکھوں چشمِ امید
جب ہوئے آمادہ وہ آنکھیں چرانے کے لئے

آنسوؤں کے نیر کیوں جاری ہیں لچھمن سچ بتا
تُو تو کہتا تھا "چلو گنگا نہانے کے لئے"

کاش! گنگا، تو ہمیشہ کے لئے لے لے مجھے
یوں اگر بنباس تھی مجھکو بُلانے کے لئے!

آرزو رشیوں کے درشن کی بھی تھی بلشبہ مجھے
پر نہ تھی تیار اس حالت میں آنے کے لئے

کیا کہوں گی؟ کیوں ہوئی آوارہ دشتِ بلا
ننگ ہوں اب آہ! اُن کے آستانے کے لئے

داغِ رسوائی جو فرضی دامنِ سیتا پہ ہے
مٹ ہی جاؤں کاش میں اُس کو مٹانے کے لئے

ہائے وہ دل کس طرح مجھ سے مکدر ہو گیا
جو دلِ صافی تھا آئینہ زمانے کے لئے

جاننے والے ہیں دہ اسرار کے "دل" تو پھر
آتشِ سوزاں تھی کافی آزمانے کے لئے

رام کی خاطر زمانے بھر کو چھوڑا تھا مگر
آہ! مجھ کو رام نے چھوڑا زمانے کے لئے

لب پہ شکوہ رام کا آئے تو کٹ جائے زباں
مجھ کو پیدا ہی کیا صدمے اُٹھانے کے لئے

بدگماں ہو رام مجھ سے، یہ تو ممکن ہی نہ تھا
کس طرح آتا جو کچھ تھا پیش آنے کے لئے

میں نہ چھوڑوں گی نہ چھوڑوں گی خیالِ رام کو
گو مچلتا ہی رہے دامن چھڑانے کے لئے!

آہ! اے صحرا کے پھولو! کس لئے ہنستے ہو تم
کس لئے ہنستے ہو تم! کس کو ہنسانے کے لئے؟

تم نہ تھے، وہ روئے خندانِ رام کا تھا اے گُلو
اب ہنسو گے تم کسی کو خوں رُلانے کے لئے

اب نہ سیتا کی وہ آنکھیں ہیں نہ وہ سیتا کا دل
دل ہے خوں ہونے کو، آنکھیں خوں بہانے کے لئے

لُطفِ گلگشتِ چمن صحرا میں تھا ہمراہِ رام
سبزہ زارو! آئی ہوں اب خاک اُڑانے کے لئے

آہ اے بادِ صبا! اٹکھیلیوں کے دن گئے — اب چلے گی تو کسی کی خاک اُڑانے کے لئے

دل بڑھے گا کس کا اب کالی گھٹا کو دیکھ کر — آئے گی تو آئے گی بجلی گرانے کے لئے

دھرتی ماتا! کھول دے آغوشِ اُلفت کھول دے — ساری دنیا اب ہے مجھ کو کاٹ کھانے کے لئے

ہیں کہاں اے آسماں تیرے وہ اندازِ ستم — ٹوٹ پڑ طرزِ جفا کو آزمانے کے لئے

پوچھتی پھرتی ہوں تیرے گھر کو مرگِ ناگہاں!

مضطرب ہے آہ! جانِ زار جانے کے لئے!

اعجازِ عصمت

کہاں جنگل وہ کانٹوں کے، کہاں نازک حسین سیتا
کہاں سُنسان پہاڑوں کے، کہاں نازک بدن سیتا

کہاں تپتے ہوئے صحرا، کہاں برگِ سمن سیتا
کہاں وہ بالشِ خارا، کہاں گُل پیرہن سیتا

کہاں سے ان مصائب کے اُٹھانے کا جگر پایا
"پتی بَرَت دھرم" کی طاقت نے یہ اعجاز دکھلایا

کہاں سیتا مہارانی، کہاں وہ قید راون کی
وہ فرقت رام کی، وہ دھمکیاں عصمت کے دشمن کی

وہ ننھا سا کلیجا، وہ ڈرانی صورتیں جن کی
وہ تدبیریں نئی ایذائے جان و کاہشِ تن کی

مگر آخر مقدّر خود کئے پر اپنے پچھتایا!
"پتی بَرَت دَھرم" کی طاقت نے یہ اعجاز دکھلایا

اِدھر تھے دو مسافر بے سر و سامان او تنہا
اُدھر راون بصد شاہانہ شوکت جلوہ فرما تھا

سمندر بیچ میں حائل، نہ آر اُس کا نہ پار اُس کا جُلا دی کس طرح بن باسیوں نے پاپ کی لنکا

یہ کس کی آہ نے راون کو خاک و خوں میں تڑپایا

"پتی برت دھرم" کی طاقت نے یہ اعجاز دکھلایا!

نکل کر کوکبِ اُمّید کا پھر وہ نہاں ہونا نئے بن باس کے صدمے، وہ پھر بے خانماں ہونا

سُبک تھا کوہِ غم جن سے، وہ اُن کا سرگراں ہونا دوبارہ بختِ بد کا درپئے آزارِ جاں ہونا

کہاں سے ان مصائب کے اُٹھانے کا جگر پایا

"پتی برت دھرم" کی طاقت نے یہ اعجاز دکھلایا

زمانہ ایک جنگل میں یُونہی باچشمِ نم گزرا شبِ فریاد آئی آہ! جب روزِ الم گزرا

خبر دے کر گیا وہ آمدِ غم کی جو دم گزرا ہوئی بیتاب سیتا سر سے جب طوفانِ غم گزرا

زمیں شق ہو گئی فریاد سے، اک زلزلہ آیا

"پتی برت دھرم" کی طاقت نے یہ اعجاز دکھلایا

راون کا ماتم

بیٹھا جگر میں رام کا تیرِ فنا پیام
راون کی ہست و بود کا قصہ ہوا تمام

افواجِ رام میں پڑی کوسِ ظفر پہ چوٹ
جس سے کہ کھائی راکھشسوں نے جگر پہ چوٹ

نُصرت نے نذرِ رام کیا تاجِ افتخار
غلطاں بخون و خاک تھا لنکا کا تاجدار

رنواس میں تھیں چشم براہ رانیاں تمام
اک انتظار میں ہوئی آخر سحر سے شام

راون کے حشر کی جو حرم میں خبر گئی
برچھی تھی اک کہ چاک کلیجوں کو کر گئی

ہاتھوں میں تھام کر جگرِ پاش پاش کو
سب دیکھنے نکل پڑیں راون کی لاش کو

جمگھٹ وہ رانیوں کا جو ماتم کناں چلا
فریاد و آہ و نالہ کا اک کارواں چلا

وہ دل جلوں کے نالے وہ ماتم سہاگ کا
تھا سوزِ دل سے ہر نَفَس اک شعلہ آگ کا

کُھل کُھل کے آئے تا بہ کمر موئے عنبریں
دُھل دُھل کے اشک سے ہوئے فق روئے آتشیں

جوشِ الم میں روتی ہوئیں پھوٹ پھوٹ کے
لاشے پہ آکے گرنے لگیں ٹوٹ ٹوٹ کے

یوں لاش پر پہنچ کے ہر اک سر کے بل گئی
گویا زمین پاؤں تلے سے نکل گئی!

بن پڑتی تھی نہ کچھ دلِ اندوہناک سے
پہلو میں اُٹھ کے درد اُٹھا تھا تپاک سے

کہتی کوئی کہ "ہائے مرا راج لُٹ گیا
لنکا کا تخت بیٹھ گیا، تاج لُٹ گیا"

پھر کوئی پاؤں چُومتی ہیجانِ شوق میں
دریا بہا کے آنکھ سے طوفانِ شوق میں

بیٹھی تھی کوئی لاش کا زانو پہ سر لئے
بہرِ نثار پر کفِ مژگاں گُہر لئے

تن سے لپٹ کے رونے لگی خستہ جاں کوئی
ہاتھوں کو دے کے دل ہوئی محوِ فغاں کوئی

کہتی تھی بازوؤں کو کوئی تھام تھام کے
"ہم زبلوں کا آہ! سہارا یہی تو تھے"

"اِن بازوؤں کی آہ! وہ قوت کدھر گئی
جن سے اُٹھے پہاڑ وہ طاقت کدھر گئی"

کیوں گردنِ اجل میں حمائل ہوئے یہ ہاتھ؟
ہم سے نہ ذوقِ وصل کے سائل ہوئے یہ ہاتھ"

کہتی کوئی "یہ شعبدے بھاتے نہیں ہمیں
لو اُٹھ کے بیٹھو! موت کا آیا یقیں ہمیں"

"طاقت سے اپنی زیر جو اِندر کو کر چکا
وہ فانیوں کے تیرِ ہوائی سے مر چکا"!

مندودری کہ صاحبِ حسن و جمال تھی
راون کی شاہ بانوئے زیبا خصال تھی

یوں تھی وہ رانیوں کے ہجومِ کثیر میں
جیسے ہو ماہتاب نجومِ کثیر میں

سر پیٹتی تھی، روتی تھی اور نالے کرتی تھی
لاشے کو دیکھ دیکھ کے سرد آہیں بھرتی تھی

کہتی تھی "پران ناتھ! نہ کہتی تھی آپ سے؟
پاپی کی موت پاپ ہے، باز آؤ پاپ سے"

تقدیر تھی جو دشمنِ جانی، ہزار حیف
میری نہ ایک آپ نے مانی، ہزار حیف

وہ دن بھی تھے کہ آپ سے ڈرتے تھے دیوتا
دم آپ کے جلال کا بھرتے تھے دیوتا

سرتاج آپ تاجورانِ جہاں کے تھے
ہم پایہ اوجِ رتبہ میں ہفت آسماں کے تھے

لرزے میں جس کے دم سے تھے افلاک، وا دریغ
بے حس پڑا ہے اب وہ سرِ خاک، وا دریغ

لُڑھکا ہوا کہیں تنِ بیجان ہے، سر کہیں
ترکش کہیں ہے، تیر و کماں منتشر کہیں

لنکا کے شوربیروں کا نام و نشاں مٹا
شاہی مٹی، غرور مٹا، خانداں مٹا

ہوتا ہے یوں ظہور خدا کے عتاب کا
چرچا رہے گا دہر میں اس انقلاب کا

تا روزِ حشر باعثِ عبرت رہیں گے ہم
آماجگاہِ تیرِ ملامت رہیں گے ہم!

ٹھنکا تھا میرا ماتھا اُسی روز آپ جب
لنکا میں لے کے آئے تھے سیتا کو بالتعب

تاثیرِ آہ تھی اُسی عصمت مآب کی
بھڑکی یہ جس سے آتشِ سوزاں عذاب کی

یہ آگ وہ ہے جس سے جلے خشک و تر تمام
اس کی لپیٹ میں آ ہی گئے بحر و بر تمام

اوّل سے جس کا ڈر تھا ہوئی انتہا وہی
دھڑکا تھا جس مآل کا آخر ہوا وہی

جانِ گناہ تیر قضا کا نشانہ تھی
رگھبر! تری نگاہِ غضب اک بہانہ تھی

شوہر کو روؤں آہ! کہ روؤں سپہر کو میں
دل کا کروں علاج! کہ تھاموں جگر کو میں"

یہ کہتے کہتے ہو گئی بے حال وہ غریب
چکرا کے غش میں آ کے گری لاش کے قریب

پندونصائح

خدا کی امانت

جس دل کو ابتدا میں خبر انتہا کی ہے
پھر اُس کو خوف کیا ہے جو دُنیا بلا کی ہے

ہر چند اس کی خُو میں بہت بُو وفا کی ہے
لیکن ہوس کی چاہ، نہ خواہش ہوا کی ہے

یہ دل مرا نہیں ہے
امانت خدا کی ہے!

یہ بھی خبر ہے اے غمِ دنیائے دُوں تجھے!
سر اپنا لاکھ پیٹ، مگر دل نہ دُوں تجھے

دل جانتا ہے صورتِ صیدِ زبُوں تجھے
ورنہ میں دل کے نام پہ قرباں کرُوں تجھے

یہ دل مرا نہیں ہے
امانت خدا کی ہے!

او قاصدِ شباب! نہ لانا پیامِ عشق
چھاتی دہل گئی ہے یہاں سُن کے نامِ عشق

ہو جاؤں یوں تو جان سے، دل سے غلامِ عشق
ممکن ہے بھول جاؤں کہیں پی کے جامِ عشق

یہ دل مرا نہیں ہے
امانت خدا کی ہے!

اے حُسنِ فتنہ ساز! تجھے دیکھتا تو ہوں
ہے مثلِ سحرِ سامری بیشک ترا فسوں

بہتر ہے تیرے عشوؤں سے ناآشنا رہوں
تو لاکھ عشوہ باز ہو پر دل تجھے نہ دوں

یہ دل مرا نہیں ہے — امانت خدا کی ہے!

مجنوں کا دل ہے خواہشِ لیلیٰ کے واسطے — وامق کا دل ہے دامنِ عذرا کے واسطے
بلبل کا دل بنا گلِ رعنا کے واسطے — پھر دل مرا ہے کس کی تمنا کے واسطے

یہ دل مرا نہیں ہے — امانت خدا کی ہے!

پنہاں اسی میں راز ہیں کچھ رازدار کے — لایا تھا ساتھ عرشِ بریں سے اُتار کے
دامن میں پھول کچھ ہیں کہیں کی بہار کے — پہلو میں کچھ ہیں داغ کسی لالہ زار کے

یہ دل مرا نہیں ہے — امانت خدا کی ہے!

کتنے ہی اس کے چاہنے والے ہیں تاک میں — دم کر رکھا ہے نفسِ ستمگر نے ناک میں
مل جائے آہ! آہ! مرا دل نہ خاک میں — کیا چیز لے کے جاؤں گا درگاہِ پاک میں

یہ دل مرا نہیں ہے — امانت خدا کی ہے!

صیّادِ نفس! طائرِ دل سے ذرا پرے — کم بخت! اپنے جال کو جا کر بچھا پرے
دانا ہے کب فریب میں آتا ہے؟ جا پرے — مکّار! جا کے مکر کے دانے گرا پرے

یہ دل مرا نہیں ہے — امانت خدا کی ہے!

کس کام کا یہ دل ہے جو ناپاک ہوگیا — ناچیز ہوگیا، خس و خاشاک ہوگیا
دل گر مریدِ راندۂ افلاک ہوگیا — آلودۂ گناہ تہِ خاک ہوگیا

یہ دل مرا نہیں ہے — امانت خدا کی ہے!

(۱۹۰۷ء)

پُرانا کُرتہ

کل سحر پھینک کے اِک اپنا پُرانا کُرتہ — یوں لگا سوچنے میں، سر بہ گریباں ہو کر
کہ یہ کُرتا جو رہا ہے مثالِ جوشن — دافعِ ضربتِ شمشیرِ زمستاں ہو کر
شدّتِ موسمِ سرما سے بچایا مجھ کو — کی ہے کیا خوب ہی جاں پرری بیجاں ہو کر
آج یہ کہنہ ہوا، میں نے اسے پھینک دیا — اس سے کی ہیں نے مروّت یہی انساں ہو کر

شاعرانہ سہی پڑی تھی مرے دل میں اُلجھن
کہ صدا رُوح نے دی مجھ کو یہ غرّاں ہو کر :-

کس توہّم میں ہے محروم! ذرا آنکھ تو کھول — کس لئے بیٹھا ہے غافل تُو پریشاں ہو کر
لے سبق پارچۂ کُہنہ سے دانا بن کر — نہ کہ مغموم سا ہو بیٹھ تُو ناداں ہو کر
یہ ترا جسم بھی کرتے کی طرح ہے غافل — اور اس کُرتے میں ہم رہتے ہیں پنہاں ہو کر
یہ بھی اک روز اسی طرح پرانا ہو گا — پھینک دیں گے اسے اور نکلیں گے عُریاں ہو کر

فانی چولے سے محبّت کو گھٹا تا جا تُو
تا کہ جب چھوڑیں تو چھوڑیں اسے شاداں ہو کر!

(اگست ۱۹۱۶ء)

دارُالغرُور

ہر شمع اپنے زعم میں یاں برقِ طُور ہے — ہر کنکری کو ہمسریٔ کوہِ نُور ہے

عالم میں کبر و عُجب کا ہر سُو ظہور ہے — دُنیائے انکسار جو ہے یاں سو دُور ہے

ہم کو تو اس جہاں سے شکایت ضرور ہے

دُنیا ہے جس کا نام وہ دارالغُرور ہے!

خُوبوں کو اپنی خوبیِ صورت پہ ناز ہے — مٹی کو گوری سانولی رنگت پہ ناز ہے

ناز و ادا پہ، چشمِ پُر آفت پہ ناز ہے — تنتے ہیں قدِ رشکِ قیامت پہ ناز ہے

جو اِن کو دیکھتا ہے وہ کہتا غرور ہے

دنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرور ہے!

شاہوں کو اپنی صولتِ شاہی پہ ہے گھمنڈ — نعمت پہ، عیش و عشرتِ شاہی پہ ہے گھمنڈ

جاہ و حشم پہ، دولتِ شاہی پہ ہے گھمنڈ — طبل و عَلَم پہ، شوکتِ شاہی پہ ہے گھمنڈ

ہر شخص اُن کو دیکھ کے کہتا غرور ہے

دنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرور ہے!

زاہد کو دیکھئے تو الگ اس کی شان ہے	گویا خدا اُسی پہ فقط مہربان ہے
حضرت کو زہدِ خشک پہ کتنا گمان ہے	بگڑا ہوا مزاج سرِ آسمان ہے

جو اس کے ڈھنگ دیکھ لے کہتا ضرور ہے
دُنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرور ہے!

عالم جو اپنے علم پہ پھولا ہوا نہیں	ہم کو تو اس جہاں میں ابھی تک ملا نہیں
جاہل پہ کون عالم دانا ہنسا نہیں	رونا یہ ہے کہ کوئی بھی عجز آشنا نہیں

نشۂ شرابِ علم میں ہے، اور ضرور ہے
دُنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرور ہے!

اہلِ ہوس کو حرص کی وسعت کا فخر ہے	ھَلْ مِنْ مَّزِیْدْ کہنے کی عادت کا فخر ہے
قانع کو اپنے گنجِ قناعت کا فخر ہے	ہمت کا، اور غیورِ طبیعت کا فخر ہے

مغلوب ہو نہ ہو پہ تکبّر ضرور ہے
دنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرور ہے!

محرومِ خاکسار اجہاں کا یہ حال ہے	ہو اس جہاں سے دُور جو فکرِ مآل ہے
نام و نمود نے جو بچھایا یہ جال ہے	بچنا مرے خیال میں اس سے محال ہے

گر کھل سکی نہ آنکھ، تو پھنسنا ضرور ہے
دُنیا ہے جس کا نام وہ دارالغرور ہے!

(اپریل ۱۹۰۹ء)

جگانے کی گھڑی

وقتِ سحر ہے، سونے والو — دھیان کدھر ہے، سونے والو
جاگو نیند کے اے متوالو — لطفِ سحر کو کھونے والو
جاگ اُٹھا ہے پتّا پتّا — غفلت کیسی؟ سونا کیسا
بادِ سحر کے جھونکے آئے — نکہتِ تر کے جھونکے آئے
جاگو، پہلو بدل کر دیکھو — اُٹھّو، آنکھیں مل کر دیکھو

صَلِّ علےٰ یہ نُور کا عالم
ہر ذرّے پر طُور کا عالم!

تازہ نوا مُرغانِ چمن ہیں — نغمے جن کے جانِ چمن ہیں
میٹھی بولی بول رہے ہیں — اُڑنے کو پر کھول رہے ہیں
وجد میں ہیں سب آئے جاتے — حمدِ خدا کے گیت ہیں گاتے
گلشن میں جو نہر ہے جاری — کرتی ہے سجدۂ خالقِ باری

حمد و ثنا کے ترانے گاتی
اپنی جبیں کو ہے گھِستی جاتی!

نخل کھڑے ہیں سر کو جھکائے — دستِ دُعا شاخوں نے اُٹھائے

ذکرِ خدا میں چمن کی زباں ہے | خار کا ہم کو جس پہ گماں ہے
محوِ یادِ خدا ہے سبزہ | سر بسجود پڑا ہے سبزہ
شاخ پہ بلبل زمزمہ خواں ہے | خاک پہ سنبل سجدہ کناں ہے

جاگو، یادِ خدا کی گھڑی ہے
وقتِ نماز، دُعا کی گھڑی ہے!

شور اٹھا ناقوس واذاں کا | وقت نہیں یہ خوابِ گراں کا
عابد، شیخ، برہمن جاگے | جانبِ مسجد و مندر بھاگے
عارف، زاہد اور پجاری | نیند نہیں ہے جن کو پیاری
نیند سے پیاری یادِ خدا ہے | یادِ خدا میں جن کو مزا ہے

محفلِ راز میں جاکر بیٹھے
دل کو جہاں سے اٹھا کر بیٹھے!

کیوں کہ یہ عالم دارِ فنا ہے | اس میں سدا کب کوئی رہا ہے
تُو ہے مسافر اس دنیا میں | جیسے رہرو اُترے سرا میں
وقتِ سحر گر رہرو سوئے | غفلت میں گر وقت کو کھوئے
چلنے سے ہو اگر وہ غافل | کھوٹی کرے گا اپنی منزل

تجھ کو بھی درپیش سفر ہے!
جاگ اُٹھ! جاگ اُٹھ! وقتِ سحر ہے!

(اپریل سنہ ۱۹۰۹ء)

گوشۂ تنہائی

دنیا میں بہت دوڑے راحت کے تمنائی
تسکیں کی مگر صورت تجھ میں ہی نظر آئی
اے گوشۂ تنہائی!

کچھ نہیں دل جس کو لے جائیے میلوں میں
جز تیرے کہاں راحت دُنیا کے جھمیلوں میں
اے گوشۂ تنہائی!

خلوت وہ تری جس میں ہنگامۂ جلوت ہے
وحدت کا تری غُنچہ اک گلشنِ کثرت ہے
اے گوشۂ تنہائی!

سب عیب و ہنر اپنے اے آئینۂ باطن
تجھ بن نظر آ جائیں یہ بات کہاں ممکن
اے گوشۂ تنہائی!

ساماں ہیں بہم تجھ میں سب دل کی حضوری کے

محفل میں کہاں تیری صدمے ہجوری کے
اے گوشۂ تنہائی!

آزار سے بالا ہے گو زیرِ زمیں ہے تُو
اربابِ قناعت کو فردوسِ بریں ہے تُو
اے گوشۂ تنہائی!

جنگل میں، پہاڑوں میں تاریک گپھاؤں میں
مرغوب ترین ہے یا اشجار کی چھاؤں میں
اے گوشۂ تنہائی!

پاتے ہیں جہاں تجھ کو دُنیا میں ترے شیدا
فی الفور وہیں اُن کے دُکھ درد ہیں ناپیدا
اے گوشۂ تنہائی!

شاعر کہ مصوّر ہے فطرت کے نظاروں کا
ذرّوں میں ترے اس کو جلوہ ہے ستاروں کا
اے گوشۂ تنہائی!

طالب ہیں ترے اکثر جو علم کے طالب ہیں
تجھ سے روشن دل پر مضمون و مطالب ہیں
اے گوشۂ تنہائی!

تُو مسکنِ دل کش ہے جویائے حقیقت کا
مرکز ہے حقیقت میں پہنائے حقیقت کا
اے گوشۂ تنہائی!

بازارِ دو عالم میں جو جنس نہیں ملتی
حیرت ہے کہ انساں کو آکر ہے یہیں ملتی
اے گوشۂ تنہائی!

دُنیا میں اگر کوئی منزل گہِ عقبےٰ ہے
وہ تیری ہی محفل ہے وہ تیرا ہی ملجا ہے
اے گوشۂ تنہائی!

ہر ایک تگ و دو کی ہے آخرِ کار آخر
گر تجھ سے یہاں بھاگے ہے کُنجِ مزار آخر
اے گوشۂ تنہائی!

خواہاں ہے دل و جاں سے محرومِ حزیں تیرا
کاش! اس کو دلِ ناداں ہونے دے مکیں تیرا
اے گوشۂ تنہائی!

عِلم

رُباعی

بے کار ہے یاں نغز بیانی اپنی　　بے سُود ہے اے طبع، روانی اپنی
محرُوم ہے خاموش، قلم ساکت ہے　　خود علم سناتا ہے کہانی اپنی

بزمِ جہاں میں ساغرِ آبِ بقا ہوں میں　　آزارِ مرگ کیا ہے، کہ خاکِ شفا ہوں میں
میرے ہی دم سے ہے گُلِ ہستی میں رنگ و بُو　　ابرِ بہار ہوں میں، نسیمِ صبا ہوں میں
رونق طلسم خانۂ امکاں کی مجھ سے ہے　　ہوں وہ طلسمِ ہوش کہ حیرت فزا ہوں میں
وہ میری کُہنگی ہے، فدا جس پہ تازگی　　دَورِ قدیم سے ہوں، مگر نت نیا ہوں میں

سب شوخیاں ہیں عالمِ ایجاد میں مری
میرے ہیں سب کرشمے، جدھر دیکھتا ہوں میں!

سب جانتے ہیں نورِ جبینِ ازل مجھے — رنگِ ظہورِ خالقِ ارض و سما ہوں میں
عارف کے واسطے ہوں میں خورشیدِ معرفت — برہم زنِ طلسمِ شبِ ماسوا ہوں میں
گمراہ میری راہ پہ ہوتا نہیں کوئی — وہ پرتوِ چراغِ طریقِ صفا ہوں میں
مشکل نہیں ہیں راہِ حقیقت کے مرحلے — منزل نہیں ہے دور اگر رہنما ہوں میں

دیتا ہوں بے نشاں کا نشاں کچھ نہ کچھ ضرور
طالب زمانہ جس کا ہے اُس کا پتا ہوں میں!

ہر چند وہ رسائیِ دانش سے دور ہے — ہے یہ بھی جانتا کہ نہیں جانتا ہوں میں
میراثِ انبیا مرا مشہور نام ہے — سیدھا سا اک وسیلۂ قربِ خدا ہوں میں
دیتا ہے گو یہ سارے زمانے کو روشنی — رُتبے میں آفتاب سے لیکن سوا ہوں میں
اس آفتاب میں تو ہے ظاہر کی روشنی — دراصل آفتابِ حقیقت نما ہوں میں

ظلمت فزائے دل مہ و خورشید ہوں ابھی
چشمِ جہاں سے آج نہاں گردِ راہ ہوں میں!

میرا وطن نہ پوچھئے مجھ سے کہ صبح و شام — غربت میں مثلِ بادیہ گردِ صبا ہوں میں
اُس سرزمیں پہ کرتا ہوں چندے قیام بھی — جوہر کی اپنے قدر جہاں دیکھتا ہوں میں
نفرت غرور و کبر سے ہے، کاہلی سے ہے — اُن کا جہاں عمل ہو، وہاں سے اُٹھا ہوں میں

اِس مملکت میں میں نے گزاری ہیں مدتیں — سچ پوچھیے تو ہند میں پیدا ہوا ہوں میں

جنت نشاں یہی ہے پُرانا وطن مرا

پروردہ ہوں اِسی کا، اسی میں بڑھا ہوں میں!

پالا اسی نے دامنِ شفقت میں ہے مجھے — سائے میں اس کی مہر کے صدیوں رہا ہوں میں

یونان و مصر میں بھی پھرا مدتوں، مگر — جس ملک میں گیا ہوں یہیں سے گیا ہوں میں

گنگا کے یہ کنارے، ہمالہ کی چوٹیاں — تھے میری سیرگاہ، اُنھیں جانتا ہوں میں

یورپ میں آج کل ہیں مرے قدرداں مگر — واں صرف حرفِ مادۂ بے بقا ہوں میں

بھارت ورش میں جب تھے مرے دن عروج کے

اُس وقت کیا تھا، آہ! مگر آج کیا ہوں میں!

جس رنگ میں ہوں خیر، وہی رنگ خوب ہے — ظاہر ہوں جس ادا میں، بہت دلربا ہوں میں

کچھ ذوقِ دید ہے، تو جوانانِ زندہ دل — دیکھو مجھے کہ شاہدِ رنگیں ادا ہوں میں

ایسے مرے نصیب کہاں ہیں جو اس کو — مجھ میں وہ رس ہی لاکھ مزے دل کا مزا ہوں میں

رکھتا ہوں اپنے طالبِ صادق کو شادکام — مائل کوئی مرا ہے تو اُس پر فدا ہوں میں

رہتا ہوں مثلِ مردمکِ چشم آنکھ میں!

مِٹتا نہیں ہوں دل سے، وہ نقشِ وفا ہوں میں!

ہر ملک، ہر دیار میں عالم کی قدر ہے — سارا زمانہ دوست ہی، گر آشنا ہوں میں

بُوڑھوں میں یہ کہتا ہوں میں جوانوں کی آن بان — وہ ہاتھ ناتواں نہیں، جس میں عصا ہوں میں

مفلس نہیں رہا کہیں طالب کوئی مرا — میں کوہِ زر ہوں، کانِ گہر، کیمیا ہوں میں

اقبال جس کو کہتے ہیں پروردہ ہے مرا — کیا سایۂ ہُما ہے، ہما کا ہما ہوں میں

یورپ کو دیکھیے کہ ہے دولت سے مالامال

وہ غوطہ زن ہے مجھ میں کہ بحرِ سخا ہوں میں!

محتاج ہر ہنر ہے مرا، اور ہر ایک فن — میں ابتدا کمال کی ہوں، انتہا ہوں میں

خاک، آب، باد، و آتشِ سرکش بدیں جلال — سب میرے زیرِ حکم ہیں فرماں روا ہوں میں

رستے بنائے میں نے پہاڑوں کو چیر کر — ہمدم ذرا جو انجنیئر کا ہوا ہوں میں

مثلِ زمیں بنے ہیں سمندر پہ شاہراہ — بیڑے کو خوف کیا ہے، اگر ناخدا ہوں میں

ادنیٰ سا ہے کرشمہ، تعجب ہے آئیں گیا — لے کر اگر بشر کو ہوا میں اڑا ہوں میں

لونڈی ہے میری بَرق، بخارات ہیں غلام

دونوں سے تار، ریل کو چلوا رہا ہوں میں!

ظاہر نظر فریب ہے، باطن ہے دلپذیر — ہر رنگ اور روپ میں جلوہ نما ہوں میں

موجود ہر الاپ میں ہوں، ہر خیال میں — ہوں شاعری کہیں، تو کہیں فلسفہ ہوں میں

میں ہوں کہیں نقوشِ ریاضی میں جلوہ گر — منطق کے سلسلوں میں کہیں لوٹتا ہوں میں

پیدا کروں ہیں شیکسپیئر اور والمیک — ہے لطف گر معاونِ طبعِ رسا ہوں میں

اظہارِ امرِ واقعی محروم کر دیا

ورنہ نہ خودفروش، نہ کچھ خودنما ہوں میں!

(جون ۱۹۱۱ء)

ترغیبِ سفر

بوئے چمن اگرچہ پریشاں سفر سے ہے — لیکن مشامِ خلق پہ احساں سفر سے ہے
گُل زینتِ گلوئے حسیناں سفر سے ہے — عزّت کا باغِ دہر میں ساماں سفر سے ہے
باہم مزاجِ خام خیالاں سفر سے ہے
تکمیلِ پختہ کاریِ انساں سفر سے ہے!

گھر میں جو اپنے بستۂ زنجیرِ دم ہوا — دیوانہ پیشِ اہلِ خرد وہ بشر ہوا
دشوار جس کی چاہ میں ذوقِ سفر ہوا — انساں کو مثلِ خانۂ زنداں وہ گھر ہوا
آزادہ رَو نہیں ہے، جو ترساں سفر سے ہے
تکمیلِ پختہ کاریِ انساں سفر سے ہے!

دیکھو زمیں پہ گردشِ شام و پگاہ کو — یا پھیرو سوئے عالمِ بالا نگاہ کو
کب ہے قرار انجم و خورشید و ماہ کو — ہر وقت قطع کرتے ہیں غربت کی راہ کو
کُل انتظامِ عالمِ امکاں سفر سے ہے
تکمیلِ پختہ کاریِ انساں سفر سے ہے!

سمجھے کوئی فراستِ اہلِ فرنگ کو
ہر بحر کے دیکھتے ہیں یہ عالم کے رنگ کو
آخر ملا کے سلسلۂ صلح و جنگ کو
لیتے ہیں ہند سندھ کو اور روم و زنگ کو

یورپ جہاں کشا و جہاں بانِ دہر ہے
تکمیلِ پختہ کاریِ انساں سفر سے ہے!

نت دیکھتی ہے آنکھ نظارے نئے نئے
شہر و دیار و مرغزار سارے نئے نئے
دریا نئے اور اُن کے کنارے نئے نئے
باقی ہے صبح و شام اُبھارے نئے نئے

دل لحظہ لحظہ تازہ و فرحاں سفر سے ہے
تکمیلِ پختہ کاریِ انساں سفر سے ہے!

مقصود قطرہ جوہرِ قابل وطن میں ہے
شبنم بنے تو نیستی قسمت چمن میں ہے
خوں دلِ حقیقی کا اسی غم سے بن گیا ہے
اور نافہ داغِ حسرت قسمت ختن میں ہے

تاجِ شہی پہ گوہرِ غلطاں سفر سے ہے
تکمیلِ پختہ کاریِ انساں سفر سے ہے!

باذوقِ دل تو دید کے قابل ہیں بحر و بر
بیٹھے رہو نہ دیدۂ بینا کو موند کر
درپیش سب کو گلشنِ عالم سے ہے سفر
رہتا نہیں کبھی ثمرِ پختہ شاخ پر

ہے کچھ اگر تو خام کو نقصاں سفر سے ہے
تکمیلِ پختہ کاریِ انساں سفر سے ہے!

شراب

فریبِ دہر نے تدبیرِ جانستانی کی
کہ شکل آگ نے کی اختیار پانی کی

ہوئے بلاکشِ مستی سُرور کے جویا
کبابِ نارِ جہنم ہیں نُور کے جویا

یہ آب وہ ہے کہ جس کے حباب شعلے ہیں
یہی تو آتشِ مے کے حباب! شعلے ہیں

جگر کو، جان کو، دل کو جلا کے چھوڑتی ہے
بشر کو کوئلہ آخر بنا کے چھوڑتی ہے

جلا کے جوہرِ ادراک کو دھواں کر دے
دماغ کو وہ اُبالے کہ نیم جاں کر دے

مقامِ حیف ہے اُن کی یہ ابلہی، افسوس
کہ آگ سے ہیں بجھاتے یہ تشنگی، افسوس

نہ حُور ہے، نہ یہ کوئی پری ہے شیشے میں
رہے خیال کہ آتش بھری ہے شیشے میں

ذلیل کرتی ہیں آخر شرارتیں اس کی
یہیں دکھاتی ہیں دوزخ حرارتیں اس کی!

بن آئی مرتے ہیں اکثر جو اس پہ مرتے ہیں ۔۔۔ جہاں سے عین جوانی میں وہ گزرتے ہیں
نہیں ہے پھول یہ ہرگز، ہزار گلگوں ہو ۔۔۔ کہیں نہ ذوقِ بہارِ شباب کا خوں ہو
عدوِ آبرو و ننگ محض نام اس کا ۔۔۔ سنے نہ کوئی شرارت بھرا پیام اس کا
یہی بناتی ہے دیوانہ ہوشیاروں کو ۔۔۔ گلی گلی میں گراتی ہے وضعداروں کو
یہ سر پہ جن کی طرح جب سوار ہوتی ہے ۔۔۔ ہزار ہو کوئی عاقل تمیز کھوتی ہے
ہم اس کو مایۂ فسق و فجور کہتے ہیں ۔۔۔ جو بات کہنے کی ہے، وہ ضرور کہتے ہیں

اگر ہے تلخ، تو سم سے بری ہے مشفقِ من
اگر ہے میٹھی تو میٹھی چھری ہے مشفقِ من!

۱۹۱۱ء

نوجوانو! شراب سے بچنا!

نوجوانو! شراب سے بچنا ‏ ‏ ‏ ‏ اُثرِ زہرِ ناب سے بچنا

آبِ آتش لباس ہے یہ مے ‏ ‏ ‏ ‏ سنگ ہے آب و تاب سے بچنا

اِس سے کب دل کی پیاس بُجھتی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ہاں! فریبِ سراب سے بچنا

میکدہ یہ نہیں، جہنّم ہے ‏ ‏ ‏ ‏ دُور رہنا! عذاب سے بچنا

نہیں بوتل میں آب، خنجر ہے ‏ ‏ ‏ ‏ تیغِ بُرّاں کی آب سے بچنا

کہیں کر دے نہ خانماں برباد ‏ ‏ ‏ ‏ اِسی خانہ خراب سے بچنا

مُنہ لگا کر اسے نہیں ممکن ‏ ‏ ‏ ‏ بوسہ ہائے کِلاب سے بچنا

مے کشی ہے خدا کو نامنظور ‏ ‏ ‏ ‏ آسمانی عتاب سے بچنا

پندِ مخدوم پر عمل کرنا

نوجوانو! شراب سے بچنا!

دورنگیٔ زمانہ

عجب مختلف ہے زمانے کی حالت — نہ دیکھا کسی کے برابر کسی کو
بنایا ہے خود خالقِ دادگر نے — معزّز کسی کو محقّر کسی کو
کسی کو چڑھایا ہے عرشِ بریں پر — گرایا ہے فرشِ زمیں پر کسی کو
کسی کو سکونِ شبِ ماہ بخشا — کیا صورتِ برقِ مضطر کسی کو
رُلایا کسی کو ہے شبنم کی صورت — ہنسایا ہے مثلِ گُلِ تر کسی کو
کسی کو دیئے اشکِ غم، زخمِ حسرت — فراواں دیئے لعل و گوہر کسی کو
بٹھایا کسی کو سرِ گنجِ دولت — پھرایا گدائی میں دردر کسی کو
مرصّع ہے اشکوں سے دامن کسی کا — ملی موتیوں کی ہے جھالر کسی کو

کیا ہے کسی دل کو نرمی میں پانی — دیا ہے عوض دل کے پتھر کسی کو
کسی کو ملی کلفتِ شامِ ہجراں — ملی راحتِ وصلِ دلبر کسی کو
کسی کا ہے خونِ جگر پر گزارا — دیا بادۂ ناب احمر کسی کو
کسی کو ہے آئینہ سیما بنایا — بنایا ہے حیران و ششدر کسی کو
بھٹکتا ہے کوئی کوئے گمرہی میں — بنایا ہے اوروں کا رہبر کسی کو
کوئی اس جہاں کو سمجھتا ہے دوزخ — یہ دُنیا ہے فردوس منظر کسی کو

غرض اپنے کئے کے مطابق
جو تھا جس کا حق مل گیا ہے کسی کو!

اُستاد

اِدھر ہے جہل، اُدھر علم، درمیاں اُستاد
وسیلۂ خرد آموزیٔ جہاں اُستاد

ازل سے وارثِ میراثِ انبیاء ہے یہ
بلند مرتبہ ہے زیرِ آسماں اُستاد

نہاں ہیں فطرتِ انساں میں جوہرِ عالی
ہُنر سے اپنے ہے کرتا اُنھیں عیاں اُستاد

ہے ذمّے تربیت اس کے جو نونہالوں کی
چمن میں قوم کے ہے مثلِ باغباں اُستاد

ہر ایک نسل کو اک کارواں اگر کہیے
تو ابتدا ایں ہے سالارِ کارواں اُستاد

ہے پہلی منزلِ ہستی میں خضرِ راہِ حیات
نکو خصائل و ہمدرد خوش بیاں اُستاد

دل و دماغ کرے گا کسی کے روشن کیا
نہ دل کو اپنے جلائے جو شمع ساں اُستاد

پڑھا سکا نہ وہ کچھ بھی، بٹھا سکا نہ اگر
دلِ تلامذہ پر نقشِ جاوداں اُستاد

جو اک نگاہ سے کرتے تھے خاک کو اکسیر
کہاں گئے وہ مُعلّم، وہ مہرباں اُستاد

دلوں کی ہوتی تھی تعلیم فیضِ دل سے کبھی
زباں ہی آج تو شاگرد ہے زباں اُستاد

ابھی مقاصدِ تعلیم سے ہیں دُور بہت
اگرچہ پاس کراتے ہیں امتحاں اُستاد

کرے گا تشنہ دہانوں کو وہ جبھی سیراب
ہو علم و فضل کا دریائے بیکراں اُستاد

نثار اُس کے لڑکپن پہ ہے جواں بختی
بلا ہے جس کو نکو خو و مہرباں اُستاد!

بچّوں کا ہفتہ

رُباعی

بچّے ہیں قوم کا اہم سرمایہ
یہ کم ہوں تو قوم بھی ہے کم سرمایہ
لاکھوں معصوم مرتے ہیں یاں ہر سال
صدیوں سے کھو رہے ہیں ہم سرمایہ

اُن کی حالت پہ نظر رکھتے نہیں اہلِ وطن
حیف صد حیف کہ ہیں ہند کے بچے بے حال

بے خبر ان سے ہیں گلزارِ وطن کے مالی
بن کھلے اس لئے ہو جاتے ہیں غنچے پامال

ننھی جانوں کو اجل دیتی ہے تکلیفِ سفر
راہیِ مُلکِ عدم ہوتے ہیں لاکھوں ہر سال

مُلک میں یُوں تو مُروّج ہیں مسائل کتنے
کبھی اُٹھتا ہی نہیں ان کی حفاظت کا سوال

قوم کے بچّے ہیں کیا، قوم کا سرمایہ ہیں
اس میں گنجائشِ انکار، نہ شک کی ہے مجال

کتنی قیمت کا ہے یہ بیش بہا سرمایہ
پُوچھئے اُن سے جو قومیں ہیں جہاں میں خوشحال

فکر ہیں سُود و زیاں کی ہو جسے دیکھئے یاں
قابلِ غور نہیں کس لئے پھر راس المال

حیرت افزا ہیں یہ اطوارِ مآل اندیشی
کوڑیاں کرتے ہیں جمع اور گنواتے ہیں لال

بچے اِس ملک میں ماں باپ کے ہوتے افسوس
بے کسی کی نظر آتے ہیں سراپا تمثال

نہ اُنھیں ملتے ہیں موسم کے مطابق کپڑے
نہ غذا پر ہے توجّہ، نہ صفائی کا خیال

تربیت کی ہے یہ حالت کہ وہی چل نکلے
اتّفاقاتِ زمانہ نے چلا دی جو چال

کسی نزدیک کے مکتب میں بٹھا دیتے ہیں
گھر پہ جب اُن کی شرارت نظر آتی ہے وبال

کبھی بے جا ہے محبت، کبھی بے طَورِ عتاب
یہ وہ باتیں ہیں بگڑ جاتے ہیں جن سے اطفال

جب کبھی مجمعِ اطفال پہ پڑتی ہے نظر
بیشتر یاس فزا ہوتی ہیں اِس میں اشکال

بچۂ میش کی مانند نظر آتے ہیں سُست
چاہیئے یُوں کہ ہوں اُس عمر میں مانندِ غزال

دیکھ کر ہند کے بچّوں کا یہ حالِ ابتر!
ایک خاتونِ نکو دل کے ہوا دِل کو ملال

کر دیا سال میں ہفتہ جو مقرّر اُس نے
پئے اطفال یہ ہفتہ ہے غنیمت فی الحال

رفتہ رفتہ کبھی آ جائے گا ایسا بھی دَور
وقف ہو جائے گا ہر لحظہ برائے اطفال!

حسن اور زیور

نسرین و گل کے حسن کا گہنا ہے سادگی
سو زیوروں کا زیور زیبا ہے سادگی

محتاج زیوروں کا اگر ہے، تو حسن کیا
لعل و گہر کا دستِ نگر ہے، تو حسن کیا

دیکھے تو ماہتاب میں کوئی صفائے حسن
زیور بغیر کتنی ہے شانِ غنائے حسن

تاروں سے حسنِ شب ہے فزوں، کیا مگر ہیں یہ
زیور نہیں ہیں، رات کے لختِ جگر ہیں یہ!

زیور سے ہو نہ طالبِ افزائشِ جمال
کچھ اور ہے ذریعۂ آرائشِ جمال

حسنِ عمل سے روح کو اپنی نکھار تُو
پھر دیکھ حسنِ روکشِ گل کی بہار تُو!

ہے حسن مستعار، نہ زر سے نہ سیم سے
دے رخ کو تابِ جلوۂ حسنِ قدیم سے

تیرے عمل حسیں ہیں تو بیشک حسیں ہے تُو
گو رشکِ ماہتاب بظاہر نہیں ہے تُو!

خیال

خیال پردۂ باطن میں کام کرتا ہے!
اسی کا عالمِ ظاہر میں نقش اُبھرتا ہے!

خیال پہلے بنا، اس کے بعد بات بنی
خیالِ خالقِ مطلق سے کائنات بنی!

نظر فروز ہیں جتنے مناظرِ زیبا
ہوئے بصورتِ اوّل خیال میں پیدا

جہاں میں جتنے ہیں ایوان و قصر نقش پذیر
کھچی خیال میں پہلے ہر ایک کی تصویر

جو آکے دہر کے صنعت کدے میں چلتی ہے
وہ کل خیال کے سانچے میں پہلے ڈھلتی ہے

نہ ہوتی اوجِ فضا پر خیال کی پرواز
تو آج ہم کو نہ آتے نظر ہوائی جہاز

زہے خیالِ مصوّر کی جلوہ آرائی
عیاں ہے صفحۂ کاغذ پہ شانِ رعنائی

فقط خیال سے صاحب کمال ہے شاعر
ہے سچ تو یہ کہ طلسمِ خیال ہے شاعر

کبھی مرقعِ عبرت کبھی ہے بزمِ سُرور
جہاں کی شکل وہی جو خیال کو منظور

ملی خیالِ وطن سے غریب کو تسکیں
خیالِ یار سے ہجراں نصیب کو تسکیں

خیال بیج ہے اعمال کے درختوں کا
خیالِ نیک وطیرہ ہے نیک بختوں کا!

حیاتِ جاوید

زندگی راحتِ دوام نہیں　　زندگی رنج و غم کا نام نہیں

مطلقاً اپنے واسطے جینا　　باعثِ ہستیٔ دوام نہیں

زندگی ہے تو ہے وہی اے دل　　جس میں نفسانیت کا نام نہیں

نہیں سالوں پہ کچھ مدارِ حیات　　موت پر زندگی تمام نہیں

گو نفس قاطعِ حیات ہوا　　پھر بھی یہ تیغ بے نیام نہیں

خاص بندوں کو ہے بقا حاصل　　ذکرِ محرومیٔ عوام نہیں

بعدِ مُردن بھی زندہ ہیں یہ لوگ　　اِن کی صبحِ بقا کو شام نہیں

چشمِ ظاہر سے گو ہوئے پنہاں　　دل میں کیا کر چکے قیام نہیں؟

ذکرِ جم ہے ہر ایک محفل میں　　　جم نہیں آج اور جام نہیں

زندہ ہیں جن کے نام جیتے ہیں
مر کے بھی وہ مدام جیتے ہیں!

ہاں سُن اے زندگی کے شیدائی　　　چھوڑ اندیشۂ من و مائی
رہِ خدمت میں باندھ کس کے کمر　　　چاہتا ہے اگر توانائی
لازمی ہے رضائے خالق کو　　　خدمتِ خلق سے شناسائی
حسرتِ آبِ زیست میں کتنی!　　　کی سکندر نے دشت پیمائی
لے گیا وہم اس کو تا ظلمات!　　　خواہشِ دل مگر نہ بر آئی
خاک سمجھا وہ رازِ ہستی کو　　　تھا وہ صحرا نورد سودائی
جس کو کہتے ہیں چشمۂ حیواں　　　وہ یہی کارِ خیر ہے بھائی
زندگی اس سرائے فانی میں　　　جس نے پائی اسی سے ہے پائی
ذکر ایسوں کا ہے حیات افزا　　　موجبِ جرأت و شکیبائی

روشنی کے یہ ہیں وہی مینار
جن سے اقوام کے ہیں بیڑے پار!

سیرِ گُلستاں

(حضرت شیخ سعدی کی گلستاں سے چند اشعار کا ترجمہ)

۱

کیا نامدار زیرِ زمیں دفن ہو چکے! ہستی کا جن کی روئے زمیں پر نشاں نہیں
اُس پیر لاشہ کو جو کیا دفن خاک میں یوں خاک کھا گئی کہ کوئی استخواں نہیں
زندہ ابھی ہے عدل سے نوشیرواں کا نام مُدّت ہوئی اگرچہ کہ نوشیرواں نہیں
نیکی کرو جہاں میں غنیمت ہے زندگی وہ دن نہیں ہے دُور کہ جب تم یہاں نہیں

۲

سُنا ہے کہ پیارے خدا کے جو تھے نہ کرتے تھے وہ دشمنوں کو بھی تنگ
میسر ہو کیوں کر تجھے یہ مقام کہ تُو دوستوں سے بھی کرتا ہے جنگ

۳

ایک احمق اگر ہو محفل میں — ہوں گے دانا کئی خفا دل میں
حوض اگر اک گلاب سے ہو بھرا — ایک کُتّا پلید کر دے گا

۴

ہیں تری خوبیاں ہتھیلی پہ — عیب پنہاں بغل میں ہیں لیکن
کھوٹے پیسے سے، آخر اے مغرور — کیا خریدے گا مفلسی کے دن؟

۵

نہیں ہے مرد وہ دانا کے نزدیک — لڑائی جو کرے پیلِ دماں سے
حقیقت میں وہی ہے مرد پورا — ہو جب غصّے، نہ بولے بدزباں سے

۶

اسی اُمید میں گزری دریغ عمرِ عزیز — کہ دل میں جو ہے، وہ پوری ہو آرزو میری
اُمید ہو گئی پوری، ہوئی تو کیا حاصل — نہیں اُمید کہ واپس یہ عمر ہو میری

۷

اک دوسرے کے عضو ہیں انساں ہیں جس قدر — اک خانداں سبھی کا ہے، اک اصل، اک گُہر
اک عضو کھا کے چوٹ اگر بے قرار ہو — جو دوسرے ہیں پھر اُنھیں کیسے قرار ہو
اوروں کے درد و غم سے تو بے غم اگر رہے — زیبا نہیں کہ کوئی تجھے آدمی کہے

۸

پیٹ کو رکھ طعام سے خالی — کہ نظر آئے معرفت کا نور
تو ہے حکمت سے اس لیے خالی — کہ ہے کھانے سے ناک تک معمور

۹

اک شخص مدرسے کو گیا خانقاہ سے — توڑا وفائے صحبتِ اہلِ طریق کو
پوچھا یہ میں نے عالم و عابد میں کیا ہے فرق — کیوں تو نے اختیار کیا اس فریق کو
بولا، وہ اپنی جان بچاتا ہے موج سے — اور اس کی ہے یہ سعی کہ پکڑے غریق کو

۱۰

جو عالم کہے اس کو دل سے سنو — نہیں ہے وہ عامل، بلا سے نہ ہو
سنو، قول یہ کچھ بھی بیجا نہیں — کہ سوتے کو سوتا جگاتا نہیں
سدا ہو نصیحت سے تم بہرہ ور — لکھی گو نصیحت ہو دیوار پر

۱۱

ہاتھی کو گو پچھاڑ دے اک مرد پہلواں — مردی نہیں ہے اس میں اگر مردمی نہیں
عاجز ہے خاک، خاک سے آدم کی ہے سرشت — جس میں کہ عاجزی نہیں وہ آدمی نہیں

۱۲

رہا نہ حاتم طائی مگر قیامت تک — رہے گا نام بلند اس کا دہر میں مشہور
زکوٰۃ مال کی دے، کیوں کہ فصلۂ رز کو — جو کاٹتے ہیں تو دیتا ہے وہ بہت انگور

(۱۳)

زور آوری و مردی کے دعوے کو چھوڑ دے — جو نفس کا غلام ہے، عورت ہے، مرد ہے
کیا مرد وہ، منہ کسی کا جو مکے سے توڑ دے — میٹھا کسی کا منہ جو کرے، بس وہ مرد ہے

(۱۴)

چپ ہے جب تک آدمی، پردے میں ہے — گفتگو سے کھلتے ہیں عیب و ہنر
بند مٹھی میں دھری ہے چیز کیا — کون بتلائے، کسی کو کیا خبر

(۱۵)

اے میر، تجھ کو نانِ جویں ناپسند ہے — جس کو عزیز ہے جو تیری نظر میں ہے زشت
اہلِ بہشت کے لئے اعراف ہے سقر — اہلِ سقر سے پوچھ کہ اعراف ہے بہشت

(۱۶)

کر غرض اندازے کی جب لڑائی — سمجھ لے تو کہ شامت تیری آئی
جو دشمن پر چلایا تیر تو نے — نشانہ اس کا ہے خود یہ سمجھ لے

(۱۷)

جس کو ملی ہے قوتِ بازو و مرتبہ — شایاں نہیں کہ لوگوں کو لوٹے گزاف
سخت استخواں کو کوئی نگل بھی گیا تو کیا — پھاڑے گی پیٹ، اترے گی ہرگز نہ ناف

(۱۸)

خوش کیوں نہ ہو پادشاہ اس سے — لوگوں پہ کرے ستم جو کوئی

گرچاہے خدا ہو تجھ سے راضی   کر خلقِ خدا سے تو نکوئی

١٩

مسکیں گدھا اگرچہ بہت بدتمیز ہے   لیکن وہ بوجھ اُٹھاتا ہے جس دم عزیز ہے

لیکن یہاں ہیں موجبِ آزار جو بشر   ہیں وہ فضول، اُن سے تو بہتر ہیں گاؤ خر

٢٠

وہ شخص جو کہ ہر گھڑی تجھ پر کرم کرے   کر دے معاف اُس کو، کبھی گر ستم کرے

٢١

دوسروں کے عیب لے آتا ہے تیرے پاس جو   عیب لے جائیگا تیرے دوسرے کے رو برو

٢٢

دشمن کی موت پر ہو کیوں مجھ کو شادمانی   جب خود ہی بے بقا ہے میری یہ زندگانی

٢٣

کافوری شمع دن کو جلائے جو بیوقوف   ہوگا نہ شب کو تیل بھی اُس کے چراغ میں

٢٤

عالم جو کامرانی و تن پروری کرے   گمراہ خود ہے، کس کی بھلا رہبری کرے

٢٥

محتاج اُسی در کے ہیں سب مفلس و زردار   زردار زیادہ وہ جو ہیں محتاج زیادہ

۲۶

وہ ہر سو دوڑتا ہے جس کو وہ در سے ہٹاتا ہے   کسی در پہ نہیں جاتا جسے وہ خود بلاتا ہے

۲۷

اگر کرتا، جو کچھ بھول جاتا میں   تو ہوتا نیک خُو اور پارسا میں

۲۸

لوگوں کی ملاقات کو جانا تو نہیں عیب   اتنا بھی نہ جاؤ کہ وہ کہہ دیں کہ نہ آؤ

۲۹

پیچھے جو تجھ کو چھوڑ چلا، وہ شخص ترا ہمراہ نہیں
مت اُس سے لگا تُو دل اپنا جس شخص کو تیری چاہ نہیں

نکاتِ شیکسپیر

۱۔ بادشاہوں کے مصائب

رچرڈ کی زبانی

نہ چھیڑو ماجرا آرام و راحت، عیش و عشرت کا
بجا ہے ذکرِ لوحِ تربت اور گریانِ تربت کا

بجا ہے اشکِ خونیں چشمِ تر گریاں سے بہائیں ہم
اور اس خاک پر افسانۂ غم لکھتے جائیں ہم

چُنیں جلّاد اپنے اور کریں فکرِ وصیت کچھ
مگر کیسی وصیت؟ جب نہیں باقی وراثت کچھ

یہی لے دے کے جسم اپنا، یہ مشتِ خاک باقی ہے
سپردِ کنجِ مرقد اس کو کر دینا ہی کافی ہے

تمام املاک اپنی، زندگی اپنی، امیر اپنے
ہوئے سب غیر کے، اب غیرِ مرگ اپنا کہیں کس کو

اجل اپنی ہے اب یا ڈھیر وہ خاکِ بیاباں کا
محافظ جو بنے گا بعدِ مردن جسمِ بے جاں کا

●

ادھر آؤ! خدارا! خاک ہی پر بیٹھ جائیں ہم
الم آگیں فسانے مرگِ شاہاں کے سنائیں ہم

ہوئے معزول بعض اور بعض کام آئے لڑائی میں
پٹے بعض اپنے مقتولوں کی روحوں کی بُرائی میں

ہوئے مسموم بعض اپنے حرم میں بیوفائی سے
ہوئے مقتول سوتے میں عذابِ انتہائی سے

خلائے تاجِ شاہی میں کہ ہے زیبِ سرِ فانی
لگائے رکھتی ہے دربار اجل، وہ دشمنِ جانی

وہاں سے خندہ زن ہوتی ہے شوکت اور صولت پہ
ذرا سی دیر دے کر فرصتِ اظہارِ کروفر

ہوائے کبر و نخوت سے سرِ ناداں کو بھرتی ہے
یہ مشتِ خاک دعویٰ آہنی ہونے کا کرتی ہے

اجل اپنی ظرافت ہائے جور آگیں سے خوش ہو کر
چبھو دیتی ہے اس دیوارِ قصرِ تن میں اک نشتر

نہ شاہنشاہ رہتا ہے، نہ وہ اجلالِ سلطانی
نہ آدابِ جہانگیری، نہ آئینِ جہانبانی

ادب بولا ہر کے ننگے سر بیجا میرا جو لاتے ہو
مری تکریم سے تکریم کا خاکہ اڑاتے ہو

یہ تکریم دھرا اسم چھوڑ دو، جانا نہیں تم نے
حقیقت کو مری ہستی کی پہچانا نہیں تم نے

تمہاری طرح آب و نان پہ میرا بھی گزارا ہے
مجھے بھی غم سے ایذا ہے، فلاکت ناگوارا ہے

ضرورت ہے احبا کی، مطیعِ شادی و غم ہوں
یہ کہنا سخت بےجا ہے، کہ میں سلطانِ عالم ہوں!

جُنبش پذیر زور سے ہوتا نہیں ہے گم — ہوتا ہے خود یہ صورتِ ابرِ کرم چکاں
رُوئے زمیں پہ از طرفِ اَوجِ آسماں!

یہ رحم ہے دو گونہ سعادت سے سرفراز — اک وہ سعید جس کی طرف سے ہوا عیاں
اور دوسرا وہ، جس کو کیا اس نے شادماں!

طاقتوروں میں طاقتِ اعلیٰ یہی تو ہے — شاہوں کے واسطے ہے بہ از تاجِ زرفشاں
ہے اس سے زیب و زینتِ شاہانِ ذی نشاں!

مظہر ہے اقتدارِ مجازی کا وہ عصا — دہشت بھی ہیں جس کو میسر ہے عزّ و شاں
بے شبہ ہے وہ سطوت و جبروت کا نشاں!

لیکن عصا سے رحم کا ہے مرتبہ بلند — نسبت عصا کو ہاتھ سے ہوتی ہے بیگماں
اور رحم تختِ دل سے ہے شاہوں کے حکمراں!

ہے رحم وصفِ خاص خداوندِ پاک کا — جب اُس کا جلوہ ساتھ ہوا عدل کے عیاں
پیدا وہیں بشر میں ہوئی شانِ قُدسیاں!

۳۔ پیٹ اور دیگر اعضائے تن

منحرف اک دن شکم سے ہوگئے اعضائے تن
اور یوں لائے زباں پر گفتگوئے طعنہ زن

غار کی صورت ہویدا درمیانِ تن ہے تو
سست ہے اور طعمۂ دلخواہ کا مفتوں ہے تو

تو ہمارے ساتھ کس دن شاملِ محنت ہوا
اپنا اپنا کام ہم تو کرتے رہتے ہیں سدا

کوئی ہم میں دیکھتا ہے اور سنتا ہے کوئی
کوئی ہادی اور تدبیر سراپا ہے کوئی

گرمِ رفتن کوئی ہے، چھونا کسی کا کام ہے
اور انہی کاموں سے حاصل جسم کو آرام ہے

مسکرا کر پیٹ نے اُن سے کہا، اے دوستو
طیش میں آ کر نہ مجھ پر پھبتیاں ایسی کہو

اوّل اوّل مجھ میں بےشک آتی ہے ساری غذا
درحقیقت ہے یہی باعث تمھاری زیست کا

کشورِ تن کے ذخیرے کی دکاں میں ہی تو ہوں
جمع جس میں ہیں خورش، ایسا مکاں میں ہی تو ہوں

دل تمھارا اور دماغ، اے دستانِ طعنہ زن
جن کو کہنا چاہیے شاہ و وزیرِ ملکِ تن

پاتے ہیں مجھ سے غذا، دریائے خوں کی راہ سے
پوچھ سکتے ہو یہ تم اپنے وزیر و شاہ سے

اور شریانوں کی نہروں میں غذائیت تمام
بھیجتا ہوں میں، سو آتی ہے تمھارے اپنے کام

تم اگر چاہو تو مجھ سے دوں دانے دانے کا حساب
مجھ سے بیجا ہے شکایت، مجھ پہ بیجا ہے عتاب

مجھ سے لے جاتے ہو تم سب کھینچ کر ساری غذا
یہ تمھیں معلوم بھی ہے؟ مجھ میں رہ جاتا ہے کیا؟

۴۔ نیرنگِ تخیّل

دیوانہ و عاشق و سخنور — تخئیل کے سر بسر ہیں پیکر
دیوانے کی چشمِ وحشت آگیں — ہے دیکھتی ہر طرف شیاطیں
عاشق پُتلا جو وہم کا ہے! — دیو اُس کی نظر میں مہ لقا ہے
حیرت آلودہ چشمِ شاعر — ہے فرش سے تا بہ عرش سائر
تخئیل کے زادگانِ موہوم — لوگوں کی نظر سے ہیں جو معدُوم
دیتا ہے انھیں بعد لطافت — شاعر کا قلم کمالِ صورت

اشکال جو نیست ہیں سر دست
لیتی ہیں پہن وہ جامۂ ہست!

ضمیر ۵

(مذاحیہ انداز میں)

بیشک یہ چیز ہے خطرناک
کر دیتی ہو دل کے حوصلے خاک

چوری جو کرو تو روکتی ہے
جھوٹی قسموں پہ ٹوکتی ہے

ہمسائی سے آنکھ جب لڑائی
آنکھیں یہ وہیں دکھاتی آئی

شرمانا، لجانا اس کا ہے کام
لیتی نہیں پہلو میں یہ آرام

ساتھ اس کے چلے تو کوئی کیونکر
ہے روکتی سنگِ راہ بن کر

پایا رستے میں کیسۂ زر
(ہوتا ہے یہ اتفاق کمتر)

دیکھا ہی نہ تھا مجھے کسی نے
واپس دلوا دیا اسی نے

ہمدم اس کا جو ہو گیا ہے
در در میں وہ ٹکڑ گدا ہے

از بس کہ یہ چیز پُرضرر ہے
شہروں سے کی گئی بدر ہے

جو چاہتے ہیں عزت میں رہنا
مطلق نہیں رکھتے اس سے لہنا!

۶۔ اقسامِ غم

طالبِ علم و ادب کا غم نہیں ہے غم مرا! — جو کہ رشک آمیز ہے
اور غم میرا نہیں غم زمزمہ پرداز کا — جو کہ وحشت خیز ہے
غم مرا وہ غم نہیں جو دل میں دنیا داری کے ہے! — جس میں ہے بوئے غرور
غم سپاہی کا نہیں وہ غم جو میرے دل میں ہے! — ہے ہوس اُس میں ضرور
غم جو میرے دل میں ہے قانون داں کا غم نہیں! — جو کہ دانا یانہ ہے
غم نہیں وہ غم مرا دل میں حسینہ کے جو ہے! — اور جو معشوقانہ ہے
غم مرا عاشق کے دل کا غم بھی تو ہرگز نہیں! — جس میں یہ سب مختلف ہیں
پھر یہ کیسا غم ہے جس کا راز کچھ کھلتا نہیں! — آہ! خود حیراں ہوں میں

۷ نغمۂ آسمانی

کیا شان ہے فرشِ آسماں کی — پیوستہ ہیں چھتیاں سنہری
ہے خُرد تریں کُرہ بھی اس کا — مانندِ فرشتہ نغمہ پیرا
گردش میں ہیں صاف گائے جاتے — اور سُر ہیں فرشتوں سے ملاتے
ہے ایسا ہی نغمۂ نہانی — جُزوِ ارواحِ غیر فانی

جب تک ہے یہ خاکِ تن میں روپوش
محروم ہے اس سے پردۂ گوش!

۴۔ تقدیسِ نغمہ

نغمے سے سازِ ہستی جس شخص کا ہے عاری
ہوتی نہ جس پہ رقّت ہو زیر و بم سے طاری
غدر و قتال و سازش کے واسطے ہے موزوں
قلبِ سیاہ اُس کا ہے تیرگی میں شب گوں
ہر جذبہ مثلِ دوزخ تاریک و تار اُس کا
اُس پر نہ کر بھروسہ، کیا اعتبار اُس کا؟

۹ نصیحت

ہر ایک سے کیجئے محبّت　　　چند ایک پہ اعتبار لیکن
دیجے نہ کبھی کسی کو ایذا　　　طاقت میں عدو سے کم نہ رہئیے
لیکن کیجے نہ پیش دستی!

احباب کو اپنے رکھئے دائم　　　اپنے ہی حلقۂ اثر میں
یہ عیب نہیں ہی، سننے والے　　　کم گوئی پہ معترض اگر ہوں
لیکن ہے بری فضول گوئی!

۹ (۹) قناعت

تاج ہے میرا گرے دل میں نہاں!
ہو نہیں سکتا وہ ہرگز زیب سر

چشمِ ظاہر کو نظر آتا نہیں
لعل ہے اس میں نہ ہے کوئی گہر

ہے قناعت نام میرے تاج کا
جس سے ہیں محروم سارے تاجور!

۱۰ - وصلِ محبوب

اُس گوہرِ بے بہا کو پا کر
ہو جاؤں گا اس طرح تونگر

جس طرح کہ بیسیوں سمندر
ہو ریت تمام جن کی گوہر

پانی امرت ہو جن کا یکسر!
ہر ایک چٹان تودۂ زر

۱۱ - رنج میں راحت کا خیال

ہاتھوں میں اپنے آگ کو کس طرح لیجئے
دل میں خیال کرکے ہمالہ کی برف کا

بیٹھے ہوئے خیالی پلاؤ پکائیے — مٹتی ہے بھوک پیاس کہیں اس طرح بھلا

چلیے نکل کے برفِ زمستاں میں برہنہ — پھر لیجے سر میں شدتِ گرما کی کچھ ہوا!

راحت کا یوں خیال مصیبت میں رنج میں — کرتا ہے اور رنج و مصیبت کو جاں گزا

۱۲۔ صادق دوست کی پہچان

جو شخص فی الحقیقت ہو دوستدار تیرا — جب وقت آ پڑے گا ہوگا وہ یار تیرا

جب تو اداس ہوگا، آنسو بہائے گا وہ — بے خواب تو اگر ہے، سونے نہ پائے گا وہ

القصہ تیرے دل پر جو غم کا بار ہوگا — حصہ بٹا ہی لے گا، جو یارِ غار ہوگا

ایسی نشانیوں سے کر لے تمیز تو اب — یہ یار یارِ صادق، وہ یار یارِ مطلب!

۱۳۔ قرائن

فلک پہ گھر کے جب ابرِ سیاہ آتا ہے — تو اوڑھ لیتے ہیں دانا ردائے بارانی

خیالِ آمدِ سرما کسے نہیں آتا — چمن کو دیکھ کے مصروفِ برگ افشانی

غروبِ مہر پہ انکارِ آمدِ شب کو — قرینِ عقل ہے کہیے جو محض نادانی

جو ابر و باد کے طوفان اٹھ آئیں بے موسم — تو جان لو کہ ہے نزدیک قحطِ طولانی

۱۴۔ قسمیں کون کھاتا ہے

قسمیں کھاتے ہیں واعظانِ عہد
کردار سے مختلف ہے جن کی گفتار

یا کھاتے ہیں بزدلانِ بیکس قسمیں
یا وہ جنھیں جانتی ہے دُنیا عیّار

یا وہ جو ہیں ناتوانِ دل و کم ہمّت
دانستہ جو رہتے ہیں مصائب کا شکار

قسموں سے سُنائی جاتی ہیں وہ باتیں
لوگوں کو سچائی سے ہو جن کی انکار!

۱۵۔ بحرِ حیات میں ایک رَو

موجِ رواں ہے بحرِ حیات بشر میں ایک
ہنگام مدا اگر کوئی اُس پر سوار ہو

پہنچے وہ تا بساحلِ مقصودِ خرمی
طوفانِ فتنہ زائے حوادث سے پار ہو

لیکن طفیلِ طالعِ واژون جو چوک جائے
تا روزِ مرگ حسرت و غم کا شکار ہو!

۱۶۔ القابِ شاہی

ہیں فقط القابِ شاہی غرورِ شاں کے واسطے
ظاہری عزّت ہی غمہائے نہاں کے واسطے

رکھتی ہے بیتاب اُن کو اک خیالی انبساط　　جو نہیں قابو میں ہرگز آنے والی انبساط
اُن کے القاب اور تمھارے نام میں کیا فرق ہے　　فرق ہے بھی تو نمودِ ظاہری کا فرق ہے!

۱۷۔ جولیس سیزر کی لاش پر

مارک انٹونی کی زبانی

او صاحبِ اقتدار سیزر　　پستی میں پڑا ہے تو زمیں پر؟
وہ فتح و ظفر وہ شان و شوکت　　وہ فرّ و شکوہ و اوج و صولت
وہ وسعتِ ترکتاز و تاراج　　اتنے ہی میں سب سمٹ گئے آج؟

۱۸۔ بُزدلی

جو بُزدل ہیں وہ پہلے موت سے سو دفعہ مرتے ہیں　　دلاور ایک بار اس دہرِ فانی سے گزرتے ہیں
جہاں کی جن عجب باتوں کا مجھ سے ذکر کرتے ہیں　　یہ سب سے حیرت افزا ہے کہ اکثر لوگ ڈرتے ہیں
نظر جب صاف آتا ہے کہ اک دن خاتمہ ہوگا
وہ دن جب آئے گا، آئے گا، حاصل ڈر سے کیا ہوگا!

۱۹۔ دوستوں کی زبانی پیغامِ عشق

ہے دوستی معتمد بہر طور — پر عشق کا ہے معاملہ اور
ہو اپنی زباں سے اس کا اظہار — اور آنکھ ہو اپنی برسرِ کار
عاشق کے لیے یہی ہے زیبا — یہ کام نہیں پیامبر کا!

۲۰۔ فضول خواہشات

بسکہ ہیں اپنے بد و نیک سے ناواقف ہم — ہوتے ہیں اپنی مصیبت کے طلبگار اکثر
التجا کرتے ہیں جب ہم تو ہماری خاطر — کارسازانِ قضا کرتے ہیں انکار اکثر
فائدہ تیرا اسی بات میں ہے اے دلِ زار — کہ چلی جائیں دُعائیں تری بیکار اکثر!

۲۱۔ غازۂ زر

افعالِ زبوں کے زشت چہرے — نفرت سے نظر نہ جن پہ ٹھہرے
مَل لیتے ہیں جب کہ زر کا غازہ — دیتے ہیں دکھائی خوب و تازہ!

۲۲۔ تلقینِ صبر

تلقینِ صبر کرتا ہے یوں تو ہر ایک شخص
پاتا ہے دوسروں کو وہ جب زیرِ بارِ غم
رہتے نہیں ہیں پند و مواعظ کسی کو یاد
دل اپنا جبکہ ہوتا ہے وقفِ فشارِ غم!

۲۳۔ طاقت اور استعمالِ طاقت

دیو کی طاقت تنِ انساں میں ہے
بے گماں سرمایۂ صد افتخار
اس کا استعمال لیکن مثلِ دیو
آدمی کے واسطے ہے ننگ و عار!

۲۴۔ شبنم

وہی شبنم جو غنچے پر مثالِ گوہرِ غلطاں
نظر آتی تھی اِتراتی ہوئی خود اپنی قسمت پر
برنگِ اشکِ چشمِ شاہدِ گل میں نمایاں ہے
کوئی ہو اشک ریزاں جس طرح اپنی ندامت کا!

۲۵۔ محنت اور عشرت

بالشِ سنگ بھی اگر مل جائے | چین سے اُس پہ سوتی ہے محنت
نرم ہو لاکھ بسترِ سنجاب | اُس پہ بے چین ہوتی ہے عشرت!

۲۶۔ بد سرشت

ہے غذا جن کی بغض اور عناد | بر سرِ کیں ہیں اک زمانے سے
وہ نہیں چوکتے کسی صورت | اچھے اچھوں کو کاٹ کھانے سے!

۲۷۔ قدرِ شے

قدر ہم اُس کی نہیں کرتے ہیں پوری پوری | چیز جب ہوتی ہے اک پاس ہمارے موجود
ہاتھ ملتے ہیں، وہ جب ہاتھ سے جا چکتی ہے | اپنے اوصاف دکھا دیتی ہے ہو کر مفقود!

۲۸ - کارِ حسن

ہوتا ہے چمک کے کارِ حسن
یُوں تیرہ جہاں میں جلوہ افگن

جس طرح کہ دُور تک ہو جاتا
چھوٹے سے چراغ کا جھمکڑا!

۲۹ - لہو و بازی

سال بھر تعطیل بہرِ لہو و بازی ہو اگر
لہو بازی پھر گراں ہو صورتِ کارِ گراں!

۳۰ - اصلِ عادت

انساں کا یہی ہے رازِ فطرت
تکرارِ عمل ہے اصلِ عادت!

۳۱ - بہارِ اُلفت

وا دریغا! کہ بہارِ اُلفت
بے بقا مورتِ فصلِ گُل ہے!

۳۲- حاصلِ زبان

وہ مرد جس کے دہن میں زباں ہو، مرد نہیں
اگر حسینوں کو اس سے نہ کر سکے تسخیر!

۳۳- ادائیگی حق

حق اُس کا ادا ہوا سمجھ لو
جاتے ہوئے مطمئن گیا جو!

۳۴- دُنیا کا سودا

جو دُنیا کے سودے میں ہیں دل لگاتے
وہ ہیں آخرت کا نقصاں اُٹھاتے!

۳۵- خونِ گرم

جس شخص کی رگوں میں ہو خونِ گرم جوشاں
بیٹھا رہے وہ کیوں کر مانندِ نقشِ بے جاں!

۳۶۔ تلبیس

کیا عجب، بہرِ مدعا شیطان
بن کے آجائے حافظِ قرآن!

۳۷۔ آمدِ غم

پے بہ پے آتے ہیں بے طرح جب آتے ہیں غم
دوسرا رکھتا ہے، جب ایک اٹھاتا ہے قدم!

۳۸۔ غم

غم سے اکثر ٹوٹتا ہے وقت و موسم کا نظام
شام ہو جاتی ہے صبح اور صبح ہو جاتی ہے شام!

۳۹۔ تکلّف

جب کہ اندازِ محبت میں زوال آتا ہے
طورِ اخلاص تکلّف سے بدل جاتا ہے!

۴۰۔ عزّت اور ذلّت

عزّت کی خاص جائے معیّن نہیں کوئی — ذلّت کے واسطے بھی مقرّر نہیں مقام
تم اپنے فرض کو دل وجاں سے ادا کرو — عزّت یہی ہے اور یہے توقیر اسی کا نام!

۴۱۔ نام

نہیں کچھ بھی فائدہ نام سے — جسے پھول تم ہو پکارتے
اگر اس کا نام بدل بھی دو — وہی رنگ ہے، وہی اس کی بُو!

۴۲۔ عاشقی اور دیوانہ پن

اگر تم کو نہ یاد آئے کوئی دیوانہ پن اپنا — ہوا جو تم سے سرزد عشق میں جب تم ہوئے رسوا
اگر میری طرح معشوق کی توصیف کے پھندے — کبھی اپنے مخاطب کی سماعت پر نہیں ڈالے
اگر میری طرح مغلوب ہوکر دل کی وحشت سے — کبھی تم دفعتہً بزم احبا سے نہیں نکلے
تو یہ سمجھو کہ جھوٹا تھا تمھارے عشق کا سودا!

۴۳ - عروج وزوال

الوداع اے عظمت و جاہ و جلال
آدمی کا ہے یہی دنیا میں حال

آج اس کے بُوٹۂ اُمید میں
پھوٹتی ہیں نرم و نازک کونپلیں

کل دکھاتا ہے وہ پھولوں کی بہار
پر حیا اعزاز کا رنگیں نکھار

تیسرے دن آکے پڑتی ہے وہ کُہر
برگ و گل پر جو ہلاکت کی ہے مُہر

جب وہ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اب
پختہ تر ہونے کو ہے دورِ طرب

بیخ و بُن تک جا پہنچتی ہے قضا
خاک میں ملتا ہے نخلِ اُمید کا!

۴۴ - ظاہرداری

احساس نہ کچھ ہو دل میں غم کا
پھر بھی کر دیں زباں سے اظہار

یہ کام بہت کٹھن ہے، لیکن
آساں ہے برائے مردِ عیار!

۴۴ - فلسفہ

زمین و آسماں میں ہیں ابھی تک بے شمار اشیا
تمہارے فلسفے نے خواب بھی جن کا نہیں دیکھا!

۴۵ - چاند

قسم اے ماہرو مت چاند کی کھا
ہے فطرت میں تلوّن آشنا چاند
بدلتا ہے مہینے کے مہینے
نئی صورت دکھاتا ہے نیا چاند
کہیں ایسا نہ ہو تیری محبت
بنے تغییر کے افلاک کا چاند!

۴۶ - بُرے خیالات

جو ناپاک تخیّل ہے اُس پہ لعنت
ہیں نفریں کے قابل ہَوس، عیش و عشرت
ہَوس کیا ہے، اک آتشِ خونچکاں ہے
بُری خواہشوں سے جو ہوتی جواں ہے
جل اُٹھتی ہے دل میں، بھڑکتی ہے یکسر
ہوا دیتے ہیں جب خیالات ابتر!

۷۴ - مرد کی بیوفائی

آہیں نہ بھرو تم اے حسینو!　　ایسا نہ کرو، تم اے حسینو!

ہے مرد کی ذات ازل سے عیّار　　دو کشتیوں میں ہمیشہ اسوار

اس کا ہے یہی وطیرہ دائم

اک بات پہ کب رہا یہ قائم!

یادِ رفتگاں

خوابِ جہانگیر

مژدۂ عیش نسیمِ سحری لائی ہے — دوش بر دوشِ صبا نکہتِ گُل آئی ہے
بزمِ قدرت میں عجب شانِ دل آرائی ہے — وقتِ مے نوشی ہے اے شاہ گھٹا چھائی ہے

منتظر محفلِ عشرت ہے شہا! جاگ کہیں
او صبوحی کشِ مستانہ ادا! جاگ کہیں

مستی انگیز ہے کیا حُسنِ شبابِ اودی — مست بیخود ہیں کہ آئی ہے نقابِ اودی
جاگ! تجھ بن ہے نگوں جامِ حبابِ اودی — جُوئے مے کر دے رواں جو ہو جوابِ اودی

موجِ دریائے طرب موجۂ صہبا ہو جائے
پارستوں کا ترے نام سے بیڑا ہو جائے

جاگ اے شاہِ جہانگیر جہان بخشِ جہاں! — اے شہِ ملکِ سخا طبل و نشاں بخشِ جہاں
جاگ اے جانِ جہاں! روح و رواں بخشِ جہاں — کہ ترا جلوۂ دیدار ہے جاں بخشِ جہاں

ایک عالم پئے دیدار چلا آتا ہے
درِ دولت پہ جہاں تیرے کھچا آتا ہے!

آہ اِطاری ہے یہ کیا خوابِ گراں متوالے
نہیں سُنتا جو رعیّت کی فغاں متوالے

کس تصوّر میں ہے! پھرتا ہے کہاں بھٹکا ہوا متوالے
دیدۂ خلق سے کیوں ہو کے نہاں متوالے

چھوڑ کر تختِ شہی زیرِ زمیں جا سویا
بادلی کروٹ کبھی نہ عدیلوں سے، یہ اچھا سویا!

تختِ شاہانہ پہ وہ جلوہ نمائی تیری
ہائے او ظلِ الٰہی! تھی خدائی تیری

چل بسی ساتھ ترے عدل روائی تیری
بل گئی خاک میں زنجیرِ طلائی تیری

عدل و انصاف کا تیرے ہے فسانہ باقی
تو ہی باقی ہے نہ اب تیرا زمانہ باقی!

تو وہ تھا مست کہ تجھ سا کوئی ہشیار نہ تھا
خلقِ خالق سے ہو غافل، تو وہ میخوار نہ تھا

عہدِ میمُوں میں ترے کوئی کبھی نادار نہ تھا
دورِ مے تھا، ستم گردشِ ادوار نہ تھا

جبکہ میخانے سے مستوں کی دُعا اُٹھتی تھی
آبِ انگور لئے ساتھ گھٹا اُٹھتی تھی!

تُو نہیں مُلک میں لیکن تری شوکت ہے وہی
سینۂ دشمنِ بدکیش میں ہیبت ہے وہی

وہی رنگت ترے پھولوں میں ہے نکہت ہے وہی
بعدِ مُردن بھی ترے نام کو عزت ہے وہی

کہ تری خاک زیارت کدۂ عالم ہے
تُربتِ پاک زیارت کدۂ عالم ہے!

(سنہ ۱۹۰۹ء)

نورجہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے　　کہتے ہیں یہ آرام گہِ نُورجہاں ہے

مُدّت ہوئی، وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے　　اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دُھواں ہے

جلوؤں سے عیاں جن کے ہوا طُور کا عالَم

تُربت پہ ہے اُن کی شبِ دیجُور کا عالَم!

اے حُسنِ جہاں سوز! کہاں ہیں وہ شرارے؟　　کِس باغ کے گُل ہو گئے؟ کِس عرش کے تارے؟

کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے؟　　ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے

یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے؟

قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے!

تجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے — غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی، نہ دری ہے

کیا عالمِ بے چارگی اے تاجوری ہے — دن کو یہیں بسرام، یہیں شب بسری ہے

ایسی کسی جوگن کی بھی کُٹیا نہیں ہوتی

ہوتی ہو، مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی!

تعویذِ لحد ہے زبر و زیر، یہ اندھیر! — یہ دورِ زمانہ کے اُلٹ پھیر، یہ اندھیر

آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر، یہ اندھیر! — اے گردشِ ایام! یہ اندھیر، یہ اندھیر!

ماہِ فلکِ حُسن کو یہ بُرج مِلا ہے!

اے چرخ ترے حُسنِ نوازش کا گِلا ہے!

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا — ہوتا ہے اثر دل پہ اِن آثار سے کیا کیا

نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا — اُٹھتے ہیں شرر آہِ شرربار سے کیا کیا

یہ عالمِ تنہائی یہ دریا کا کنارا

ہے تجھ سی حسینہ کے لئے ہُو کا نظارا!

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر — آرام لیا کرتے ہیں اِس روضے میں آکر

اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر — اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکّر

معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی

آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی!

آراستہ جن کے لئے گلزار و چمن تھے — جو نازکی میں داغ دہِ برگِ سمن تھے

جو گُل رُخ و گُل پیرہن و غنچہ دہن تھے
شاداب گُلِ تر سے کہیں جن کے بدن تھے
پژمردہ وہ گُل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے!

رہنے کے لئے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے
جو پیکرِ ہستی کے لئے رُوحِ رواں تھے
محبوبِ دلِ خلق تھے، جاں بخشِ جہاں تھے
تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے
جو کچھ تھے، کبھی تھے، مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیرِ زمیں ہیں!

دُنیا کا یہ انجام ہے، دیکھ اے دلِ ناداں!
ہاں بھُول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ، نہ وہ قصر نہ ایواں
آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں
ٹوٹا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے!

(سنہ ۱۹۱۱ء)

مرزا غالب

رسائی سے پرے ہے فکرِ رفعت آفریں تیری
ہمارے آسمانوں سے بہت اونچی زمیں تیری

ترا ہر شعر شرحِ رفعتِ رمزِ نہانی ہے
نوائے سازِ فطرت ہے صدائے دلنشیں تیری

"خسِ ایں بیشہ پہلو میزد آتش سواراں را"
رہِ نظمِ سخن میں پیروی آساں نہیں تیری

اگر ہو آسمانِ شعر پر درخشاں تری صورت
صفائی پا سکے ممکن نہیں ماہِ مبیں تیری

کہاں زیبا ہے تیرے عشق کو عشقِ بتاں کہنا
سمجھ ہی جب نہیں سکتے زباں ہرگز حسیں تیری

نہ وہ ساغر، نہ وہ ساقی، نہ وہ میخانہ ہے باقی
مگر جوشاں ابھی تک ہے شرابِ آتشیں تیری

تری رودادِ اہلِ دل کو ہے فردوسِ گوش اب تک
وہ دلی میں تری دھومیں، وہ بزمِ آخریں تیری

وہ نقشے حُسنِ پنہاں کے جو تُو نے کھینچ ڈالے ہیں
عجائب خانۂ افکار میں سب سے نرالے ہیں

فلک پیما تخیّل کو ملا جب اوج تاروں کا
ہوا آئینہ عالم آسماں کے پرزہ داروں کا

تعجّب کیا کہ اُٹھ سکتا نہیں اپنی نزاکت سے
یہ پردہ شاہدِ معنی کے رُخ سے استعاروں کا

قصیدہ گوئی میں بھی شانِ خودداری رکھی قائم
ستائش گر ہوا اک آن سے تُو تاجداروں کا

بُوئے عشقِ حقیقی داغِ دل سے تیرے آتی ہے
بظاہر گو نظر آتا ہے سودا ماہ پاروں کا

جگر کو کھود کر وہ شاہدِ رعنا تراشے ہیں
ہُوا پھر تازہ قصہ کوہکن اور کوہساروں کا

ادائے خاص سے تُو نے صلائے عام دی تھی گو
مگر پھر بھی رہا محبوبِ دل معجز نگاروں کا

ترا مضمونِ فصلِ گل پڑھے صحرا میں گر کوئی
نظر آئینہ دار آئے ہر اک ذرہ بہاروں کا

"ستائش گر ہے واعظ اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گُلدستہ ہے تیرے تخیّل کے گلستاں کا!"

نوحۂ وفاتِ سرورؔ

دل پہ بیٹھا آ کے پھر تیرِ جفائے آسماں
لے گئی کس کو اٹھا کر آہ! مرگِ ناگہاں

ہر طرف چھایا ہوا ہے کیوں خموشی کا سماں
بزمِ ہستی سے ہوئے رخصت سرورِ خوش بیاں

آہ گلچینِ اجل سے کیسی نادانی ہوئی
پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر میں ویرانی ہوئی!

آہ! اُس عالم سے تھی تجھ کو بہت دلبستگی
دل میں تیرے تھی ہمیشہ آرزو پرواز کی

یہ زمینِ پست رہنے کے ترے قابل نہ تھی
روح تیری وہ نوردِ عالمِ بالا رہی

تو تو پہنچا اپنے گھر، لیکن ہمارا کیا علاج
کچھ بتانا تھا ہمیں بھی دردِ فرقت کا علاج!

آرزو جنت کی تھی؟ ہندوستاں کچھ کم نہ تھا
سیرِ شاعر کے لئے یہ گلستاں کچھ کم نہ تھا

گنگا جمنا کے مناظر کا سماں کچھ کم نہ تھا
نہرِ زمزم و کوثر سے یہ آبِ رواں کچھ کم نہ تھا

ہند میں ساماں تھے سارے جنت الفردوس کے
کس لئے ترکِ وطن کا پھر خیال آیا تجھے!

گلشنِ ہستی سے تو گر مائلِ پرواز تھا
نغمہ ہائے دلنشیں کا چھیڑنا کیوں ساز تھا

آہ: تُو قدرت کے اعجاز کی طرح اک راز تھا
تیری ہستی پر ہمیں اے ولئے کتنا ناز تھا

باعثِ وحشت ہوئی ہے تیری روپوشی ہمیں
مائلِ فریاد کرتی ہے یہ خاموشی ہمیں!

کیٹس[1] اور شیلے پہ کی تھی نوحہ خوانی ہائے ہائے
اُن کی پُر غم داستاں تیری زبانی ہائے ہائے

وہ دلوں کے ولولے، وہ نوجوانی ہائے ہائے
اور پھر دونوں کی مرگِ ناگہانی ہائے ہائے

جام تجھ کو ساقیِ دوراں نے دیسا ہی دیا
ہائے ظالم نے بھری محفل کو تڑپا ہی دیا!

شاعرانِ خوش بیاں ہیں، اور کئی ہونگے یہاں
فکرِ عالی کبھی نہیں کمیاب زیرِ آسماں

حسن و اُلفت کی بھی سُنتے جائینگے ہم داستاں
ناں من کا بھی نکل آئے گا کوئی ترجماں

شعر کو دے گا مگر خونِ جگر سے رنگ کون؟
حُسنِ فطرت کے دکھائے گا ہمیں اندرنگ کون؟

تیرے ماتم میں ہی ساری بزمِ قدرت سوگوار
روتے ہیں گنگ وجمن مل کر گلے زار و قطار

لالۂ خونیں جگر ہے سوزِ غم سے داغدار
خاک اُڑاتی پھرتی ہی ہر کنج میں بادِ بہار

کھول کر زلفیں نہ روئے کیوں عروسِ برشگال
کون ہے اب آہ! تجھ سا واصفِ حُسنِ جمال!

---

[1] کیٹس اور شیلے انگلستان کے دو جوانا مرگ شاعر۔ دونوں اٹلی میں فوت ہوئے۔ مُعزّز ممبرود نے اپنی نظم میں ان پر نوحہ سرائی کی ہے۔ (محروم)

شاہدِ گُل اپنے جوبن کو اُبھارے کس لئے؟ سنبلِ صحنِ چمن گیسو سنوارے کس لئے؟
لہلہائے سبزہ نہروں کے کنارے کس لئے؟ سین اب کھلائے قدرت پیارے پیارے کس لئے؟

لالہ ساغر کیوں بھرے جب کوئی متوالا نہ ہو
کیا ضرورت حُسن کی جب دیکھنے والا نہ ہو!

کیا نہ اب ہوگا ترنم ریز تو ساون میں کبھی! گنگنائے گا نہ عہدِ رونقِ گلشن میں کبھی؟
کیا نہ ہوگا شامل اب بلبل کے تو شیون میں کبھی؟ لالۂ صحرا سے بولے گا نہ ہر گز بن میں کبھی؟

کیا ہمیشہ کے لئے تو بے صدا ہو جائے گا
سازِ دل بیگانۂ رنگِ نوا ہو جائے گا؟

تیرے اُن نادیدہ مشتاقوں میں جو محروم تھا جن کا دل تیری جدائی میں سدا مغموم تھا
تیرے دل میں اور کچھ ہے اب یہ کس کو معلوم تھا آہ تو بھی اک طلسمِ ہستیِ موہوم تھا

دل میں حسرت رہ گئی پہلو میں ارماں رہ گئے
اُٹھ چلا تو اور اہلِ بزم حیراں رہ گئے!

جس طرح اوجِ فلک پر کوئی مرغِ خوشنوا دامنِ ابرِ بہاری میں ہو چھپ کر گا رہا
سننے والا ہر گھڑی ہو آنکھ اُٹھا کر دیکھتا شہپرِ مرغِ نظر لیکن ہو اس تک نارسا

ہم یونہی دیدار کو تیرے ترستے رہ گئے
دیدۂ مشتاق کے بادل برستے رہ گئے!

غمِ نادر

۲۰۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو منشی نادر علی خاں نادر کاکوروی نے جہانِ فانی سے رحلت فرمائی۔ مرض الموت خناق بیان کیا گیا ہے۔ نوحے کے دوسرے شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

کلامِ نادر میں ایک دل کش خصوصیت ہے۔ اعلیٰ جذبات شاعرانہ کا اظہار دلپذیر الفاظ میں کچھ ایسے جدّت آمیز طور پر فرماتے ہیں کہ شعر تیر و نشتر کا کام کر جاتے ہیں، اور محض جذبات ہی نہیں، پڑھنے والے کو ایک روحانی لذّت ملتی ہے، اور پاکیزہ سبق حاصل ہوتا ہے۔ (محرومؔ)

مرگِ نادر کی خبر کاش! نہ آئی ہوتی
باعثِ گریہ نہ پوچھ، نہ سنائی ہوتی

اِک چہکتی ہوئی بلبل کا گلا یوں گھونٹا
ہائے او موت! تجھے موت ہی آئی ہوتی

کیسا اندھیر ہے اے بادِ فنا کے جھونکو
آہ! یہ شمع تو تم نے نہ بجھائی ہوتی

او فلک اور بھی نادر کو تو جینے دیتا
کونسی اس میں بھلا تیری بُرائی ہوتی

کب سے ہیں نالہ کشِ جورِ فنا دو معصوم
ان غریبوں کی فغاں کی شنوائی ہوتی

ندرت آمیزیِ تصویرِ تخیّل افسوس
دستِ بیدادِ اجل نے نہ مٹائی ہوتی

ہند میں آج تھا تو موجدِ نو طرزِ سخن! کوئی دن اور تری تازہ نوائی ہوتی

تیرے جذباتِ مصفّا تھے جواہر نادر کوئی دن اور یہی دولت یہ لٹائی ہوتی

ابھی تازہ تھا غمِ رحلتِ آزاد و سرور ترے سر میں تو سفر کی نہ سمائی ہوتی

مرنے والے جو بہ تعداد بڑھتے جاتے ہیں

داغ تیرے دلِ ناشاد بڑھے جاتے ہیں!

گلشنِ ہند کی رونق تھا ترانہ تیرا کون سے کنج میں اب ہوگا ٹھکانا تیرا

دیر تک تجھ کو نہ بھولیں گے زمانے والے گو بسر ہو گیا یوں جلد زمانہ تیرا

روئیں گے خم کدۂ شعر میں آنے والے چھیڑے گا پیرِ مغاں جبکہ فسانہ تیرا

ساغرِ نو میں مئے کہنۂ سرمد کی جھلک برق شعلوں میں وہی سوز پرانا تیرا

بوئے گل پھاند کے دیوارِ گلستاں نکلی بس یہی گلشنِ امکاں سے ہے جانا تیرا

زمزمہ سنجِ گلستانِ ارم ہو اب تو یا اسی باغ میں پھر گونجے ترانا تیرا

چشمِ ظاہر سے تجھے دیکھ نہیں سکتے ہم اے کہ! تھا عیدِ احبا نظر آنا تیرا

"کارسازاں[1] کہ پُر اسرار زبانت دادند

مُہرِ خاموشیِ حسرت بہ لبانت دادند"

---

[1] نادر مرحوم کا اپنا شعر ہے ؎

کارسازاں کہ پُر اسرار دہانم دادند

مُہرِ خاموشیِ حسرت بہ لبانم دادند

(سنہ ۱۹۱۲ء)

نوحہ

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے!

دیربھان، ایک نہایت ہونہار لڑکا تھا، دس بارہ سال کی عمر تھی، چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ چیچک نکلی اور امتحان کے دن ملکِ بقا کو روانہ ہوا۔ محروم کے دل پر صدمہ ہوا جس کا اظہار اشعارِ ذیل میں کیا گیا۔

آ جلد! مدرسے پہنچ لے دیربھان! آج!
تجھ کو خبر نہیں ہے کہ ہے امتحان آج

ہیں آئے بیٹھے کب سے ترے ہم سبق یہاں
آنا کبھی تھا سویرے کہ ہے روزِ امتحان

اتنی تو دیر کرنے کی عادت نہ تھی تجھے
کچھ غیر حاضری سے محبت نہ تھی تجھے

ہر روز سب سے پہلے پہنچتا تھا مدرسے
کیوں گھر پہ آج رہ گیا کیا ہو گیا تجھے؟

کھولی نہیں ہے کیا ابھی خوابِ سحر سے آنکھ — سُورج دکھا رہا ہے مریچاں اُدھر سے آنکھ

اُٹھ آنے والی رات پہ غفلت کو ٹال تُو

اب مدرسے کا وقت ہے جُزدان سنبھال تُو!

اے ویر بھان! آج تو بے طور نیند ہے — تجھ کو عبث جگاتے ہیں یہ اَور نیند ہے

افسوس! تُو تو اور ہی خوابِ گراں میں ہے — ہے رُوح اُس جہاں میں، جسد اِس جہاں میں ہے

چیچک نے آہ! تجھ کو پیامِ قضا دیا — ہم کس طرح جگائیں! اجل نے سُلا دیا

گھڑیال کی صدا بھی نہ تجھ کو جگا سکی

بانگِ طیورِ صُبح نہ کچھ کام آ سکی!

کیسی گھڑی میں آہ! تجھے آئی سیتلا — اے کاش! کرتی رحم کبھی کچھ مائی سیتلا

یوں ناشگفتہ غنچے کوئی توڑتا نہیں! — گلچینِ مرگ آہ! مگر چھوڑتا نہیں!

ہے ہے! عذابِ موت کا ننھی سی جان پر — دیکھے سے جس کے پھٹتا ہے ماں باپ کا جگر

اُمّید بھی ہے یاس کے زخمِ نہاں بھی ہیں — مصروفِ چارہ سازی بھی ہیں نوحہ خواں بھی ہیں

تقدیر اُلٹ گئی کہ دوا میں اثر نہیں! — افسوس اب علاج کوئی کارگر نہیں

بیٹھی ہے موت تاک میں بچے پہ وار ہے — اب کیا رہا کہ تیر کلیجے کے پار ہے

اب تک بھی ہے یہ وہم کہ رُوٹھا ہوا نہ ہو

شانہ ہلا رہے ہیں کہ سویا ہوا نہ ہو!

پر بولنا محال ہے اب ویر بھان کا — واقف نہیں رہا وہ ہمارے جہان کا

پڑھ کر یہاں خموشیِ جاوید کا سبق! ہے دیکھتا کتابِ بقا کا ورق ورق

ننھے سے دل میں آہ! وہ طوفانِ ذوقِ علم پہلو میں لے گیا ہے تو ارمانِ ذوقِ علم

وہ دل فزا اُمیدیں وہ بچپن کے ولولے تیرے یہ غمگسار، ترے ساتھ اُٹھ چلے

اے آہ بچپنے کی وہ معصوم حسرتیں معدوم ہوگئیں تری موہوم حسرتیں

طے ہوگئیں وہ تیری خیالی ترقیاں

وہ عمر کے مدارجِ عالی، ترقیاں!

وہ بھولی بھالی شکل ہے آنکھوں کے روبرو کمرے میں پھر رہی ہے وہ تصویر ہو بہو

اُبھرا ہوا وہ ماتھا، وہ آنکھیں غزال سی اور اُن پہ ابرؤوں کی سجاوٹ ہلال سی

آیا ہوا لبوں پہ تبسم ذرا ذرا! وہ توتلی زباں کا تکلم ذرا ذرا

بچپن کی شوخیاں وہ ادب سے رکی ہوئیں ہر وقت وہ کتاب پہ آنکھیں جھکی ہوئیں

اے وائے! تیری ظاہر و باطن کی خوبیاں چھپتے نہیں وہ، ہوتی ہیں یہ جن کی خوبیاں

ہونا ہی تھا خدا! کہ ہمیں تجھ سے پیار تھا

مرنا ہی تھا تجھے کہ بہت ہونہار تھا!

(سنہ ۱۹۱۱ء)

ماتمِ طالب

نوحۂ وفاتِ منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی

خلوت گہِ عدم سے اے وائے! ہم تو جب سے
اس منزلِ فنا میں محرومِ زار آئے

جلتے رہے جگر پر ہر روز غم کے آرے
تیغِ الم کے چرکے دل پہ ہزار آئے

گلچیں بنے تھے ہم بھی اچھے اس گلشنِ جہاں میں
ریحان و گل کے بدلے دامن میں خار آئے

جب گوہرِ مسرت کی آرزو ہوئی ہے
آنکھوں سے تابہ دامن اشکوں کے تار آئے

پامال ہو چکے ہیں سارے نہالِ ارماں
اپنی بلا سے، جائے یا اب بہار آئے

داغوں پہ داغ کھانا تیرے نصیب میں ہے
کس طرح قلبِ مضطر! تجھکو قرار آئے

اُلٹا ہے یہ مقدر ہو جائے نالۂ غم
کانوں میں اپنے جب تک صوتِ ہزار آئے

"در محفلے کہ یاراں شربِ مدام کردند
چوں نوبتے بما شد، آتش بجام کردند"

اے دل! کدھر چلا ہے؟ تسکیں کی آرزو میں
بزمِ سخن کی جانب؟ بزمِ سخن میں کیا ہے!

اُٹھ کر چلے گئے ہیں اہلِ سخن وہاں سے
محفل اُجڑ چکی ہے نقشہ بگڑ چکا ہے

آرام کر رہے ہیں خاکِ دکن میں دونوں
کیا ذوقِ دید تجھ کو داغ و امیر کا ہے؟

آزاد اور حالی ملکِ سخن کے والی
کیا یاد اُن کا مرنا تجھ کو نہیں رہا ہے؟

نادر، سرور، افق بھی کل تک سخن سرا تھے
مجلس میں آج اُن کی سناٹا چھا رہا ہے!

لے اور داغِ تازہ طالب بھی چل بسے ہیں
کہرام بمبئی میں چاروں طرف بپا ہے!

نظارگیٔ حُسنِ قدرت کے غم میں کیا کیا
دے دے کے سر سمندر ساحل پہ مارتا ہے!

نامِ جنابِ طالب عزت سخن وروں کی
بزمِ سخن کی وقعت، رونق تھیٹروں کی!

تا صبحِ روزِ محشر تابندہ جو رہے گا
یہ ہے وہ داغِ سوزاں اے لالہ زارِ ہستی

بزمِ سخن سے گرمی کافور ہو گئی ہے
افسوس! بجھ گیا ہے کس کا شرارِ ہستی

دل ہو گیا مکدر اے طالبا کہ جاں کا
دامن سے جھاڑ نکلا جب تو غبارِ ہستی

معنی پذیر تجھ کو خالق نے دل دیا تھا
تھی تیری طبعِ روشن آئینہ دارِ ہستی

وہ زندہ دل مسافر کس سمت کو گیا ہے
ملکِ عدم کدھر ہے اے رہگزارِ ہستی

گُل سے کہا چمن میں بُلبل نے "کچھ سنا ہے
تاراج کر گیا ہے کوئی بہارِ ہستی"

چاکِ جگر دکھا کر گُل نے کہا کہ میں بھی
خوں کر چکا ہوں دل کو اے دل فگارِ ہستی!

جب تک کہ ہے جہاں کو ذوقِ کلامِ طالب
زندہ رہے گا تیرا دنیا میں نامِ طالب!

نوحۂ چکبست

بپا زمینِ سخن پر ہے محشرِ شیون   گرا ہے آج کوئی آسمانِ اوجِ سخن
اماں کسی کو نہیں یُوں تو زیرِ چرخِ کہن   فلک بلند خیالوں کا خاص ہے دشمن

تُلا ہے جوہرِ عالی کو پست کرنے پہ
رہا نجوم کو بھی ڈوبنا اُبھرنے پر!

سخن طرازوں میں چکبست بے مثال رہا   شہیدِ جلوۂ معنی وہ خوش خصال رہا
متاعِ سوزِ قدیمی سے مالامال رہا   کہ شمعِ انجمنِ دانش و کمال رہا

مٹا دیا اِسے سفاک نے مٹانا تھا
کہ زد پہ تیرِ اجل کی بڑا نشانا تھا!

خموش اگرچہ ہوا وہ فدائے حبِّ وطن ۔۔۔ ہوا میں گونجتے ہیں نغمہ ہائے حبِّ وطن
نہ کیوں مناظرِ حسرت دکھائے حبِّ وطن ۔۔۔ کہ ماتمی ہے سوادِ فضائے حبِّ وطن

وطن کو تیری ضرورت تھی آہ! اے چکبست
چلا ہے، لیکے عدم کی تو راہ، اے چکبست!

دلوں کو اُنسِ نہانی تھا نام سے تیرے ۔۔۔ تڑپ تڑپ گئے جوشِ کلام سے تیرے
کوئی نہ تشنہ رہا فیضِ عام سے تیرے ۔۔۔ بقدرِ ذوق ملی سب کو جام سے تیرے

دکھا کے معنیٔ پُر نور سے پرستوں کو
مئے سخن سے کیا ہوشیار مستوں کو!

سخنوری کا تری سب سے ہے جدا آئین ۔۔۔ سخن کو رنگِ حقیقت سے کر دیا رنگین
اگر ہیں شعر نفاست میں تیرے لعبتِ چین ۔۔۔ تو شان و قر میں کوہِ گراں سے ہیں سنگین

ملا جو فیضِ ازل اس کی قدر کی تو نے
نیا وقار لیا تجھ سے نسلِ اُردو نے!

ہر ایک شعر ہے صدق و صفا کا آئینہ ۔۔۔ ہر ایک لفظ ہے حُسنِ ادا کا آئینہ
بیاں ترا ہے دلِ حق نما کا آئینہ ۔۔۔ وطن پرستی و مہر و وفا کا آئینہ

وہ جرأتِ قلب جو صفا میں تیرے روشن تھی
کبھی جو وادیٔ گنگا میں عکس افگن تھی!

کہیں ہیں گنگ و جمن کی روانیاں دلکش ۔۔۔ کہیں ہمالہ کے دامن کا ہے سماں دلکش

کہیں ہے گنگا کے کی توصیف دلستاں دلکش — ہر ایک نظم دل افزا، ہر اک بیاں دلکش

کہیں ہیں گلشنِ کشمیر کی وہ تصویریں!

ادائے حورِ جناں کی ہیں جن میں تاثیریں!

زباں پہ جب کبھی آتا تھا لکھنؤ کا نام — تو اس خیال سے ہوتا تھا خوش دلِ ناکام

کبھی تو آئے گی ایسی سعادتِ ایام — ملیں گے حضرت چکبست سے بشوقِ تمام

ملیں گے اب بھی مگر آہ! کب؟ کہاں؟ کیونکر؟

یہ راز اپنی نگاہوں سے ہے نہاں کشمیر!

ماتمِ گرامی

تصویرِ دردِ حسرت و رنج و محن ہے آج
ماتم میں آہ! کس کے عروسِ سخن ہے آج

لُٹتے تھے جس میں بادۂ شیراز کے سبو
عبرت فزا اُجڑ کے، وہ بزمِ کہن ہے آج

دنیائے شاعری میں کب آیا تھا یوں نظر
یہ ماتمی سکوت جو قفلِ دہن ہے آج

اورنگِ خسروئ سخن سے اُٹھا ہے کون؟
سامانِ شعر بندشِ "گور و کفن" ہے آج

بزمِ سخن سے کون روانِ سخن گیا
جو بیت شاعروں کی ہے بیت الحزن ہے آج

نغموں کو آہ! موت نے شیون بنا دیا
لبریزِ آہ و نالہ فضائے وطن ہے آج

ماتم کا شور کشورِ پنجاب سے اُٹھا
راہی وطن سے کونسا فخرِ وطن ہے آج

فرشِ زمیں پہ کیوں صفِ ماتم کا ہے گماں!
رحلت ہے کس کی ایک جہاں نالہ زن ہے آج

فطرت کو بھی ہے شاعرِ رنگیں بیاں کا غم
وقفِ خزاں بہارِ گل و نسترن ہے آج

ہر سمت بھرتی پھرتی ہے آہیں نسیمِ صبح!
ماتم کی لے میں نالۂ مرغِ چمن ہے آج

ہندوستاں تمام عزا خانہ بن گیا
پنجاب سے جو فورِ الم تا دکن ہے آج

نذرِ اجل ہے جانِ گرامی ہزار حیف!
رخصت ہوا وہ شاعرِ نامی ہزار حیف!

خاموش ہو گیا غزلِ فارسی کا ساز
بزمِ سخن سے اب نہ اُٹھے گی نوائے راز

اے یادگارِ حافظ و عرفی! کہاں ہے تُو
اب ہم کریں گے کس کے کمالِ سخن پہ ناز

وہ سوزِ تشنگی کو سمجھائیں گے کس جگہ
ہے جن کے دل میں ذوقِ شرابِ جگر گداز

پرتو سخن میں تھا ترے حُسنِ قدیم کا
تھے غرقِ حُسن تیری حقیقت، ترا مجاز

کی سیرِ اوجِ دل تری فکرِ بلند نے
حق نے دیا تھا تجھ کو عجب شوقِ سرفراز

سوزِ نگہ سے سنائی ہے تو نے حدیثِ دوست
جاں بخش ہر کنایہ ہے مثلِ نگاہِ ناز

حُسنِ غیور نوحہ کرے آج تو بجا!
زیبا ہے نالہ کش ہو اگر عشقِ پاکباز

عالم کو تو نے قدر شناسِ سخن کیا
کیوں نوحہ گر نہ ہوں شُعرائے سخن طراز

ایسی ہی تھی کشش کوئی باغِ نعیم کی؟
جس نے کیا وطن کی محبّت سے بے نیاز

اِس ضعف میں کیا یہ سفر اختیار کیوں؟
سنتے ہیں راہِ ملکِ عدم ہے بہت دراز

تجھ کو اُٹھا کے عالمِ بالا میں لے گئے
تھا قدسیوں کو ذوقِ نوا ہائے دلنواز

اپنے وطن میں آہ! گرامی نہ آئے گا
شاہِ دکن کا شاعرِ نامی نہ آئے گا!

طوفانِ غم
اُن نظموں کا مجموعہ جو محروم نے اپنی اہلیہ کی وفات پر لکھیں
۱۹۱۵ء

خاموش ہو گیا غزلِ فارسی کا ساز
بزمِ سخن سے اب اُٹھے گی نوائے راز

اے یادگارِ حافظ و عرفی! کہاں ہے تُو
اب ہم کریں گے کس کے کمالِ سخن پہ ناز

وہ سوزِ تشنگی کو بجھائیں گے کس جگہ
ہے جن کے دل میں ذوقِ شرابِ جگر گداز

پرتوِ سخن میں تھا ترے حُسنِ قدیم کا
تھے غرقِ حُسن تیری حقیقت، ترا مجاز

کی سیرِ اوجِ دل تری فکرِ بلند نے
حق نے دیا تھا تجھ کو عجب ذوقِ سرفراز

سو رنگ سے سنائی ہے تو نے حدیثِ دوست
جاں بخش ہر کنایہ ہے مثلِ نگاہِ ناز

حُسنِ غیور نوحہ کرے آج تو بجا!
زیبا ہے نالہ کش ہو اگر عشقِ پاکباز

عالم کو تو نے قدر شناسِ سخن کیا
کیوں نوحہ گر نہ ہوں شُعرائے سخن طراز

ایسی ہی تھی کشش کوئی باغِ نعیم کی؟
جس نے کیا وطن کی محبّت سے بے نیاز

اِس ضعف میں کیا یہ سفر اختیار کیوں؟
سنتے ہیں راہِ ملکِ عدم ہے بہت دراز

تجھ کو اُٹھا کے عالمِ بالا میں لے گئے
تھا قدسیوں کو ذوقِ نواہائے دلنواز

اپنے وطن میں آہ! گرامی نہ آئے گا
شاہِ دکن کا شاعرِ نامی نہ آئے گا!

طوفانِ غم

اُن نظموں کا مجموعہ جو محرومؔ نے اپنی اہلیہ کی وفات پر لکھیں

۱۹۱۵ء

اشکِ حسرت

یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری ہے بے طرح مترشح نظر سے بیزاری
کہاں ہے آج تمھاری وہ طرزِ غمخواری کہ بے اثر مرے نالے ہیں بے اثر زاری
یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی؟
چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی؟

ذرا تو دھیان کرو، میری سوزِ غم کی طرف چلے ہو چھاؤں میں تاروں کی کیوں عدم کی طرف
نظر اٹھاؤ ذرا میری چشمِ نم کی طرف بڑھاؤ ہاتھ نہ اے جاں مرے قدم کی طرف
مجھے تو روکتے ہو بار بار رونے سے
رکو گے کیا نہ مرے زار زار رونے سے؟

نہ کر کے جاؤ مجھے آہ! خانماں برباد نہ دیکھے جاؤ مجھے شغلِ نالہ و فریاد
رکھا ہے میں نے تمھیں اور تم نے مجھ کو شاد نہ جھیلی جائے گی ہجرِ دوام کی افتاد

کیا تھا عہدِ وفا مجھ سے عمر بھر کے لئے
ابھی سے ہو گئے تیّار کیوں اُدھر کے لئے ؟

گزرنے پائے ہیں مشکل سے پانچ سال ابھی
شباب پر ہے تمھارا تو بال بال ابھی
عُروج پر ہے عُروسانہ چال ڈھال ابھی
نہ لاؤ موت کا دل میں ذرا خیال ابھی
تمھارے مرنے کے ایّام! یہ دن نہیں ہرگز
جہاں سے اُٹھنے کو یہ سال وسِن نہیں ہرگز !

دوا دوش مری بیکار جائے گی؟ افسوس!
دُعا مری نہ کسی کام آئے گی؟ افسوس!
اجل جہاں سے تمھیں آج اُٹھائیگی؟ افسوس!
زمانہ بھر کے ستم مجھ پہ ڈھائیگی؟ افسوس!
فلک کو رحم نہ وِدّیا وتی پہ آئے گا ؟
غریب و بیکس و معصوم کو رُلائے گا ؟

لو اُٹھ کے بیٹھو کہ وِدّیا منانے آئی ہے
تمھارے مُنہ سے وہ دامن اُٹھانے آئی ہے
ادائے طفلی کوئی تو دِکھانے آئی ہے
کہ ہنستی آئی ہے، تم کو ہنسانے آئی ہے
وہ چل کے آئی ہے گھٹنوں پہ تھک گئی ہوگی
تمھارے پیار سے پھر اُس کو تازگی ہوگی !

اُٹھا بھی لو کہ بہت بیقرار ہے وِدّیا
نگاہِ مہر کی اُمّیدوار ہے وِدّیا
رہینِ سختئ صد انتظار ہے وِدّیا
نہ چھوڑ جاؤ اِسے، شیر خوار ہے وِدّیا

پکارتی ہے تمھیں آج کس قرینے سے
اُبل کے شیر ٹپکتا نہیں ہے سینے سے؟

تمھاری مادرِ ناشاد ہے سرِ بالیں! خراب حال، ستمدیدہ، خستہ و غمگیں
سُنائی دیتے نہیں اُس کے نالہائے حزیں؟ یہ خوابِ ناز ہی کیا، چونک کر اٹھو بھی کہیں

ذرا تو یاد کرو دل فگاریاں اُس کی
بھلاؤ دل سے نہ تیمارداریاں اُس کی!

وہ میری مادرِ مجبور و بیکس و بیتاب! تڑپ رہی ہو پڑی مثلِ ماہیِ بے آب
تمھیں پکار رہی ہے، اُسے بھی کچھ تو جواب کرو نہ اُس کو زیادہ قتیلِ تیغِ عذاب

اُسے ہے آج ضرورت تمھاری خدمت کی
نہ پھیر دو آنکھیں، نہیں رسم یہ صداقت کی!

کسی سے کرتے نہیں کوئی بات، وا اسفا نہ تھے تم ایسے تغافل صفات، وا اسفا
دھرے ہی رہ گئے نبضوں پہ ہات، وا اسفا کٹے گی کس سے یہ ماتم کی رات، وا اسفا

چلے ہو چھوڑ کے روتا ہوا غریبوں کو
ہمیشہ روتے رہیں گے یونہی نصیبوں کو!

خیال میرے دلِ درمند کا کرتے! شریکِ شادی و غم تھے تو پھر وفا کرتے
نہ دیتے داغِ جدائی تو کیا برا کرتے فلک سے آج نہ ہم شکوۂ جفا کرتے

چلے ہو گھر کو، مگر ہاں وہ کونسا گھر ہے
عزیز اِس سے کوئی اور بھی سوا گھر ہے؟

جو چھت سے بچّۂ گنجشک کوئی آن گرا
اُٹھا اُٹھا کے اُسے تم نے آشیاں میں رکھا
دیا ہے خوب مقدّر نے آج یہ بدلا
تمہاری گود سے گرتی ہی خاک پر دیا
کریں گے اس پہ دل و جاں نثار ہم لیکن
تمام عمر رہے گی اُداس وہ تجھ بن!

ہے یاد مجھ کو وہ پرسوں کی زیر لب فریاد
تمہاری آہ! جگر سوز، پُر تعب فریاد
دل و جگر پہ مِرے ڈھا گئی غضب فریاد
کہ کرنے والے نہ تھے تم تو بے سبب فریاد
مرض کا شکوہ نہ تقدیر کی شکایت تھی
فغاں میں ہائے! نکلتی وہ دل کی حسرت تھی!

"چلی ہوں چھوڑ کے بے پر کو آشیانے میں
کسی کا کون ہے ہمدرد اس زمانے میں
قضا کو خاک ملے گا مرے مٹانے میں
نہیں ہے عذر مجھے تو جہاں سے جانے میں
نہیں ملال کہ میرا مآل کیا ہوگا؟
یہ فکر ہے مری ودیا کا حال کیا ہوگا؟

جو میری گود سے دم بھر جدا نہ ہوتی تھی
جو میری آنکھ سے اوجھل ذرا نہ ہوتی تھی
میں اپنی بچّی پہ کس دل فدا نہ ہوتی تھی
جو رات آنکھوں میں کٹتی خفا نہ ہوتی تھی
ہے کون جو مری نازوں پلی کو پالے گا؟
کوئی تو خاک سے گوہر مرا اُٹھا لے گا!"

دردناک منظر

جاگو! اِسے اُٹھالو، سوکر اُٹھی ہے تو یا ۔۔۔ کیوں بر خلافِ عادت رو کر اُٹھی ہے وہ یا
بیتاب اس طرح کیوں ہو کر اُٹھی ہے وہ یا ۔۔۔ صبر و قرار شاید کھو کر اُٹھی ہے وہ یا
اس کو بھی غائبانہ معلوم ہو گیا ہے
خوابِ عدم میں تم ہو یا بخت سو گیا ہے!
نظروں سے آہ! کیا کیا حسرت ٹپک رہی ہے ۔۔۔ رہ رہ کے منہ ہمارا حیرت سے دیکھتی ہے
چہرے سے ہے نمایاں دل کی جو بے کلی ہے ۔۔۔ تیری تلاش اس کو اے مہربان رہی ہے
وہ گود سے ہماری۔ آخر مچل کے نکلی
جاتی ہے کس طرف کو، گھٹنوں پہ چل کے نکلی!
گھٹنوں پہ چل کے نکلی، بستر کے پاس پہنچی ۔۔۔ ننھے سے آہ دل میں کچھ لیکے آس پہنچی
کیا مطمئن سنبھالے ہوش و حواس پہنچی ۔۔۔ لیکن کچھ اس سے پہلے اے وائے! یاس پہنچی

کس کو پکارتی ہے منہ سے کفن اُٹھا کر
منزل پہ ٹھنڈے ٹھنڈے پہنچے وہ لدل اکر!

جی بھر کے دیکھ لے تو مُنہ اپنی پیاری ماں کا
موقع نہیں ہے ودیا! یہ ہوں کا اور یہاں کا

مطلب نہیں سمجھتی کیا تو مری فغاں کا
ٹوٹا ہے ہاتھ تجھ پر، بیداد آسماں کا

اب مانگتی ہے ودیا! غوں خاں کی داد کس سے
کرتی ہے بھولے بھالے دل کو تو شاد کس سے؟

ان سرو چھاتیوں میں کیا شیر ڈھونڈتی ہے
پتھر میں موم کی تو تاثیر ڈھونڈتی ہے

اب شمعِ کشتہ میں کیا تنویر ڈھونڈتی ہے
کیسے شکار ہائے! تقدیر ڈھونڈتی ہے

مُردے سے اپنی ماں کے یہ پیار کر رہی ہے
مجھ سخت جاں پہ یارب! یہ کیا گزر رہی ہے؟

ساری مصیبتوں سے ودیا! کڑی مصیبت
اُف! ہنستی کھیلتی پر یہ آ پڑی مصیبت

تقدیر نے دکھائی تجھ کو بڑی مصیبت
بے مہریٔ اجل نے کیا سر جڑی مصیبت

ہیں جان و دل مرے تو تجھ پر نثار ودیا
کچھ اور چیز لیکن ہے ماں کا پیار ودیا!

کسی کے پھول

گنگا کو جا رہے ہیں ترے اے نگار پھول
تازہ رہیں گے مثلِ گُلِ نو بہار پھول

جل بُجھ کے رہ گیا تنِ رشکِ چمن ترا
لایا ہوں راکھ سے تری چُن کر دو چار پھول

بوٹا سا قد وہ آہ! بہشتِ بریں میں ہے
جھڑ کر جہاں میں رہ گئے بے شاخسار پھول

کانٹوں سے بھی ہیں کم ترے پھولوں کے سامنے
باغِ جہاں کے او صنم گلعذار پھول

بوئے وفا و رنگِ محبت سے تازہ ہیں
یہ بے نیازِ گردشِ لیل و نہار پھول

مجبور آج یادِ دلِ ناخواستہ! دریغ
گنگا کو سونپتا ہے کوئی دل فگار پھول

واپس وطن کو جاؤں گا داغِ جگر لئے
اب تک تھے میرے پاس تری یادگار پھول

تسکیں فزا لئے خاطرِ ہجراں نصیب نے
دورِ خزانِ غم میں رہے غمگسار پھول

دھیمی تھی جس سے کچھ مرے سوزِ نہاں کی آگ — جانتے ہیں ہاتھ سے وہ دلِ داغدار پھول

تابِ سخن کہاں تھی مجھے فرطِ غم سے آج — ہوتے نہ گر سکوت شکن تازہ کار پھول

رہ رہ کے مجھ کو پھول ترے یاد آئیں گے — گلشن میں جب کھلائیگی یادِ بہار پھول

چھلتے رہیں گے آہ! مرے داغہائے دل — کھلتے رہیں گے یعنی یہاں بار بار پھول

دامانِ موجِ گنگ! نہ ہوتا تو اتنی تنگ — ہیں تازگی میں منتخبِ روزگار پھول

آغوشِ مہر کھول دے اِن کے لئے ذرا — گنگا! ترے کرم کے ہیں اُمیدوار پھول

تجھ میں سمائیں گے روشِ نکہتِ چمن — زنہار تیرے دوش پہ ہوں گے نہ بار پھول

یہ پھول وہ ہیں جن میں ہے بُوئے وفا ابھی

تازہ مشامِ جاں ہے انہی سے مرا ابھی!

ہری دوار سے واپسی پر

کسی کے پھول جو گنگا میں ہم بہا کے چلے — جگر پہ آہ! نئے داغ اور کھا کے چلے
وہ پھوٹ پھوٹ کے روئے کنارِ گنگا پر — کہ ہر پہلوئے دریا میں اک بہا کے چلے
گئی نہ حیف! کدورت دلِ مکدر سے — صفائے گنگ سے ہم خاک فیض پا کے چلے
نظر جو محملِ لیلائے انبساط آیا
مثالِ قیس بہت بن کی خاک اُڑا کے چلے!
پھرے پہاڑوں پہ سر مارتے ہم اے فرہاد — جگر پہ تیشۂ حسرت کی چوٹ کھا کے چلے
گھٹا نہ آہ ذرا بھی تو سوزِ پنہانی — پلٹ پلٹ کے نہلئے، نہا نہا کے چلے
چلے ہیں ویسے ہی جیسے کہ آئے تھے محروم
وطن کو با دلِ غم دیدہ پھر پھرا کے چلے!

قطعہ

غمِ ہجراں سے تنگ آ کر — پوچھتا ہوں یہی مقدّر سے
کر رہا ہے تو کیوں حلال مجھے — طولِ فرقت کے کُند خنجر سے
سامنے میرے کوئی دم تڑپے — اور دیکھوں میں دیدۂ تر سے!
حسرتِ مرگ ہو مگر نہ مروں — جان ہو جائے سخت پتھر سے
دیکھنے کا میں دیکھتا رہ جاؤں — جب جنازہ اُٹھے مرے گھر سے
درو دیوار سے اُٹھیں نالے — جو زیادہ ہوں شورِ محشر سے
گھر پہ چھا جائے ایک تاریکی — اثرِ دورِ نحسِ اختر سے

جا کے شمشان میں وہ تن پھونک جائے | جو ہو نازک سوا گُل تر سے
آتشِ گُل سے ہو جیسے آسیب | داغ کھائے ہجومِ اخگر سے
اور معصوم ایک سال کی جان | گر کے آغوشِ مہرِ مادر سے
خاک پر لوٹ لوٹ کر رو دے | ہوں رواں اشکِ نابِ گوہر سے
ہائے یہ واقعات دیکھوں میں | گردشِ چرخِ فتنہ پرور سے
اور کلیجہ مرا نہ پھٹ جائے | یہ بھی ہو جائے سخت پتھر سے
موت گھر میں ہو اور یوں میری | جانِ بیزار موت کو ترسے
آہ! سیلاب میں رہوں پیاسا | اور ہو سیل کا گزر سر سے
مُدّعا کیا تھا اے قضا تیرا | کچھ تو کہہ مجھ غریب مضطر سے
کیا مجھے اور بھی ہے تڑپانا | طولِ عہدِ فراقِ دلبر سے
زندہ چھوڑا ہے کس لئے مجھ کو | تُو نے دنیا میں حالِ ابتر سے
ہو گا احساں جو فیصلہ کر دے | پیشتر ساعتِ مقدّر سے
بخشتا ہوں تجھے حیات کے دن | کچھ ہیں باقی اگر مقدّر سے

شکوہ رنجِ جزا ترا ہرگز
نہ کروں گا جنابِ داور سے!

نومبر کی ایک صبح

ہوتی ہے خوشگوار نومبر کی رات کیا
وہ رات چاندنی ہو تو پھر اس کی بات کیا!

لبریز نور سے طبقِ آسماں تمام
فیضِ مہِ تمام سے روشن جہاں تمام

دلکش نظر فریب در و بام کی جھلک
ہر منظرِ شبانہ میں آرام کی جھلک

جاں بخش بعدِ شدّتِ گرما کی راحتیں
دلچسپ آمد آمدِ سرما کی راحتیں

چاروں طرف ہوا کی خموشی سکوں فزا
یکرنگئے فضا کی خموشی سکوں فزا!

ایسی ہی ایک رات تھی اور میں غریب تھا
ماتم شریکِ خاطرِ محزوں نصیب تھا

آدھی سے کچھ سوا شبِ ماتم تھی ڈھل چکی
شمعِ امید آہ! قریباً پگھل چکی

مہماں تھی کوئی دم کی مریضہ پڑی ہوئی
تقدیر نوحہ خواں تھی سرہانے کھڑی ہوئی

چہرہ کبھی جو رشکِ گلِ نو بہار تھا | اب زرد زرد برگِ خزاں دیدہ دار تھا

رہ رہ کے لے رہا تھا سنبھالے چراغِ عمر | اک داغ رہ گیا تھا سمٹ کر فراغِ عمر

ہر لحظہ برہمی وہ تگ و تازِ نبض کی | بنتا جا رہا ہر ایک نوا سازِ نبض کی

جب چارہ گر کو موت کا چارہ نہ مل سکا | مجھ کو بغیرِ یاس سہارا نہ مل سکا

حالت نگاہِ بازپسیں کی نظر میں ہے | اک تیر تھا کہ آہ! ابھی تک جگر میں ہے

حسرت بھری نگاہ کا پھرنا مری طرف | ہاتھوں کا آہ! جڑ کے وہ گرنا مری طرف

حیرت میں آج تک ہوں کہ کیوں زندہ رہ گیا
کس درجہ سخت جاں تھا کہ یہ صدمہ سہ گیا!

زنداں پہ جلوۂ شبِ مہتاب تھا ابھی | مائل بخواب دیدۂ بے خواب تھا ابھی

وہ شمع گل تھی شمعِ سحر سے بھی بیشتر | ڈوبا وہ مہ غروبِ قمر سے بھی پیشتر

سورج چڑھا قیامتِ ہجرِ دوام کا | نظروں سے امتیاز مٹا صبح و شام کا

گو دم میں اپنے کثرتِ شیون سے دم نہ تھا | غم خانہ میرا عرصۂ محشر سے کم نہ تھا!

مارا ہوا ہوں ایک نومبر کی صبح کا
ہے انتظار اب مجھے محشر کی صبح کا!

سارس کا جوڑا

کنارِ آب، دورانِ سفر میں شام پڑ جانا
مصیبت خیز تھا سارس کے جوڑے کا بچھڑ جانا
شبِ تاریکِ فرقت میں بھٹکنا ان غریبوں کا
صدا دینا، مگر قسمت کا ایسا پیچ پڑ جانا
کہ یہ اس پار لپکا اور اُڑا وہ دوسری جانب
یونہی تدبیر کا ہر بار بن بن کر بگڑ جانا!

غرض شب بھر یونہی اک دوسرے کی جستجو کرنا
مقابل کے کناروں سے وہ ان کا ہاؤ ہو کرنا
وہ آغوشِ تمنّا کھول کر مجبور رہ جانا!
وہ بیتابی سے اظہارِ وفورِ آرزو کرنا
سُنانا دُور سے وہ داستانِ شوق دونوں کا
وہ اپنی بے بسی، بیچارگی پر گفتگو کرنا!

مگر آخر نشاں مشرق میں اُڑنا نیرِ تاباں کا
اِدھر روپوش ہو جانا شبِ تاریکِ ہجراں کا

وہ صبحِ وصل کا آنا، وہ اُن کا شوق سے ملنا | غمِ دُوری کا مٹ جانا، نکلنا دل کے ارماں کا
ستائش بخت کی کرتے ہوئے اُڑنا نشیمن کو | محبّت میں نئے سر سے وہ ہونا عہد و پیماں کا!

نصیبا آہ! سارے ہی کبھی ہم نے تو بُرا پایا | کہ صبحِ وصلِ جاناں کو نہ ہرگز رُونما پایا
کبھی دم توڑ دیں گے چپکے چپکے دامنِ شب میں | ابھی سے شامِ ہجراں کو بہت صبر آزما پایا

شبِ فرقت قیامت زا، طلوعِ صبح ناپیدا
مقدر! تیرے اندازِ ستم کا مُدّعا پایا!

تمنّائے محروم

کاش! مل جائیں کہیں وہ میں دکھاؤں چیر کر
سینہ اپنا جس میں طوفانِ حسرت و ارماں کے ہیں

داغ گِن گِن کر دکھاؤں پھر دلِ بیتاب کے
یعنی وہ سارے نشاں جو صدمۂ ہجراں کے ہیں

دے اگر توفیقِ ہمّت وہ بھی کر دوں آشکار
آہ! چرکے دل پہ جو تیغِ غمِ پنہاں کے ہیں

پھر کروں میں گوہرِ اشکِ رواں اُن پر نثار
جس قدر باقی صدف میں دیدۂ گریاں کے ہیں

اور کہوں اُن سے کہ بس اب ہو چکا انجامِ ضبط
ڈھنگ وحشت آشنا میرے دلِ حیراں کے ہیں

آئیے اور کیجئے ناشادماں کو شاد پھر
کب سے میرے دیدہ و دل منتظر احساں کے ہیں

آہ! اے محروم اے محنت کشِ ایّامِ غم
ہم نے مانا تجھ پہ صدمے گردشِ دوراں کے ہیں

صبر بہتر ہے تری فریادِ ہیچ انجام سے
طور گو پُر درد تیرے نالہ و افغاں کے ہیں

تیری خاطر کون آتا ہے عدم سے لوٹ کر
یہ خیالی وسوسے تیرے دلِ ناداں کے ہیں!

اب کے بھی دن بہار کے یُونہی گذر گئے

تضمین

پھر لالہ و گلاب چمن میں نکھر گئے ‏ ‏ ‏ نالے ہزار کے ہمیں آگاہ کر گئے
صیّادوں کے آہ! دل سرِنہ ابتک اُتر گئے ‏ ‏ ‏ ہم سیرِ گلستاں کو بھی تھامے جگر گئے
اب کے بھی دن بہار کے یُونہی گذر گئے!

نالے دلِ غریب کے سب بے اثر گئے ‏ ‏ ‏ جانے سے اپنے وہ ہمیں ناشاد کر گئے
آغازِ فصلِ گل سے بہت پیشتر گئے ‏ ‏ ‏ اے طولِ انتظار! بس اب ہم تو مر گئے
اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے!

گلشن کے پھول دل پہ مرے داغ دھر گئے
کانٹے تمام آہ! جگر میں اُتر گئے
سُنتے تھے شاہدانِ لبِ جُو نکھر گئے
ہم اُن کے دیکھنے کو، بہ مژگانِ تر گئے

اب کے بھی دن بہار کے یُوں ہی گذر گئے!

فصلِ بہار دھوم سے آئی تو کیا ہوا
بُلبل اگر ہے زمزمہ پرداز مجھ کو کیا
پامالِ غم ازل سے دلِ بے قرار تھا
پس ہی گیا ہے، اب کے وہ کوہِ الم گرا

اب کے بھی دن بہار کے یُوں ہی گذر گئے!

ہو جاتے ہیں کچھ ایسے ہی ساماں بہاریں
دل کو مرے جو رکھتے ہیں حیراں بہاریں
اب کے تو مضطرب ہی بہت جاں بہاریں
یعنی ہے شغلِ ماتمِ جاناں بہاریں

اب کے بھی دن بہار کے یُوں ہی گذر گئے!

روتا ہوں گُل کے خندۂ پیہم کو دیکھ کر
کم مائیگیِ گریۂ شبنم کو دیکھ کر
کہتا ہوں چشمِ نرگسِ پُرنم کو دیکھ کر
یہ بھی ہے اشکبار مرے غم کو دیکھ کر

اب کے بھی دن بہار کے یُوں ہی گذر گئے!

کیا یاس خیز عالمِ صبحِ بہار ہے
گُل روبرو ہیں اور نہاں روئے یار ہے
تیرِ نسیم سینۂ محزوں کے پار ہے
کیسی بہار یہ مرے پروردگار ہے

اب کے بھی دن بہار کے یُوں ہی گذر گئے!

رونق ہجومِ بلبل و گُل سے چمن میں ہے
آہنگِ چنگ و جام ہر اک انجمن میں ہے
لیکن کمی کہاں مرے رنج و محن میں ہے
سوزِ نہاں سے آگ لگی جان و تن میں ہے

اب کے بھی دن بہار کے یُونہی گذر گئے !

آب وہوائے دہر نے پائی شگفتگی ذرّوں پہ خاکِ مُردہ کے چھائی شگفتگی

گلزار میں ہے تازہ نوائی ، شگفتگی لیکن ہمارے کام نہ آئی شگفتگی

اب کے بھی دن بہار کے یُونہی گذر گئے !

ہر اک روش صبا کی عروسانہ چال ہے جو نخل ہے ریاضِ جہاں میں نہال ہے

دل آہ! مثلِ سبزہ سراپا ئمال ہے اب کے برس بھی موردِ رنج و ملال ہے

اب کے بھی دن بہار کے یُونہی گذر گئے !

کیا فیض تیرے دم سے نسیمِ سحر مِلا غنچہ کبھی نہ دل کا بہ اندازِ گُل کھِلا

اپنا نصیب تھا یہی ۔ موسم کا کیا گِلا ہر سال حسبِ حال ہمارے ہے یہ دِلا

اب کے بھی دن بہار کے یُونہی گذر گئے !

محرومِ مُدّعا رہے باغِ جہاں میں حیف گذری بہارِ عُمر غمِ جاوداں میں حیف

پایا نہ فرق ہم نے بہار و خزاں میں حیف ہیں صرف دِل کے حوصلے آہ و فغاں میں حیف

اب کے بھی دن بہار کے یُونہی گذر گئے !

دِلکش گلاب ہے ، نہ سمن دلپذیر ہے گُل داغِ دل بنے ، خار کلیجے کا تیر ہے

شعر و سخن میں ذکرِ چمن ناگزیر ہے وردِ زباں یہ مصرعۂ اُستادِ میر ہے

اب کے بھی دن بہار کے یُونہی گذر گئے !

ناپائدار رشتے

کتنے ہی اُستوار ہوں ٹوٹیں گے ایک دن
رشتے یہ جتنے الفت و مہر و وفا کے ہیں

یہ مادر و پدر، زن و فرزند و اقربا
شب بھر کے میہماں ہیں مسافر سرا کے ہیں

اطرافِ مختلف سے نکل آئے ہیں یہاں
ٹھہرے سرائے دہر میں اک جا پہ آ کے ہیں

مِل جُل کے جائیں گے نہ بہم ہو کے آئے تھے
رستے نہاں نظر سے حیات و فنا کے ہیں

آب و ہوائے دہر کی تاثیرِ اُنس سے!
پابستہ یہ علائقِ بے انتہا کے ہیں

اِک دوسرے کے ساتھ لپٹتے ہیں پیار سے
سچ ہے یہ پر گھڑی گھڑی پیماں دغا کے ہیں

چاہت کا وہ طلسم سمایا ہے آنکھ میں
عمرِ دو روزہ پر اُنھیں دعوے بقا کے ہیں

سُنتے نہیں کہ پنبۂ غفلت بگوش ہیں
نقارے گرچہ بج رہے سر پر فنا کے ہیں

پستے ہیں جن میں آدمی نظروں کے سامنے
دو پاٹ عرش و فرش اُسی آسیا کے ہیں

محروم یہ تو مجھ کو بھی معلوم ہے کہ ہم
جو کچھ ہیں چلتے پھرتے کھلونے قضا کے ہیں

کرتا ہوں میں تو صبر بھی اور دل پہ جبر بھی
اشکوں کو کیا کروں کہ یہ خود سر بلا کے ہیں!

سوزِ دل

پھر دلِ سوختہ مصروفِ فغاں ہوتا ہے
ذکرِ سوزِ غم و اندوہ نہاں ہوتا ہے

کچھ خبر ہے تجھے شمشان کو جانے والے
سوزِ فرقت سے بُرا حال یہاں ہوتا ہے

خالقِ پاک تری رُوح کو ٹھنڈا رکھے!
مجھ فریاد ترا سوختہ جاں ہوتا ہے

صبح دم یاد مجھے تیری چِتا آتی ہے!
شعلۂ سُرخ جو مشرق میں عیاں ہوتا ہے

اور ہر شام تری رونقِ طلعت کے بغیر
غمکدے میں مرے وحشت کا سماں ہوتا ہے

مری آہوں سے بُوئے داغِ جگر آتی ہے
لختِ دل ساتھ لئے اشکِ رواں ہوتا ہے

ہے مرے واسطے اب گلشنِ عالم گلخن
ہر گُلِ تر پہ شرارے کا گُماں ہوتا ہے

آنچ سے آتشِ ہجراں کی ہوئی وہ صورت
جیسے تفسیدہ کوئی برگِ خزاں ہوتا ہے

پھیل جاتی ہے سرِ شام جو دھندلاہٹ سی
یہ حبیب! وہ مری آہوں کا دھواں ہوتا ہے

وہ نہیں رنگِ شفق، اوجِ فلک پر جا کر
نفسِ گرم مرا شعلہ فشاں ہوتا ہے

آستیں میں ہے نہ دامن میں، لگی ہے دل میں
عزم کس سمت کا اے اشکِ رواں ہوتا ہے

تپشِ داغ سے کرتی ہیں یہی کام آہیں
آگ پر جو اثرِ بادِ وزاں ہوتا ہے

تھا جلانا تو مجھے شمع بنایا ہوتا
یا وہ پروانہ جو محفل میں تپاں ہوتا ہے

مجمرِ دہر میں کیا خوب ہے مقسوم سپند
یہ سلگنے کا عذاب اس کو کہاں ہوتا ہے

آج محروم نکالے ہیں بہت گرم اشعار
دل جلوں کا یہی اندازِ بیاں ہوتا ہے!

روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

(تضمینِ شعرِ غالب)

ارمانِ وصالِ بُتِ گُل فام ندارد ذوقِ گُلِ رخسار دل آرام ندارد

ہیچ از ہوسِ نامہ و پیغام ندارد گفتیم بدل ایں طمعِ خام ندارد

نومیدیٔ ما گردشِ ایّام ندارد

روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد!

ابرو کا تصوّر جو مقابل نہیں ہوتا اب خنجرِ حسرت سے بھی بسمل نہیں ہوتا

رونے پہ شبِ ہجر بھی مائل نہیں ہوتا بےچین سحر کے لئے اب دل نہیں ہوتا

نومیدیٔ ما گردشِ ایّام ندارد

روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد!

پیکانِ تمنّا نہیں جاتا ہے جگر تک   خوں ناب دِل آتا نہیں اب دیدۂ تر تک
رہتا نہیں مَیں گوش بر آوازِ سحر تک   اُٹھتی نہیں مشرق کو دمِ صبح نظر تک

نومیدیٔ ما گردشِ ایّام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد!

تڑپا نہ دِلِ کُشتۂ صمصامِ جُدائی   بجیں ہے تہِ کثرتِ آلامِ جُدائی
ایّام ہیں اب زیست کے ایّامِ جُدائی   ہے صبحِ شبِ ہجر بھی یاں شامِ جُدائی

نومیدیٔ ما گردشِ ایّام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد!

عالم میں بدلتا رہے اوقات کا عالم   رہتا ہے یہاں تو وہی ظلمات کا عالم
دیکھا نہیں اُمیّد کے لمعات کا عالم   پیشِ نظر اپنے ہے وہی رات کا عالم

نومیدیٔ ما گردشِ ایّام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد!

غزل

ہو گئے صبر و سکوں دل سے جدا تیرے بعد
کوئی تسکین کا پہلو نہ رہا تیرے بعد

دل ہوا مرثیہ خوانِ نگہِ ذوقِ جمال!
جاں ہوئی ماتمیِ مہر و وفا تیرے بعد

زندگی یاس کے صحرا میں اُڑاتی ہے خاک
مل گیا خاک میں جینے کا مزا تیرے بعد

یک بیک ٹوٹ گیا حُسن کے جلووں کا طلسم
نہ رہی چیز کوئی ہوش ربا تیرے بعد

صبحِ محشر ہوئی ہر صبح تری فرقت میں
اور ہر شام ہوئی شامِ بلا تیرے بعد

نہ رہا لُطفِ ہوائے چمنستاں، کہ ہوئی
بُرّشِ تیغ ہر اک موجِ صبا تیرے بعد

جس میں تاثیرِ نئی جاں بخش تھی تیرے ہوتے
زہر لگتی ہے وہی آب و ہوا تیرے بعد

دلِ محروم ہے اور یورشِ آلامِ فراق
نہ توقع ہے کسی سے نہ گِلا تیرے بعد!

رُباعیات

(۱)

دے کر افسوس! دردِ پہلو مجھ کو ۔۔۔ کیوں چھوڑ چلا نگارِ خوش خو مجھ کو

رونے دے مجھے، کہ ہو گیا میں برباد ۔۔۔ دھوکا اے واہمہ! نہ دے تو مجھ کو!

(۲)

مقسوم میں تھا یہی ہمارے غم و درد ۔۔۔ ہونا محروم کس طرح سے کم درد

یا رب! نہ کسی سے یوں جدا ہو جائے ۔۔۔ ہمدم، ہمراز و ہم نشین و ہم درد!

(۳)

دل خوں ہے وہ انقلاب دیکھے ہیں نے ۔۔۔ دنیا میں بہت عذاب دیکھے ہیں نے

تسکیں دیتا ہوں دل کو اب یہ کر ۔۔۔ وحشت انگیز خواب دیکھے ہیں نے!

(۴)

اک دل میں ہزار پیچ و تاب اے تقدیر　　یہ زندگی ہے، کہ ہے عذاب اے تقدیر

مُردوں کو لحد میں یہ سکوں یہ آرام　　زندوں کیلئے یہ اضطراب اے تقدیر!

(۵)

آہیں وہی اور اشک باری ہے وہی　　اُبرِ آلام دل پہ طاری ہے وہی

مُردہ ہوں کہ لطفِ زیست سے ہوں محروم　　زندہ ہوں کہ دل کی بیقراری ہے وہی!

تضمین

تا بہ آغوشِ فنا دیدم نگارِ خویش را — در تہِ ہر ذرہ میجویم مزارِ خویش را

می فریبم طالعِ ناسازگارِ خویش را — ہر زماں گویم دلِ امیدوارِ خویش را

"آہ اگر باز بینم روئے یارِ خویش را[1]

تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را"

دیگر

رفتی و من دیدنِ تو آرزو دارم ہنوز — یاد زلفِ مشکبویت مو بمو دارم ہنوز

در تصور پیکرت را روبرو دارم ہنوز — آنچہ بہار رفتہ در بنِ تنگ بو دارم ہنوز

در غمت خاطر فریبِ جانِ ناشادِ خودم!

---

[1] یہ شعر جہانگیر کا ہے۔ مشہور ہے کہ انارکلی کی وفات پر موزوں ہوا۔

[2] مرزا غالب کا شعر ہے

دیگر

جہاں تاریک ہے، جب سے چھپا تیرا رُخِ روشن
دلِ غمدیدہ حسرتہائے پنہاں کا ہوا مدفن
نہ دل کش لالہ و گُل ہے، نہ جاذب نرگس و سوسن
"[1]بہر جانب کُشادم دیدہ بے رویت چو در گلشن
نگہ برگشتہ در چشمم خلد چوں نیشِ عقرب ہا!"

---

[1] فارسی شعر ناصر علی کا ہے۔

قطعات

مرگیا دل اور دل کے حسرت و ارماں تمام — یعنی اب باقی نہیں کوئی خوشی میرے لئے
پُر عذابِ مرگ سے ہے لحظہ لحظہ عُمر کا — زندہ رہنا ہے جہاں میں خودکشی میرے لئے!

دیگر

ہوئے رو پیٹ کر خاموش آخر — بظاہر ہو چکا ماتم کسی کا
مگر دنیائے فانی میں ہوں جب تک — دلِ بیتاب ہے اور غم کسی کا

سنہ ۱۹۳۵ء میں مصنف کی دو لڑکیاں (ایک دو سال کی شیرخوار اور دوسری بیاہتا، چار بچوں کی ماں) یکے بعد دیگرے داغِ مفارقت دے گئیں۔ یہ وہ شعر اس سانحہ کی یادیں ہیں۔

کینِ فلک اے وائے کہ داغِ جگرم داد
فریاد برآورد دمِ و داغِ دگرم داد
آں داغِ جگر پارۂ خونِ جگرم سوخت
ویں داغِ دگر آہ! کہ سرتا بسرم سوخت!

تقریبات

سلام وپیام

۱۹۰۸ء میں ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال کے ولایت
سے ہندوستان تشریف لانے پر کہی گئی ــــــ

آنا ترا مبارک! یورپ سے آنے والے
احباب منتظر کو صورت دکھانے والے

آنا ترا مبارک! اعزاز پانے والے
ہندوستاں کی عظمت عزت بڑھانے والے

آنا ترا مبارک! با صد ہزار شوکت
مُلکِ سخن میں اپنا سکہ بٹھانے والے

آنا ترا مبارک! او بلبلِ خوش الحان
نظمیں سُنانے والے اپنا میں اُڑانے والے

آنا ترا مبارک! او فخرِ بزمِ قومی ہنسنے ہنسانے والے! رونے رُلانے والے

منظور کیجئے گا پہلے سلام میرا

ہوتا ہے نذرِ خدمت پھر یہ پیام میرا

محفل میں رنگِ اُلفت اے شیخ! پھر جما دے! لایا فرنگ سے ہے جو مے وہی پلا دے

پھر ہو رہی ہے اَن بن کچھ شیخ و برہمن میں اُن کو گلے ملا دے! روٹھے ہوئے منا دے

ہو برہمن نمازی ۔ زاہد ہو پائے بُت پر دیر و حرم کو ایسی ترکیب سے ملا دے

کلمہ پڑھیں ترا سب، ہو کُفر دُور دل سے ناقوس پھونک ایسا، ایسی اذاں سُنا دے

مشہور کشوروں میں ہے سوز و ساز تیرا اہلِ وطن کو اپنے اس راز کا پتا دے

سوتوں کو ہے جگانا، مُردوں کو ہے جِلانا ہوگا یہ کام تجھ سے، ہمّت تجھے خدا دے

سوزِ سخن بھی ہے گر دنیا میں چیز کوئی اِس کا اثر دکھا دے، اک آگ سی لگا دے

منزل کٹھن ہے اپنی، اور پُرخطر ہیں راہیں پھر سینکڑوں دوراہے، اک راہ پر چلا دے

سحرِ سخن سے اپنے تسخیر کر دلوں کو نغمہ کوئی سنا دے! جادو کوئی چلا دے

قسمت سے ہے دلوں پر حاصل تجھے حکومت جس کو ترس رہے ہیں دنیا کے شاہزادے!

بھارت ہماری ماں ہے، لازم ہے اسکی سیوا کیا چاہیئے ہمیں گر خوش ہو کے یہ دعا دے

ہل جائے دل زمیں کا اور چرخ کانپ اُٹھے اے نوجواں کڑک کر بجلی کوئی گرا دے

دی ہے زبان تجھ کو، دل بھی دیا خدا نے

حُبِّ وطن کے دلکش پھر چھیڑ دے ترانے!

اک بار پھر سُنا دے "ہندوستاں ہمارا" ‏ ‏ اپنی زباں میں کہہ دے رازِ نہاں ہمارا

پھر زمزموں سے اپنے آباد اِس کو کر دے ‏ ‏ تیرے بغیر سُونا تھا گلستاں ہمارا

تھے تیری جستجو میں بن بن کی خاک اُڑاتے ‏ ‏ یادِ بہار اپنی - آبِ رواں ہمارا

کیا حال ہے وہاں کا، آتا ہے تو جہاں سے ‏ ‏ کچھ تذکرہ سُنا بھی تو نے وہاں ہمارا

ہم چل پڑے ہیں لیکن منزل ابھی ہے کوسوں ‏ ‏ اور سخت مشکلوں میں ہے کارواں ہمارا

اپنوں کی سرد مہری نے دل جلا دیا ہے ‏ ‏ پہنچے گا آسماں تک دودِ فغاں ہمارا

اقبال! دیکھ اتنا کوئی نہیں سمجھتا! ‏ ‏ مٹنے کو ہے جہاں سے نام و نشاں ہمارا

آپس کی دشمنی کے یہ دن نہیں ہیں ہرگز ‏ ‏ پہلے ہی جبکہ دشمن ہے آسماں ہمارا

یہ وقت ہے کہ کہہ دیں سب ہو کے یکزباں ہم ‏ ‏ ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

گنگا میں جا پڑا تھا جس دن سے رام[1] اپنا

اوندھا پڑا ہوا ہے اے شیخ جام اپنا!

(۱۹۰۸ء)

---

[1] سوامی رام تیرتھ آنجہانی۔

پیامِ شوق

(۱۹۱۲ء)

(اپنے ایک دوست مقیم لنڈن کے نام)

سروِ دلجو![1] مجھ کو حیرت تھی تو کس گلشن میں ہے
ہو گیا معلوم بارے آجکل لنڈن میں ہے

آجکل لنڈن میں ہے ہندوستاں سے دُور ہے
چشمِ مشتاقِ تماشا! وہ یہاں سے دُور ہے

دُور ہے اور دُور بھی اتنا کہ اے پیکِ خیال
تو سریع السّیر کتنا ہو رسائی ہے محال

راہ میں حائل ہیں کتنے بحر اور کتنے پہاڑ
کتنے میداں پُرفضا کتنے بیاباں ہیں اُجاڑ

ختم ہو جاتی ہے مغرب میں جہاں جا کر زمیں
بحرِ اٹلانٹک میں چھوٹا سا جزیرہ ہے وہیں

وہ جزیرہ مسکنِ دانشورانِ دہر ہے
حکمت آموزِ جہاں لنڈن اک اس کا شہر ہے

---

[1] یہ لفظ محض گلشن کی رعایت سے نہیں بلکہ مکتوب الیہ پر بلحاظِ قد و قامت صادق آتا ہے۔
[2] یہ منظوم خط اُس وقت لکھا گیا جب مکتوب الیہ محمد جان خاں بیرسٹرایٹ لا لندن میں زیرِ تعلیم تھے۔ تقسیم وطن سے پہلے آپ جموں میونسپل کمیٹی کے ایگزیکٹو آفیسر تھے۔ (محرّرم)

مجھ کو جس کی جستجو تھی وہ اُسی لندن میں ہے
ہند کا سروِ رواں انگلینڈ کے گلشن میں ہے

اے کہ رونق یاب ہیں تجھ سے سفر کی منزلیں — خیریت سے کر گیا طے بحر و بر کی منزلیں؟
ہمتِ مردانہ ذوقِ علم دو شہپر ترے — لے گئے تجھ کو اُڑا کر، بن گئے رہبر ترے
ہو تری پرواز ظلمت بخشِ افلاکِ علوم — راس ہو تجھ کو ہوائے خطۂ پاکِ علوم!
شوق سے کسبِ ضیائے آفتابِ علم کر — اپنی ہستی کو سراپا ماہتابِ علم کر
آکے یورپ سے چمک جا آسمانِ ہند پر — جس قدر ہو، نور برسا خاکدانِ ہند پر

روشنی میں ہو اضافہ تا کہ تیری ذات سے
پار بیڑا ہند کا ہو قلزمِ ظلمات سے!

میرے پیارے ہم سبق! میرے پرانے ہمخیال — محو ہو سکتا نہیں دل سے ترا نقشِ جمال
دل نشیں صورت تری خاطر نشاں سیرت تری — اک امانت دل میں ہے الفت تری عزت تری
اے عزیزِ خاطرِ احباب تو شاداں رہے — اجنبی ملکوں میں تجھ پر سایۂ یزداں رہے
اپنے ہم چشموں میں حاصل سرخروئی ہو تجھے — کامیابی کا نظر آئے رُخِ نیکو تجھے

مایۂ نازِ وطن ہو کر وطن میں آئے تو!
نو بہارِ جاں فزا ہو کر چمن میں آئے تو!

یوں رکھے پہلو میں تو اپنے دلِ پاکیزہ کو — رکھتے ہیں ماں باپ جیسے ہند میں دوشیزہ کو
حسنِ انگلستان کے نظارہ ہائے دلفریب — چھین لے جائیں نہ پہلو سے ترے صبر و شکیب

تیری نظروں میں نہ ہو اعجاز جادوِ حُسن کا — تو نہ دیکھے لاکھ ہو زرینہ آہوئے[1] حُسن کا

دامِ گیسوئے طلائی میں نہ اُلجھے دل ترا

تو نہ ہو قائل اگر صہبا دہو مائل ترا

سنتے ہیں مغرب میں شغلِ بادہ نوشی ہے بہت — رونقِ بازارِ رسمِ عیش کوشی ہے بہت

میکشی کا تیری محفل میں نرالا طور ہو — بادۂ حُبِّ وطن کا یعنی چلتا دَور ہو

یاد آجائے گُرُمؔ[2] تجھ کو کنارِ ٹیمز پہ — اور دو آنسو بڑھادے جو بہاؤ ٹیمز پہ

یہ دُعائیں ہیں مری ، اِن کو نصیحت مت سمجھ

جذبہ ہائے دل کو سرکی قابلیت مت سمجھ!

سنہ ۱۹۱۲ء

---

[1] رامائن کے مایا کے ہرن کی طرف اشارہ ہے

[2] دریائے سندھ کا ایک معاون ہے۔ بتوں کے پاس سے ہو کر گزرتا ہے۔ مکتوب الیہ بتوں کا باشندہ ہے اور مرحوم کا کلاس فیلو۔

نرگس کے پھول

پھول نرگس[1] کے ملے تازہ وشاداب مجھے
عین موسم میں ملا ہدیہ نایاب مجھے

دِل کھِلا بوئے محبت سے جو پایا ان کو
دیدۂ شوق نے آنکھوں سے لگایا ان کو

بھینی بھینی وہ بُو ہے خوش ہی کہ سبحان اللہ
برگ برگ اُن کا وہ دلکش ہی کہ سبحان اللہ

کیا لطافت ہے بھری پنکھڑیوں میں انکی!
جلوۂ حُسن پری پنکھڑیوں میں اِن کی

چھُوٹ کر باغ سے ہیں بعدِ سفر بھی تازہ
دستِ قدرت نے ملا رُخ پہ کچھ ایسا غازہ

خوب اِن پھُولوں کے حق میں شُعرا کہتے ہیں
چشمِ معشوق جو کہتے ہیں بجا کہتے ہیں!

نظر آجائے جو ہو جائیں کبھی چار آنکھیں
اِن سے اچھی تو نہیں ہوتی ہیں بیمار آنکھیں

---

[1] ایک دوست نے راولپنڈی سے نرگس کے پھول بھیجے۔ اس عنایت کے شکریے میں یہ نظم کہی گئی۔

طالبِ دید سے دم بھر میں جو آنکھیں پھر جائیں
سامنے اُنکے وہ نظر دل سے نہ کیونکر گر جائیں

نیمباز اِن میں کوئی، کوئی خمار آلودہ!
اِن کے ہر رنگ میں نیرنگِ بہار آلودہ

اِن کا باطن جو طلائی ہے تو ظاہر سیمیں!
قیمتِ حُسن میں اِن سے کوئی گُل بڑھ کے نہیں

ایک ہی جلوے سے سُورج کی کرن بھی پیدا
مہ جمالوں کے کرشموں کا چلن بھی پیدا

لالہ کیا سامنے آئے کہ ہو داغِ گلشن!
اِن کو خالق نے کیا چشم و چراغِ گلشن

رُوئے خوب اِن کو گلاب آکے دکھائے اپنا
پہلے دامن تو وہ کانٹوں سے چھڑائے اپنا

تھوڑی تھوڑی ہوئی جاتی ہیں چمن کی کلیاں
کہ بہت بڑھ کے ہیں نرگس کے چمن کی کلیاں

خوش نصیبوں کے وطن میں وطنِ نرگس ہے
شامۂ مستِ ہوائے چمنِ نرگس ہے!

خوش رہیں گلشنِ عالم میں جنابِ بالی[1]
گُل فشاں نخلِ تمنا کی ہو ڈالی ڈالی

پھول بھیجے ہیں اُنھوں نے بصد الطاف و کرم
ورنہ محروم کی قسمت میں تو ہے خارِ الم!

---

[1] پرمانند بالی

دہلی میں کیا دیکھا؟

(۱۹۱۶ء)

برنگِ کاہ کھنچ کر برقؔ[۱] کی جانب گئے دہلی
کہ اُن کو جذبِ اُلفت میں مثالِ کہربا دیکھا

دلِ محرومؔ نازاں ہے کہ حسن سے راہ تھی اُسکو
اُنھیں سرتاقدم مجموعۂ صدق و صفا دیکھا

جنابِ مہرؔ کے دیدار سے آنکھیں ہوئیں روشن
نگاہِ واقفِ معنی کو برقِ باصفا دیکھا

ملے کیفیؔ و رونقؔ سے، سُنے اشعار بھی اُن کے
ابھی پردوں میں گوشِ چشم کے ہے جو صدا دیکھا

گزر اپنا ہوا بزمِ نصیرؔ نکتہ پرور میں
وہاں پر بھی درِ گنجینۂ معنی کھلا دیکھا

وفائے خضر صورت کی نہ بھولیگی ہمیں شفقت
بقا آبادِ ذوقِ دل کا ان کو رہنما دیکھا

بزرگِ زندہ دل، رنگیں مزاج و نکتہ سنج ایسا
کہیں دیکھا نہ تھا، دہلی میں ہم نے اُنکو جا دیکھا

وفاؔ صفاؔ کی پیری پر جوانی کیوں نہ ہو صدقے
انھیں چونچال پیری میں جوانوں سے سوا دیکھا

ملے یوں مجھ سے گویا ہمدمِ دیرینہ تھے سارے
غرض احبابِ دہلی کو محبت آشنا دیکھا

کئی حضرات سے ملنے کی خواہش رہ گئی دل میں
اثر تیرا وہاں بھی ہم نے بختِ نارسا دیکھا

نہ آثارِ کہن دیکھے، نہ گلزار و چمن دیکھے
دلِ افسردہ کو اُفتادگی میں نقشِ پا دیکھا

یہی اشعارِ محرومِ حزیں اُن کو سُنا دینا
جو پوچھیں مہربانانِ وطن، دہلی میں کیا دیکھا!

[۱] مکرمی منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی مرحوم

جو تجھے منظور، ہم کو اے خدا منظور ہے!

(پہلی جنگِ عظیم کے آغاز میں لکھی گئی)

تیری مرضی کیا خدائے پاک! کیا منظور ہے
جنگ شاہوں کو پسند اور صلح نا منظور ہے

دعوتِ امن و اماں اب کہاں اے ذوالمنن
فتنہ انگیزی جہاں کو جا بجا منظور ہے

آسماں نے لی ہے قدرت سے قبائے نیلگوں
شوقِ ماتم ہے لے کس کی بقا منظور ہے

نیزہ دارِ خاور آتا ہے بصد جوشِ غضب
اس کو بھی ہنگامۂ گرمِ وغا منظور ہے

چارۂ محروم کو دم مارنے کی تاب کیا
جو تجھے منظور، ہم کو اے خدا منظور ہے!

قصیدہ

مشتمل بر

مدحتِ علم و مذمّتِ جہالت

جو

رام موہن رائے ہائی اسکول میانوالی کے افتتاحی جلسے میں پڑھا گیا

دلِ افسردہ اپنا مائلِ جوشِ مسرّت ہے	مُرادوں کے چمن پر سایہ گستر ابرِ رحمت ہے
میانوالی کے صحراؤں میں ہی رنگِ چمن پیدا	وطن محرومؔ کا خجلت دہِ گلزارِ جنت ہے

چمن بندانِ نو پنجاب سے تشریف لائے ہیں — بہارِ جاوداں کو جن کے مقدم سے رفاقت ہے

لگانے آئے ہیں گلشن نیا اک علم و دانش کا — مبارک اے میاں نوالی! یہ جاں افزا بشارت ہے

برستا خطۂ بنگال سے ابرِ بہار آیا — کہ تیری سرزمیں لب تشنۂ بارانِ رحمت ہے

خیاباں ہونگے اک دن علم و تہذیب و تمدن سے — یہی تیرے بیاباں جن کو وحشت کو بھی وحشت ہے

یہ ٹیلے ریت کے ہوں گے گلِ شاداب کے تختے — بہار انگیز ان روزوں نگاہِ فیضِ قدرت ہے

نسیمِ روح پرور لائی ہے پیغامِ بیداری — سرِ بالیں جگانے کو کھڑی صبحِ سعادت ہے

"جو مکتب کھولتا ہے بند کرتا ہے درِ زنداں" — بجا ہے یہ جو انگریزی میں مشہور اک کہاوت ہے

مبارک دور ہے نوروز ہے یہ سالِ بکرم کا — نمایاں غیب کے پردے سے از خود شبھ مہورت ہے

وہ پاکیزہ پڑھوں اب علم کی توصیف میں مطلع

کہیں جس کو سخنور گوہرِ دریائے فطرت ہے

مبارک ہیں وہ انساں علم سے جنکو محبت ہے — کہ علم آئینہ دارِ پرتوِ روئے حقیقت ہے

اسی سے خاکیوں کے سینے ہو جاتے ہیں آئینے — یہی صیقل جہاں میں دشمنِ زنگِ کدورت ہے

دکھاتا ہے یہی عقبیٰ کی راہیں اور دنیا کی — یہی دونوں جہاں کے واسطے خضرِ طریقت ہے

پہنچتے ہیں اسی سے منزلِ مقصودِ عرفاں تک — یہی اکمل ریاضت ہے یہی افضل عبادت ہے

اسی سے رازِ ترکیبِ نظامِ دہر کھلتا ہے — نظر آتی اسی سے خالقِ اکبر کی قدرت ہے

معزز ہیں زمانے میں اسی سے پیشرو اپنے — اسی سے اُن کو حاصل امتیازِ اولیت ہے

ابھی تک اک جہاں ہے قائلِ ذہنِ رسا ان کا — جو پارینہ ورق ہے ہندیوں کا گنجِ حکمت ہے

کہا جاتا ہے گو پیغمبرِ اسلام کو اُمی
مگر کیا خوب اُمت کیلئے اُنکی ہدایت ہے

حصولِ علم کی خاطر اگر ہو چین تک جانا
پہنچ جاؤ وہاں تک راستہ گو پرصعوبت ہے

چلاتی ہیں بھروسے پر اسی کے کارِ بار اپنا
وہ قومیں آج جن کے دستِ قدرت میں تجارت ہے

جہاں کے کارخانے میں یہی استاد ہے پورا
بغیر اس کے تکمل کوئی صنعت نہ حرفت ہے

اسی کے زور پر قائم ہے اُن کا کر و فر سارا
میسر آج جن اقوام کو معراجِ شوکت ہے

فرنگستان ہو، یا جاپان، امریکہ ہو، کوئی ہو
یہی قوموں کی عزت ہے یہی ملکوں کی دولت ہے

درِ دولت پہ جا کر آتش و آب و ہوا تک ہیں
اسی کے بل پہ انساں کی عناصر پر حکومت ہے

فضیلت علم کی روشن ہے سب پر آفتاب آسا

اب اس مطلع سے تا مقطع جہالت کی مذمت ہے

جو انساں دہر میں پابندِ زنجیرِ جہالت ہے
جہاں اس کیلئے اے دوستو! زندانِ ذلت ہے

منور شمعِ دانش جب نہ ہو کاشانۂ دل میں
تو پھر دنیا میں دیکھو جس طرف ظلمت ہی ظلمت ہے

مکیں ہے تا بہ آخر چار دیوارِ عناصر میں
خیالِ خامِ ناداں کو نہ رفعت ہے نہ وسعت ہے

جو منظر حیرت افزا ہیں خرد کی چشمِ بینا کو
جہالت کیلئے اُنمیں ہر اک دنیائے حیرت ہے

کسی سے کم ہیں افریقہ کے وحشی آدمیت میں
اگر دو پاؤں پر چلنا ہی شرطِ آدمیت ہے؟

جہالت خوابِ غفلت ہے جو جاہل ہیں وہ غافل ہیں
نتیجہ خوابِ غفلت کا تاسف ہے ندامت ہے

سفر اور صحبتِ عالم کی خواہش کرتے ہیں دانا
میسر اُن کو جنت میں اگر جاہل کی صحبت ہے

وطن میں داغ ہے دامانِ توقیرِ وطن پر وہ
سفر میں مردِ جاہل باعثِ تحقیرِ ملت ہے

دیے گنجینے کو ناخنِ طالعِ ناساز نے گویا
اگر بے علم کو دنیا میں حاصل گنج دولت ہے

زوالِ بخت کی تصویرِ عبرت جانیے اس کو
ہمارے ملک میں جاہل امیروں کی جو حالت ہے

نہیں ہے پاس سے بڑھ کر کوئی مصرف انکی دولت کا
نہاں زیرِ زمیں ہے یا نثارِ بزمِ عشرت ہے

یہ بن جاتے ہیں حاتم کے چچا ڈوموں کی محفل میں
یتیموں کے لئے کہدو تو شل دستِ سخاوت ہے

مشاغل وہ کہ شرمائے شرافت دیکھ کر جن کو
مغنّا ان کے وہ انسانیت کو جن سے نفرت ہے

یہ اپنے زعم میں محفوظ بیٹھے ہیں لبِ ساحل!
انھیں پروا ہی کیا، گر قوم غرقابِ فلاکت ہے

انھیں اے کاش! اتنا وقت پر معلوم ہو جاتا
کہ سر پر سب کے یکساں سایۂ ابرِ نحوست ہے

جہالت کی گھٹا ہندوستاں کے سر سے ٹل جائے
دُعا محروم کی اے حاجبِ بابِ اجابت ہے!

مادرِ مہجور

ایک سچا واقعہ

کوئی دم کی میہماں ہوں، جانِ مادر آؤ بھی
رہ گیا آنکھوں میں دم میرا اٹک کر، آؤ بھی

جاں کنی کا وقت ہے اور جاں نکل سکتی نہیں
سینۂ سوزاں پہ ہے فرقت کا پتھر آؤ بھی

نزع کی گھڑیاں ہیں میری آتما بے چین ہے
آؤ بھی اب اے قرارِ قلبِ مضطر! آؤ بھی

دیکھ کر تم کو نہ روؤں گی میرے نورِ نظر
روتے روتے خشک ہیں اب دیدۂ تر! آؤ بھی

اپنے اپنے گھر کو واپس ہوتے ہیں سب شام کو
اب تو شامِ عمر ہے میری، کہیں گھر آؤ بھی

منتظر کب تک رہوں۔ ٹالوں قضا کو کب تلک
مُنہ دکھاؤ گے گرفتارِ بلا کو کب تلک

رُوحِ مُضطر ٹھوکریں کھاتی بھٹکتی جائیگی
آہ! اس دُنیا کو جسمیں تجھے تکتی جائیگی

خُوں کے آنسو میں کفن میں بھی بہاتی جاؤنگی
حسرتِ دیدار آنکھوں سے ٹپکتی جائیگی

دیکھ کر آغوشِ مہرِ مادری کو نامراد
بے بسی ارتھی پہ میری سر پٹکتی جائیگی

بُجھ نہ جائیگی جلا کر مجھ کو اے اہلِ جہاں
مامتا کی آگ محشر تک بھڑکتی جائیگی

دے گئے کو ناخنِ طالعِ ناساز نے گویا
اگر ہے علم کو دنیا میں حاصل گنجِ دولت ہے

زوالِ بخت کی تصویرِ عبرت جانیئے اس کو
ہمارے ملک میں جاہل امیروں کی جو حالت ہے

نہیں ہے اس سے بڑھ کر کوئی مصرف انکی دولت کا
نہاں زیرِ زمیں ہے یا نثارِ بزمِ عشرت ہے

یہ بن جاتے ہیں حاتم کے چچا ڈوموں کی محفل میں
یتیموں کے لئے کچھ ہو تو شل دستِ سخاوت ہے

مشاقل وہ کہ شرمائے شرافت دیکھ کر جن کو
حسب مصفا ان کے وہ انسانیت کو جن سے نفرت ہے

یہ اپنے زعم میں محفوظ بیٹھے ہیں لبِ ساحل!
انھیں پروا ہی کیا، گر قوم غرقابِ فلاکت ہے

انھیں اے کاش! اتنا وقت پر معلوم ہو جاتا
کہ سر پر سب کے یکساں سایۂ ابرِ نحوست ہے

جہالت کی گھٹا ہندوستاں کے سر سے ٹل جائے
دعا محروم کی اے حاجبِ بابِ اجابت ہے!

مادرِ مہجور

ایک سچا واقعہ

کوئی دم کی میہماں ہوں، جانِ مادر آؤ بھی
رہ گیا آنکھوں میں دم میرا اٹک کر آؤ بھی

جاں کنی کا وقت ہے اور جاں نکل سکتی نہیں
سینۂ سوزاں پہ ہے فرقت کا پتھر آؤ بھی

نزع کی گھڑیاں ہیں میری آتما بے چین ہے
آؤ بھی! اب اے قرارِ قلبِ مضطر! آؤ بھی

دیکھ کر تم کو نہ رو دوں گی میرے نورِ نظر
روتے روتے خشک ہیں اب دیدۂ تر! آؤ بھی

اپنے اپنے گھر کو واپس ہوتے ہیں سب شام کو
اب تو شامِ عمر ہے میری، کہیں گھر آؤ بھی

منتظر کب تک رہوں۔ ٹالوں قضا کو کب تلک
منہ دکھاؤگے گرفتارِ بلا کو کب تلک

روحِ مضطر ٹھوکریں کھاتی بھٹکتی جائیگی
آہ! اس دنیا کو جسمیں تم ہے تکتی جائیگی

خوں کے آنسو میں کفن میں بھی بہاتی جاؤنگی
حسرتِ دیدار آنکھوں سے ٹپکتی جائیگی

دیکھ کر آغوشِ مہرِ مادری کو نامراد
بے بسی ارتھی پہ میری سر پٹکتی جائیگی

بجھ نہ جائیگی جلا کر مجھ کو اے اہلِ جہاں
مامتا کی آگ محشر تک بھڑکتی جائیگی

دوسری دُنیا میں بھی تیرِ جدائی کی آنی — پہلوئے مجروح میں یُونہی کھٹکتی جائے گی

وائے مجبوری! کہ مرتی مادرِ مہجور ہے

اور بے چارہ پسر زنداں سے مجبور ہے

ضبط سے اب کام میرے لال! گزرا جائے ہے — کوئی دم میں آخری ہچکی کا جھٹکا آئے ہے

شانتی کی موت مجھکو کاش! ہو جاتی نصیب — کیا کروں تیری جدائی کا قلق تڑپائے ہے

سہل ہو جائے کسی صورت نکلنا جان کا — کاش جھوٹوں ہی کوئی کہدے کہ اب تُو آئے ہے

آہ! بدلے آسماں نے مجھسے کس دن کیلئے — آخری ساعت میں یہ صدمے مجھے دکھلائے ہے

آہ! میں سُنتی ہوں تیرے نالۂ زنجیر کو — ورنہ کیوں لب میرے ہر وقت ہائے ہائے ہے

دو جگہ پر میری جانِ ناتواں مشکل میں ہے

کچھ یہاں مشکل میں ہے اور کچھ وہاں مشکل میں ہے

جانِ مادر! مجھ کو ملجاتی اجازت کاشکے — ڈالدیتا وہ کسی کے دل میں شفقت کاشکے!

کاش! تو آرامِ جاں ہوتا نظر کے سامنے — جاں نکل جاتی بصد آرام و راحت کاشکے!

آہ! مجھ دُکھیا کے نالے ہی پہنچ جاتے وہاں — اور ہوتی عرصۂ محشر عدالت، کاشکے!

آہ! مرنا بھی ہے مشکل اور جینا بھی محال — آسماں دیتا نہ یہ دُہری مصیبت کاشکے!

بند ہو جانے کو ہیں آنکھیں ہمیشہ کیلئے — دیکھ لیتی ہیں ترا مُنہ وقتِ رحلت کاشکے!

داغِ حسرت آہ! پہلو میں لئے جاتی ہوں میں!

کس طرف جاتی ہوں یارب کس لئے جاتی ہوں میں!

(سنہ ۱۹۱۴ء)

تقریظِ منظوم

(منشی اقبال ورما سحر ہنگامی کی مثنوی پر)

اے سحرِ فسوں طرازِ معنی — اے صاحبِ امتیازِ معنی

لکھی ہے یہ تو نے مثنوی خوب — دلچسپ، نظر فریب، مرغوب

یہ عشق کی داستانِ دلکش! — اور اس پہ ترا بیانِ دلکش

دکھلائے ہیں لطفِ فن سے تو نے — کیا حُسنِ کلام کے نمونے

دُشینت و شکنتلا کی رُو داد — ہے لائقِ صاد و قابلِ داد

ارژنگِ سخن یہ مثنوی ہے — یہ حُسنِ بیاں، یہ شاعری ہے

اظہارِ غم

ایک نیک دل ڈاکٹر کی تبدیلی پر

مطلعِ دل پہ اُداسی کی گھٹا چھائی ہے — شبِ ہجراں کی سیاہی سی نظر آئی ہے

پڑ گئی اوس یہ کیا شہر و چمن پر یا رب! — صورتِ مردم و گل کس لئے مُرجھائی ہے

شہر میں منظرِ بے رونقیِ صحرا ہے! — سیرِ بازار ہے یا بادیہ پیمائی ہے

خندہ زن پھول گلستاں میں تھے کل تک جو آج — نوبتِ چاکِ گریبانِ قبا آئی ہے

سرو گلزار میں کل تک تو جواں تھے لیکن — دشمنِ مشقِ خرام آج گراں پائی ہے

بزمِ احباب میں نہ ذوق ہے نہ وہ جوش و خروش — یہ کوئی بزم ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

الوداع آئے ہیں کہنے کسے احباب کہ آج — وقفِ صد مُہرِ خموشی لبِ گویائی ہے

شعر کیا پڑھئے کہ ہر نقطہ ہے اک دفترِ غم — وجہِ افسردگیِ دل سخن آرائی ہے

ایک محبوبِ دلِ خلق کی رخصت کا دن — باعثِ رخصتِ ایّامِ شکیبائی ہے

تندرست آج ہیں بیمار کہ وہ جاتے ہیں!

جاں سے بیمار ہیں بیزار کہ وہ جاتے ہیں!

دلِ رنجور تجھے چین بھلا کیا آئے! چارہ گر جبکہ نظر کوئی نہ اُن سا آئے

رائے صاحب کو خدا نے وہ دیا دستِ شفا سامنے جس کے نہ ہرگز یدِ بیضا آئے

ایک دم میں رُخِ بیمار پہ آئی رونق! آپ آئے سرِ بالیں کہ مسیحا آئے

سامنے آپ کے سِل جاتے ہیں لب اُس کے بھی! زخم جو سوزنِ تقدیر پہ ہنستا آئے

حکمت ایسی اُنھیں فیّاضِ ازل نے بخشی رشک سقراط کو آئے تو نہ بیجا آئے

ان فضائل پہ اضافہ وہ خصائل ہیں جنھیں سیکھنے عرشِ معلّٰے سے فرشتا آئے

صورت و سیرتِ مقبول جو دیکھے انکی نظر اللہ کی قدرت کا تماشا آئے

ایسے انسان کہاں ملتے ہیں انسانوں میں

رُوح بن کر جو سما جاتے ہیں سب جانوں میں!

جو نویدِ عملِ صدق و صفا دیتے ہیں فطرتِ قُدسیِ آدم کا پتا دیتے ہیں

شاخِ پُرمیوہ کی مانند سعادت پاکر گردنِ عجز سوئے خاک جُھکا دیتے ہیں

سب کی نظروں میں سما جاتے ہیں ایسے انساں تفرقے مذہبؔ ملّت کے مٹا دیتے ہیں

جس طرح دیکھتے ہو آج یہاں کا نقشہ اپنی فرقت سے وہ لوگوں کو رُلا دیتے ہیں

رائے صاحب پہ رہے سایۂ الطافِ خدا وہ دوا دیتے تھے، ہم اُن کو دُعا دیتے ہیں

دہر میں پھُولیں پھلیں، صاحبِ اقبال رہیں

اے خدا! خلق کے ہمدرد مہ و سال رہیں!

شامِ جدائی

مفتی احمد سعید میانوالی میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز تھے۔ وہ شعر و ادب کے دلدادہ تھے۔ یہ نظم اُن کی تبدیلی پر کہی گئی۔ ورنہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر تو کئی آئے اور چلے گئے!

(محروم)

ہمیں ڈر کا تھا جس کا آ گئی وہ غم کی شام آخر
سنایا دورِ گردوں نے جدائی کا پیام آخر

یہ ضد اے گردشِ دوراں! بھلا کیوں ہم غریبوں سے
جو نا منظور تھا ہم کو، کیا وہ تو نے کام آخر

ہر شاخِ دل نہ کیوں کر یادگارِ رنگِ محفل ہو
گیا وہ ساقیٔ رنگیں، ہوا وہ دورِ جام آخر

کسی کو اس دنیا میں نہیں بزمِ فراغ آئی
جو بیٹھا شادماں ہو کر، اُٹھا وہ تلخ کام آخر

مسرت کی فضا میں آ مقدر! کیوں اُڑاتا تھا
اگر کرنا تھا مرغِ دل کو بیکل زیرِ دام آخر

اگر انجام حسرت ہی ہر اک دیرینہ صحبت کا
تو کیوں کرتے یہ ہم دل سوزیوں کے اہتمام آخر

ہماری شاعری کا قدرداں تھا اک وہ جاتا ہے
گئے اب شعر کے چرچے، ہوا لطفِ کلام آخر

چہ حسرت خیز شامِ رخصتِ احمد سعید آمد
کہ از ہر ذرّۂ خاکے دلِ نالاں پدید آمد!

بچّوں کی موت

محبی ابو الاثر حفیظ جالندھری کی ایک کم سن بچی فوت ہوگئی،
یہ اشعار اُس سوگ کی یادگار ہیں۔

توڑتا ہے کس لئے غنچوں کو گُل چینِ اجل
کس سے پوچھیں آہ! کیا ہے طرزِ آئینِ اجل

ننھے معصوموں کی جانوں پر عذابِ جاں کنی
پھول سے اجسام نذرِ التہابِ جاں کنی

آہ! ہنستے کھیلتے خاموش ہو جاتے ہیں یہ
جس سے پھر اُٹھتے نہیں وہ نیند سو جاتے ہیں یہ

اپنے بیگانوں کا دل رہتا ہے جن سے باغ باغ
دیکھیے اُن کے جگر، جن کو یہ دے جاتے ہیں داغ

"تا دمِ آخر جدائی کے ستم سہتے ہیں وہ
مر نہیں جاتے ہیں، پر زندوں میں کب رہتے ہیں وہ
اُن کے اُجڑے باغ میں فصلِ بہار آتی نہیں
گھر کے بام و در سے اُٹھتی ہے یہ فریادِ حزیں
"پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"!

[1] یہ شعر استاد ذوق کا ہے۔

تہنیتِ نوروز

(مکرمی منشی مہاراج بہادر برقؔ کے اشعار کی تضمین)

خورشیدِ سالِ نو ہے کہ ہے جامِ انبساط   کیا فالِ نیک ہے پئے ایامِ انبساط
آئیں گے پے بہ پے سحر و شامِ انبساط   نوروز لے کے آیا ہے پیغامِ انبساط

ہو رشکِ صبحِ عید یہ روشن سحر تجھے!

جاں بخش تجھ کو دہر کی آب و ہوا رہے   باغِ جہاں میں نخلِ تمنا ہرا رہے
دل پر بہارِ تازہ کا عالم سدا رہے   دامن گلِ مراد سے تیرا بھرا رہے

آمد ہو سالِ نو کی مسرت اثر تجھے!

فرحت دہِ ریاضِ جہاں مثلِ بُو رہے | دم تیرا نازشِ چمنِ آرزو رہے
مانندِ گُل شگفتہ دل و تازہ رُو رہے | محفوظ چشمِ زخمِ زمانہ سے تُو رہے

پہنچا سکے نہ تیغِ حوادث ضرر تجھے!

روشن دلی میں شمعِ سرِ انجمن ہو تُو | آزادہ رَو مثالِ نسیمِ چمن ہو تُو
تازہ کُنِ مسرّتِ بزمِ کہن ہو تُو | سرمستِ ساغرِ مئے حُبِّ وطن ہو تُو

ہوں اس کے گھونٹ راحتِ قلب و جگر تجھے!

ہو کر فدائے اہلِ وطن شاد شاد جی | ایسے میں موت آئے تو ہے اصلِ زندگی
حق سے ہے تیرے حق میں مری تو دعا یہی | خدمت میں تو وطن کی رہے محوِ بیخودی

اس کے سوا نہ آئے خیالِ دگر تجھے!

تیری نظر میں فکرِ کم و بیش ہو زبوں | کم بھی ملے تو شکرِ خداوند ہو فزوں
گُل کی طرح نہ زر کیلئے دل ترا ہو خوں | حاصل تجھے متاعِ قناعت سے ہو سکوں

رکھے نہ مضطرب ہوسِ مال و زر تجھے!

ہر صبحِ سالِ نو ہو تجھے صبحِ نوبہار | ہر شام شامِ وصلِ عزیزانِ غمگسار
کلفت ہو دُور، دل ہو مسرت سے ہمکنار | راحت ملے، ہوائے زمانہ ہو سازگار

راس آئے برق کی یہ دُعا سربسر تجھے!

فردوسِ ہند

(تضمین بر شعرِ حضرتِ آزاد مؤلف خزانۂ عامرہ)

طوبیٰ ہے ایک اک شجرِ گلستانِ ہند — کوثر ہے، سلسبیل ہے آبِ روانِ ہند
حور و پری سے کم نہیں ہرگز بتانِ ہند — گر نیست از بہشت فزوں بوستانِ ہند
آدم نہ ناز و نعمتِ جنت چساں گزشت؟

ہمپایۂ ملائکہ تھے قدسیانِ ہند — شرمندہ سا زِ جنتِ ماوی تھی شانِ ہند
کہتے ہیں لوگ اب بھی دمِ امتحانِ ہند — گر نیست از بہشت فزوں بوستانِ ہند
آدم ز ناز و نعمتِ جنت چساں گزشت؟

جنت کی آرزو نہ کریں ساکنانِ ہند — مر کر بھی یہ دعا ہو کہ رہیے میانِ ہند
فردوس کیا ہے دوستو! پیشِ جنانِ ہند — گر نیست از بہشت فزوں بوستانِ ہند
آدم ز ناز و نعمتِ جنت چساں گزشت؟

(جولائی سنہ ۱۹۰۹ء)

خاکِ ہند

(تضمین مصرعہ جناب چکبست لکھنوی)

انجم سے بڑھ کے تیرا ہر ذرّہ ضو فشاں ہے — جلووں سے تیرے ابتک حُسنِ ازل عیاں ہے

اندازِ دلفریبی جو تجھ میں ہے، کہاں ہے — فخرِ زمانہ تُو ہے اور نازشِ جہاں ہے

افتادگی میں بھی تُو ہمدوشِ آسماں ہے

"اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے"

وہ کجکلاہ تیرے، وہ شہسوار تیرے — وہ تیغ زن، کمانکش، وہ قلعہ گیر تیرے

نایاب آج ہیں گو تاج و سریر تیرے — شاہوں سے ہیں زیادہ لیکن فقیر تیرے

پستی میں سربلندی سب پر تری عیاں ہے
"اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے"

منظر وہ جاں فزا ہیں اور دلپذیر تیرے — جانیں ہیں تجھ پہ شیدا اور دل اسیر تیرے
شیریں وصاف دریا ہیں جوئے شیر تیرے — ہیں دشت و کوہ و صحرا جنت نظیر تیرے
آنکھیں جدھر اُٹھاؤ، فردوس کا سماں ہے
"اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے"

تجھ کو مٹا دیا ہے ہر چند آسماں نے — پھونکا ہے آہ! دل کو سوزِ غمِ نہاں نے
چھوڑی نہ تاب اپنی پر حُسنِ دلستاں نے — جوہر بکھیرے ہیں تجھ میں صناعِ دو جہاں نے
فصلِ خزاں ہے تیری، پھر بھی تو گلفشاں ہے
"اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے"

گو حد سے بڑھ گیا ہے رنج و ملال تیرا — اب تک مٹا نہیں ہے نقشِ جمال تیرا
آخر کبھی تو ہوگا ظاہر کمال تیرا — ہوگا کبھی تو آخر دورِ زوال تیرا
کب اک روش پہ قائم یہ دورِ آسماں ہے
"اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے"

امامِ ہند

(ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے، پی، ایچ، ڈی کے اشعار پر تضمین)

چلتا ہے دورِ بادۂ عرفاں بکامِ ہند ہیں واقفِ سرورِ ازل خاص و عامِ ہند
بالا ہے بزمِ پیرِ مغاں میں مقامِ ہند لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند!

وہ ہند کے بلند خیالانِ باخبر رہتی تھی جن کی ہفت سماوات پر نظر
دیکھے پڑے تھے سب زحل و زہرہ و قمر یہ ہندیوں کی فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند!

دل کو نہ ہونے دیتے تھے شیدائے سنگ و خشت ان کی سرشت پاک سے تھا دور فعل زشت
یہ خطہ اس زمانے میں تھا واقعی بہشت اس دیش میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت

مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند!

جس طرح ماہ و مہر پہ ہے آسمان کو ناز اور نُور پر ہے مہر و مہِ ضوفشاں کو ناز
جس طرح دُرّ و لعل پہ ہے بحر و کان کو ناز ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز

اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند!

پھیلی جو آ کے شمعِ صداقت کی روشنی باطل کی راہ، راہِ عدم ڈھونڈھنے لگی
مدت ہوئی، مگر ہیں ابھی جھلکیاں وہی اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی

روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند!

(اپریل ۱۹۱۲ء)

تخلیقِ مقاصد

(ڈاکٹر سر اقبال کے ایک شعر کی تضمین)

ما کہ ہر سُو روز و شب تازندہ ایم! — منزلے را در جہاں جوئندہ ایم
تا نہ بر جوئندہ و یابندہ ایم — از وجودِ خویشتن شرمندہ ایم

"ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم!"

مقصدِ مہر و مہِ تاباں کو دیکھ — مدعائے انجمِ رخشاں کو دیکھ
فرضِ بادِ صرصر و باراں کو دیکھ — پھر کمالِ مطلبِ انساں کو دیکھ

"ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم!"

یہ نہ کہئے مدّعا کوئی نہیں — دل کو گھیرے مدّعا کوئی نہیں
جو نہ رکھے مدّعا، کوئی نہیں — دل یہاں بے مدّعا کوئی نہیں

"ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم!"

بے دلی افسردگی اچھی نہیں — جسم و دل کی کاہلی اچھی نہیں
ترکِ فعل کی بات اچھی نہیں — بے مقاصد زندگی اچھی نہیں

"ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم!"

کیا پہاڑوں میں حجر بڑھتے نہیں؟ — یا کہ جنگل میں شجر بڑھتے نہیں
چرخ پر شمس و قمر بڑھتے نہیں؟ — حیف ہے انساں اگر بڑھتے نہیں

"ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم!"

مقصدِ اعلیٰ ہے اعلیٰ زندگی — مقصدِ ادنیٰ ہے ادنیٰ زندگی
جب نہ ہو مقصد تو پھر کیا زندگی — موت ہے یا بے تمنّا زندگی

"ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم!"

جُوئے نالاں

(ڈاکٹر سر اقبال کے ایک شعر کی تضمین)

اندا غنت ذرّہ دم دررگذاراں — از چارہ رفتم، اے چارہ کاراں
ہم اشک ریزاں، ہم رہ سپاراں — بے راز داراں، بے غمگساراں

"جانم در آویخت با روزگاراں
جوئے است نالاں درکوہساراں"

آغاز پنہاں، انجام پنہاں — مشکوک دیکھی جو کچھ نمایاں
راہِ سفر ہے بے حدّو پایاں — تشویق نالاں، تحقیق حیراں

"جانم درآویخت با روزگاراں
جوئے است نالاں در کوہساراں"

بیچارگی پر ہمیری تبسم! بالانشینو! ہنستے رہو تم!
تصویر کے نقش، ہیں ماہ و انجم ظاہر ہویدا معنی مگر گم

"جانم درآویخت با روزگاراں
جوئے است نالاں در کوہساراں"

دورِ مسلسل شام و سحر کا آیا کدھر سے؟ عازم کدھر کا؟
کچھ ہے بھی یا ہے دھوکا نظر کا ساقی بتاؤں کس کو سفر کا؟

"جانم درآویخت با روزگاراں
جوئے است نالاں در کوہساراں"

رنگیں ہیں نغمے، خونیں ہیں نالے ہنس ہنس کے روتے ہیں سننے والے
بے ساز ہیں گل بے سوز لالے اک سُو ہے سبزہ دامن سنبھالے

"جانم درآویخت با روزگاراں
جوئے است نالاں در کوہساراں"

بُت کے بندے!

(تضمینِ شعرِ حضرتِ اکبر الہ آبادی)

مونسِ غم کوئی درخورِ تمنا نہ ملا! پئے بیماریٔ دل کوئی مسیحا نہ ملا
ہر بشر کہنے کو یاں عشق کا افسانہ ملا کوئی اے دردِ حقیقی! ترا جویا نہ ملا

"جس سے دل اپنا بہلتا کوئی ایسا نہ ملا!
بُت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا!"

عاشقِ شوکت و اجلال و حشم ہیں لاکھوں طالبِ تاج زر و طبل و علم ہیں لاکھوں
اور جادو زدۂ نقشِ درم ہیں لاکھوں یہ نہی وارفتۂ اندازِ صنم ہیں لاکھوں

"جس سے دل اپنا بہلتا کوئی ایسا نہ ملا!
بُت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا!"

دَیر تو خیر اسیرانِ صنم کا گھر تھا ہم نے کعبے میں بھی دیکھا تو یہی پتھر تھا
بات آخر وہی پیش آئی کہ جس کا ڈر تھا یعنی وہ سنگ تھا اور خلقِ خدا کا سر تھا

"جس سے دل اپنا بہلتا کوئی ایسا نہ ملا!
بُت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا!"

(نومبر ۱۹۱۲ء)

پرہیزگاری

(حضرت شیخ سعدیؒ کے شعر کی تضمین)

دُنیا میں آج حیف کہ بازارِ اِتّقا! گرمیٔ مُسکرات کے باعث پڑا ہے سرد
رشیوں کی سرزمیں تھا یہ ہندوستاں پر آج ملتا نہیں ہے ڈھونڈے سے پرہیزگار مرد
خوفِ خدا ہے دل میں نہ آنکھوں میں شرم و مہر اہلِ وطن کے حال پہ روتے ہیں اہلِ درد
شاعر ہیں کرتے پھرتے علانیہ وصفِ مے ابلیسِ دلفریب ہُوا بن کے سُرخ و زرد
عقبیٰ کا کچھ خیال اگر تیرے دل میں ہے لکھ لَوحِ دل پہ بُلبُلِ شیراز کا یہ فرد

"پرہیزگار باش کہ دادارِ آسماں!
فردوس جائے مردمِ پرہیزگار کرد"!

سُوئے دوست

(ایک فارسی شعر کی تضمین)

ناامیدی کی ہزاروں ٹھوکریں کھاتا ہوا اُن کے کوچے سے چلا میں دل کو سمجھاتا ہوا

مشعلِ دانش سے دکھلاتا طریقِ نیک و بد!

اِس گلی سے جا چکا ہے بارہا ناکام تُو پھر بھی ہے محوِ فریبِ گردشِ ایّام تُو!

ہو چکیں رسوائیوں، ناکامیوں کی اب تو حد!

ہو چکیں کتنی جفائیں تجھ پہ اے ناکامِ عشق مصلحت سے کام لے اے دل اب لے تو نامِ عشق

دامِ اُلفت سے رہائی کے لئے کر جہد و جد!

دل نے برافروختہ ہو کر دیا ایسا جواب بن نہ آیا مجھ سے کوئی اس کی باتوں کا جواب

مصرعۂ اوّل پہ چھپٹ ہو گیا پیرِ خرد!

مجھ کو مقتل بھی ہے مامن بھی ہے نادان کو دوست "میگریزم از جفائے دوست لیکن سوئے دوست

چوں شررِ خونم نہاں در تیغِ قاتل میشود"!

تضمینِ اشعارِ غالب

مہرباں کوئی نہ ہو، نامہرباں کوئی نہ ہو
راحتِ جاں، باعثِ آزارِ جاں کوئی نہ ہو
وہ زمیں لے کاش جس پر آسماں کوئی نہ ہو
رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو!

دل سے ہر نقشِ تعلّق کو مٹایا چاہیئے
ہاتھ دُنیا کے جھمیلوں سے اُٹھایا چاہیئے
دُور آبادی سے ویرانے میں جایا چاہیئے
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے

کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو!

منّتِ اہلِ کرم سے ہو نہ غیرت شرمسار!
شکوۂ اہلِ ستم آئے نہ لب پر زینہار
اک سکوتِ دائمی ہر درد کا ہو چارہ کار
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار

اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو!

تضمین

(غزلِ جگر بریلوی)

موت اب باعثِ ہراس نہیں — زندگی موجبِ سپاس نہیں
تاقیاس انتہائے یاس نہیں — تم نہیں پاس کوئی پاس نہیں

اب مجھے زندگی کی آس نہیں:

دیکھئے موت رنگ کیا لائے — وقفِ تسکیں کرے کہ تڑپائے
ڈر ہے وقتِ اخیر جب آئے — کشمکش میں نہ روح پڑ جائے

یوں تو مرنے کا کچھ ہراس نہیں!

گو زباں پہ ہے "ہر چہ بادا باد" مطمئن کب ہے خاطرِ ناشاد
کارِ دنیا ہوا ۔ نہ فکرِ معاد عمر سی عمر ہو گئی برباد

دلِ ناداں عبث اُداس نہیں!

ماتمی سی فضائے دنیا ہے یا کوئی ہولناک صحرا ہے
ہر نفس دشمنِ تمنّا ہے سانس لینے میں درد ہوتا ہے

اب ہوا زندگی کی راس نہیں!

دامنِ زیست چاک ہونے دے غصّہ ہوتا ہے پاک ہونے دے
خاک کو تابناک ہونے دے راہ میں اپنی خاک ہونے دے

اور کچھ میری التماس نہیں!

آگ تھا آپ یہ دلِ مضطر نظر آتا ہے اب جو خاکستر
پوچھ مخدوم زادے جا کر کیا بتاؤں مآلِ شوقِ جگر

آہ! قایم مرے حواس نہیں!

تضمینِ اشعارِ ناصر علی

۱- تن پروری

حاصلِ تن پروری کیا ہے ندامت کے سوا — دُور تر ہوتا ہے اِس سے جلوۂ نورِ لقا
شوقِ ظاہر باعثِ تاریکیٔ باطن ہوا — "ظلمت آبادِ بدن ویراں نمی سازی چرا
شمعِ ایں کاشانہ جُز افتادنِ دیوار نیست"

۲- عشق

ایک ہے تیری زباں پہ دمبدم اظہارِ عشق — دل کبھی سینے میں ہے درخورِ دنبالِ کارِ عشق؟
فکرِ بربادی ہو پہلے، بعد میں اقرارِ عشق — "ہر کجا تعمیرِ ویرانی کُند معمارِ عشق
از غبارِ سیل برپا مے شود دیوارِ ما!"

۳ - دلِ آزردہ

خوش رہو اے خوش دلو! اے ازمایانِ ملکِ جم — دُور ہی اچھا ہے تم سے آبات پابستۂ الم
مجھکو رہنے دو یونہی خلوت نشینِ کنجِ غم — "رنگِ عشرت برنمی تابد دلِ آزردہ ام
سنگسارِ خندۂ کبکم دریں کہسارہا"

۴ - اختلافِ این و آں

کوئی کہتا ہے کہ حادث ہے جہانِ بیش و کم — کوئی کہتا ہے کہ ہے یہ نقشِ دامانِ قِدم
زور دیتا ہے کوئی حُسنِ عمل پر دمبدم — اور شفاعت کے یقیں پر ہے کوئی ثابت قدم
کوئی کہتا ہے قیامت کی صداقت پر قسم — کوئی کہتا ہے تناسخ میں ہے انصاف و کرم
ہے انہی باتوں سے دل میرا رہینِ رنج و غم — "ز اختلافِ این و آں سررشتہ را گم کردہ ام
شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا"

۵ - جوہرِ قابل

گر کوئی دنیا میں ہے عالی نسب والا گہر — قابلِ عزت نہیں، گر خود نہیں ہے باخبر
شرطِ عزت جوہرِ قابل ہے اے صاحب ہنر — "عزتِ اربابِ معنی نیست از نامِ پدر
بے نیاز از بحر گردد قطرہ چوں گوہر شود"

۶۔ ہُنرور

ہر چند ہو وقفِ غم و آلام ہُنرور — ممکن نہیں، پیدا نہ کرے نامِ ہُنرور
بے سود یہ ہنر ہے کہ ہو ناکام ہُنرور — "بالد بخود از سختیِ ایّامِ ہُنرور
آب از جگرِ سنگ خورد دانۂ یاقوت"

۷۔ دلِ آزادگان

آہ! اے دنیائے دوں، اے دشمنِ تسکینِ جاں — تجھ سے کیا ہم کو ملا جز اضطرابِ جاوداں
ہو سکا پورا نہ ہم سے ایک بھی کارِ جہاں — "بارِ دنیا بر نمی تابد دلِ آزادگاں
از نزاکت عکس ہو آئینۂ نازک بود"

(جون ۱۹۲۱ء)

تضمین اشعار صائب

۱- حرصِ دنیا

دل کی جمعیت کو ضائع حرصِ دنیا میں نہ کر باعثِ تسکینِ جاں ہرگز نہیں ہے مال و زر
گر ہے معنی آشنا رکھ قولِ صائب پر نظر "ہر کجا گوہر فزوں تر تشنہ چشمی بیشتر
می طپد چوں ماہیِ بے آب دریا بر زمیں"!

۲- رنگ و بُو

ہر اک بہار کو ہے خدشۂ خزاں درپیش ہر ایک نوش میں پوشیدہ ہے جراحتِ نیش
نہ رنگ بُو کی ہوس میں ہو خستہ و دل ریش "دو ہفتہ گرمیٔ ہنگامہ اش نباشد بیش
علاقہ ہر کہ چو بلبل بہ رنگ و بُو دارد"!

۳۔ پیری اور حرص

ہر سحر اوراد کا جُھرمٹ سے گو اُٹھتا ہے شور — دل سُوئے دنیائے دُوں ہی اور قدم ہے سوئے گور

نفس کا پیری میں ہرگز کم نہیں ہوتا ہے زور — ”خانہ ہائے کہنہ صائب مسکنِ مار و مور

در کہن سالاں بود حرص و تمنّا بیشتر“

۴۔ خوب و زشت

بیزار رنج و راحتِ دُنیا سے دل ہُوا — حیراں تھا میں کہ اس کا کروں اب علاج کیا

دیکھا مجھے اُداس تو صائب نے یوں کہا — ”روشن گہر کسے است کہ ہر خوب و زشت را

بر خویشتن چو آئینہ ہموار کردہ است“

۵۔ داغِ عزیزاں

کس طرح دُنیائے فانی میں رکھوں میں تجھکو شاد — جا کے جو واپس نہ لوٹے، آہ! اے دل اُنکی یاد

ہر گھڑی آمادۂ رحلت ہے جانِ نامراد — ”روح را داغِ عزیزاں نعلِ در آتش نہاد

ورنہ تا صد سال آہنگِ سفر از تن نداشت“

۶۔ جُرمِ ہُنر

نہیں شکایتِ تدویرِ حاسدِ پُرفن   نہیں ہے شکوۂ بیداد ہائے دورِ زمن
عدوِ عیش مقدّر، نہ آسماں دشمن   "بود بجُرمِ ہنر جملہ تنگ عیشیِ من
گرہ چو آئینہ دارم بہ دل ز جوہرِ خویش"

۷۔ بہار

کرشمہ ساز ہیں پھر رنگ و بُوئے افلاک   کہ برگ و گُل سے مبدّل ہوئے خس و خاشاک
یہ فصل ہے طرب انگیز اے دلِ غمناک   "ز نو بہار بہ رقص است ذرّہ ذرّہ خاک
تو نیز جزوِ زمینی، درین بہار مخسپ"

۸۔ خموشی

بیشتر باعثِ آزارِ دل و جاں ہے زباں   خامشی موجبِ تسکینِ دل، آسائشِ جاں
قولِ صائب سے یہی معنی روشن ہیں عیاں   "مُہر زن بر لبِ گفتار کہ در بزمِ جہاں
شمع آسودہ ز کشتن شود از خاموشی"

۹۔ جوانی میں اطاعتِ حق

سخنوروں نے بہت سی ہو گرچہ دادِ سخن　　سخن کے باغ میں گُل ریز ہیں بہت گلبن
ہے آرزوئے سعادت تو قولِ صائب سُن　　"بہ نوبہارِ جوانی اطاعتِ حق کن
کہ چوبِ خشک چو گردید بہ خم نمی گردد"

۱۰۔ فقیری اور امیری

امارت سے سوا راحت فزا ہو فقر اے غافل　　جو اسباب و علائق سے بے نیازی ہو تجھے حاصل
مصیبت پھر ہو فرحت اور آساں ہو ہر اک مشکل　　"بہ عریانی عرق می ریزد از درویشِ صاحبدل
توانگر در سمور و قاقم و سنجاب می لرزد"

۱۱۔ پیری اور غفلت

دل لڑکپن میں مآلِ کار سے تھا نابلد　　اور جوانی میں بھی کمتر تھی تمیزِ نیک و بد
عاقبت پیری ہوئی رہ یوں طفیلِ بختِ بد　　"از شبابِ عمر گفتم غفلتِ من کم شود
زیں صدائے آب سنگیں تر شد آخر خوابِ من"

۱۲۔ تلخیِ احسان

گر شود بے منّتِ شخصے میسّر نیم ناں — شکرِ خالق گفتہ در نعمتِ بسیار داں

الاماں از بارِ احسانِ خلائق الاماں! — "تلخیِ منّت حلاوت می برد از شہدِ جاں

آبرو نتواں برائے آبِ حیواں ریختن"!

۱۳۔ غبارِ کینہ

انساں کا دل ہے گوہرِ شہوار و تابناک — لازم ہے گردِ کیں سے ہمیشہ رہے یہ پاک

گر سینہ اپنا تیغِ ندامت سے چاک چاک — "از جہل کردہ دلِ خود زندہ زیرِ خاک

بر دل اگر ز کینہ غبارے گرفتہ"

۱۴۔ شکایتِ زمانہ

از دلِ سوزانِ من آں پرتوِ انوار بود — یک نمط از بہرِ ہر بیگانہ و غمخوار بود

حاسدانِ بے بصر را باعثِ آزار بود — "روزیِ من بر دلِ ایں تنگ چشماں بار بود

گرچہ در محفل زباں برخاک می سوزم چو شمع"!

۱۵۔ خموشی

چرا لب بستہ دور از ہاؤ ہوئے دہر ننشینم　　مقام عافیت اجز بہ خاموشی نمی بینم
دریں ہنگامۂ عالم خموشی گشت آئینم　　"خموشی شو" بگفتا و دو ملت کرد تلقینم
فراہم گشت از بس رنگہا بے رنگ گردیدم"

قدرت کی غلط بخشی

(تضمین شعر حضرت شیخ سعدیؒ)

دیدار جناب شیخ سعدی کا ہوا　　رویا میں سعادت بہ ہوئی جلوہ نما
کچھ دیر تو شاعری کا مذکور رہا　　پھر میں نے ادب کے ساتھ اُن سے پوچھا
کیا راز ہے قدرت کی غلط بخشی کا　　برجستہ جواب انھوں نے یوں مجھکو دیا
"آنکس کہ تو نگرت نمی گرداند
او مصلحت تو از تو بہتر داند"!

تضمین شعر غالب

جوش؎ کی مستی پہ ہے کیوں معترض تیری نگاہ　　بیگناہی پر ہے اس کی گفتۂ غالب گواہ
قول یہ مرزا کا ہے بے قیل و قال اشتباہ　　"ہے وہی بدمستیٔ ہر ذرّہ کا خود عذرخواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے"

؎ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

۱۔ عاشقانہ شعر و شاعری

اے عشق! تا کجا تری خونیں نوائیاں — اُکتا گئے ہیں اب ترے رنگِ بیاں سے ہم

اے حُسن! تا بہ کے یہ تری خود ستائیاں — بیزار ہو چکے ہیں تری داستاں سے ہم

افسوس ہے کہ اہلِ وطن وقفِ خواب ہیں — خواب آوری میں کم نہ ہوں افسانہ خواں سے ہم

کیوں دیکھتے نہیں کہ کہاں ہیں گرے ہوئے — کیوں سوچتے نہیں کہ گرے ہیں کہاں سے ہم

بیکار زورِ نالہ و فریاد ہے اگر — چونکا سکیں نہ قوم کو خوابِ گراں سے ہم

لازم ہے، کاروانِ وطن کے لئے نہ ہوں
شورِ فغاں میں کم جرسِ کارواں سے ہم

۲۔ حُسنِ مستور

اُسے دیکھیں تو دیکھیں کس طرح ہم — وہ حُسنِ پاک ہے پردوں میں مستور

نمودِ سبزہ و گُل پردۂ رنگ — مہ و خورشید و انجم پردۂ نُور

۳۔ دُعا

اسیرِ رنگ و بُو یکسر رہا دل
تری منزل میں ہے کس کام کا دل
الٰہی، دے مجھے اس دل کے بدلے
حقیقت بیں، حقیقت آشنا دل

۴۔ نفس سب سے بڑا خطرہ

دُنیا مقام ہے خطراتِ عظیم کا
جانِ بشر کے واسطے ہیں جا بہ جا خطر
محروم اُن پہ تیری نظر ہی تو کیا کہ ہے
پہلو میں تیرے نفس نہایت بڑا خطر

۵۔ خیر و شر

محرم خیر و شر کی تجھے چاہیئے تمیز
انساں ہے اور صاحبِ عقل و شعور تُو
توفیقِ خیر تجھ کو خدا نے اگر نہ دی
اتنا تو ہو کہ شر سے رہے دُور دُور تُو!

۶۔ نغمہ

نغمہ کیا ہے؟ شعاعِ حُسنِ ازل
ظاہری آنکھ سے جو ہے مستُور
رُوح کی آنکھ دیکھتی ہے اسے
اور پاتی ہے اُس سے نُور و سرُور!

۷۔ سری کرشن جی

معمور تیرے نغموں سے ہے ہند کی فضا — آنکھوں سے گرچہ بانسری والے! نہاں ہے تو
محدود تیرا فیض کرو کھیشتر تک نہیں — فتح و ظفر ضرور وہاں ہے جہاں ہے تو
سمجھوں صنم پرستی کو ایماں کی انتہا — بت خانے میں اگر صنم دلستاں ہے تو

۸۔ دنیا میں کس طرح رہنا چاہیئے؟

(سنسکرت سے ترجمہ)

اس پرندے کی طرح دنیا میں رہنا چاہیئے — چہچہاتا ہے خوشی سے جو کہ نازک شاخ پر
جھولتی ہے شاخ، لیکن خوف کچھ اس کو نہیں — گر نہیں سکتا کہ ہیں کہ موجود اڑ جانے کو پر

۹۔ دورِ حاضر کے نوجوان

نوجوانانِ دورِ حاضر کا — قدرتی کاروبار ہے کیا خوب
ذوقِ تزئینِ گیسو و رخسار — شغلِ لیل و نہار ہے کیا خوب!

۱۰۔ بڑے شہروں میں

لبِ عشرت پہ تبسم نظر آتا ہے، مگر — آنکھ اخلاق کی روتی ہے بڑے شہروں میں

خلوتِ خاص میں جس بات سے آتی ہے حیا
منظرِ عام پہ ہوتی ہے بڑے شہروں میں!

۱۱۔ شرم و حیا کا نوحہ

کل سرِ شام تھی اک دوشیزہ
سینما ہال کی جانب راہی

راہ میں ایک سہیلی جو ملی
اس کو دینے لگی یوں آگاہی

نئی پکچر ہے نہایت دلکش
قابلِ دید ہے "میرا ماہی"

مرثیہ شرم و حیا کا تھا یہ
یا مری فہم کی ہے کوتاہی

۱۲۔ نوحہ

(۱۹۴۸ء)

دل شاہدِ اردو سے بہلتا تھا ہمارا
شادی و مسرت میں غم و رنج و محن میں

جب ہم کو مقدر نے دیا دیس نکالا
دم ہم نے لیا آن کے اردو کے وطن میں

محرومیِ قسمت کوئی دیکھے تو ہماری
اک اور اضافہ ہوا صدماتِ کہن میں

ہم آئے تو اردو کی یہ حالت ہوئی جیسے
بن میں گلِ پژمردہ ہو یا چاند گہن میں!

لہ "میرا ماہی" ایک فلم کا نام ہے۔ پنجابی میں ماہی معشوق کو کہتے ہیں۔ یہ قطعہ برسوں پہلے پنجاب ہی میں موزوں ہوا۔ (محروم)

۱۳۔ سرمایہ دار اور مزدور

ایثار و لطف و رحم کے جذبوں کے باوجود
حساس مثلِ سنگ بھی انساں نہیں ابھی

"دیوار یا بہشت مزدور سے ہے غم"[1]
سرمایہ دار عائلِ احساں نہیں ابھی

۱۴۔ دورِ اقبال کے شاعر

دورِ اقبال کے سخن آرا
چاندنی رات کے ستارے ہیں

ہاں وہی کچھ نہ کچھ ہیں روشن جو
چاند سے دُور اک کنارے ہیں!

۱۵۔ مزارِ غالب پر

آہ! اے نیّرِ تابانِ جہانِ معنی
اوجِ افلاک پہ یا دفن اسی خاک میں ہے

تری تربت پہ چڑھانے کیلئے لایا ہوں
گوہرِ اشک مرے دیدۂ نمناک میں ہے!

۱۶۔ شہرتِ غالب

سچ تو یہ ہی شہرتِ غالب کو حاصل ہی دوام
رشک بیجا ہے جو اس سے دل کسی کا جل گیا

کیا حقیقت تیری مشتِ خاک کی اے معترض
گرمئ اندیشۂ غالب سے صحرا جل گیا!

[1] مرزا غالب

۱۷- ابوالاثر حفیظ جالندھری

حفیظِ خوش نوا! بزمِ سخن میں — قیامت تک رہے گی یاد تیری
سُرور آمیز ہیں تیرے ترانے — جنوں انگیز ہے فریاد تیری
کیا پابندِ نَے نالے کو تُو نے — یہ طرزِ خاص ہے ایجاد تیری!

۱۸- انارکلی لاہور میں حفیظ جالندھری کا دفتر

دفتر جو بالاخانے پہ دیکھا حفیظ کا — محرم سچ تو یہ ہے کہ دل شاد ہو گیا
رونق ہوئی انارکلی کی چہار چند — بازار سوز و ساز سے آباد ہو گیا
جن منزلوں سے حُسن کبھی جلوہ ریز تھا — اب عشق اُن میں مائلِ فریاد ہو گیا!

۱۹- علامہ کیفی - پنڈت برج موہن دتاتریہ

سنہ ۱۹۴۱ء

دہلی میں دم ہے حضرت کیفی کا مغتنم — مرزا وہی ہیں اور وہی آج میر ہیں
اُن کی نظر سے ذوقِ ادب فیضیاب ہے — گرویدہ اُن کے کودک و برنا و پیر ہیں
ستّر برس کی عمر میں عینک بغیر آپ — لکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں، کتنے بصیر ہیں!

۲۰۔ جنابِ آزاد انصاری مرحوم

سنہ ۱۹۴۱ء

فکرِ رنگیں کی جوانی ہے طبیعت اُن کی — گو سن و سال میں اک پیرِ کہن ہیں آزاد

قابلِ قدر ہیں اور لائقِ تعظیم ہیں یہ — حُسنِ اخلاق کی تصویرِ کہن ہیں آزاد

۲۱۔ جنابِ نوح ناروی

(سنہ ۱۹۴۲ء میں پہلی بار رام پور میں ملنے پر)

جنابِ نوح ہیں اک مردِ صالح اور سلامت رَو

انھیں محروم ہم نے غور سے دو روز دیکھا ہے!

فقط آرائشِ شعر و سخن مطلوب ہے اس سے

اسے سچا نہ سمجھو، یہ جو طوفانوں کا دعویٰ ہے!

۲۲۔ جنابِ منوّر لکھنوی مصنّفِ "نسیمِ عرفاں"

منوّر کہ ہے نازشِ لکھنؤ — درخشندہ ہے اس سے ہی بامِ اُفق

مئے معرفت سے ہی لبریز آج — قضا سے جو چھلکا تھا جامِ اُفق!

۲۳۔ اُردو

یُوں کہا اُردو سے میں نے، اے مری پیاری زباں
تجھ سے چھینا جا رہا ہے کس لئے تیرا مقام

تیرے میخانے پہ خاموشی ہے کیوں چھائی ہوئی
کس لئے خالی پڑے ہیں ساغر و مینا و جام

مدرسوں اور کالجوں میں اب ترا چرچا نہیں
اب نہ جلسے میں نہ دفتر میں ہے تیرا احترام

کیوں نظر آتے ہیں اپنی محفلوں میں بھی اُداس
شاعرانِ خوش نوا، شیریں سخن، رنگیں کلام

کھینچ کر اک آہ اُردو نے دیا مجھکو جواب
پُوچھ اُن سے، ہاتھ میں جن کے ہے بھارت کا نظام

پا سکے انگریز پر قابُو نہ مُسلم لیگ پر
لے رہے ہیں مجھ سے تقسیمِ وطن کا انتقام

۲۴۔ رنگِ سخن

شعر پڑھ کر اہلِ فن اکثر کہا کرتے ہیں یوں
رنگ یہ دہلی کا ہی، یہ لکھنؤ کا رنگ ہے

رنگ لیکن اور ہے محروم کے اشعار کا
اے مبصر! ان میں خونِ آرزو کا رنگ ہے

۲۵۔ نقش برآب

بہا لے جا مرا کاشانہ اے سیلِ تند ترا ذوقِ تباہی گر ہے بیتاب
حقیقت کیا ہے میرے جھونپڑے کی سمجھتا ہوں جہاں کو نقش برآب

۲۶۔ انقلاب

شاعرانِ جدید میں کل تک تم کو گنتے تھے ناقدانِ سخن!
آج محروم ہو گئے تم بھی! یادگارِ سخن ورانِ کہن
جائے حیرت، مقامِ عبرت ہے سرعتِ انقلابِ دورِ زمن

۲۷۔ زمانہ سازی

دنیا کے ساز باز پہ حیراں ہے دل مرا کوئی خوشامدی ہے، کوئی ہے بہانہ ساز
میرا یہ حال ہے کہ زمانہ مرا عدو اس ایک جرم پر کہ نہیں ہوں زمانہ ساز

۲۸۔ مقصدِ حیات

(سنسکرت سے ترجمہ)

بہتے ہوئے اس عالمِ فانی میں اسے ہم پا جائیں تو بہتر ہے، وگرنہ ہے تباہی
جو جان گئے اس کو، سلامت ہیں وہی لوگ باقی ہیں سبھی منزلِ آفات کے راہی

؎ ایک دفعہ تعطیل کرسمس میں وطن مالوف دریا برد ہوتے دیکھا تھا، اس وقت یہ قطعہ موزوں ہوا۔

گر عشق نبودے و غمِ عشق نبودے
چندیں سخنِ نغز کہ گفتے و شنودے

مصنّف کا ابتدائی عاشقانہ کلام

آئندہ صفحات میں جو نظمیں اور غزلیں پیش کی جا رہی ہیں، وہ میرا ابتدائی کلام ہے۔ یہ منظومات آج سے قریب قریب نصف صدی پہلے ہندوستان کے ادبی رسائل مثلاً زمانہ کانپور، مخزن لاہور، ادیب الہ آباد، العصر لکھنؤ، کمال دہلی۔ زبان دہلی، اصلاح سخن لاہور، وغیرہ میں شائع ہوئیں، اور بعد میں "کلام محروم" حصہ سوم کی صورت میں طبع ہوئیں۔ یہ نہیں کہ اُن برسوں میں صرف عاشقانہ اشعار ہی موزوں ہوئے، بلکہ اُن کے ساتھ ساتھ قومی، ملکی، مذہبی، اخلاقی نظمیں بھی کہی جاتی رہیں، اور متفرق رسائل اور اخبارات میں اشاعت پذیر ہوتی رہیں۔ ان میں سے اکثر "گنج معانی" میں شامل اور "کلام محروم" حصہ اول و دوم میں موجود ہیں۔

عاشقانہ کلام سے اُردو کے کسی شاعر کو مفر نہیں۔ ہر شاعر کی شاعری کی

بسم اللہ اسی سے ہوتی ہے۔ میں نے بھی وہی راستہ اختیار کیا جس پر اُردو کے بیشتر شعراء اُس وقت گامزن تھے۔ ساتھ ہی طبیعت نے آزاد اور حالی کی قدّ شاعری کا (جس کو اقبال، سرور اور چکبست نکھار رہے تھے) خوشی سے اثر قبول کیا۔

میں عاشقانہ شاعری کو قصّۂ پارینہ تصور کر چکا تھا، اور "رات گئی، بات گئی" کہہ کر اس قسم کی نظموں اور غزلوں کو دوبارہ شائع کرنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا، لیکن ایک دن مکرمی حضرت جوش ملیح آبادی نے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ آپ کی وہ نظمیں مثلاً "شبِ غم" اور "نامۂ دل ربا" وغیرہ کدھر گئیں جنھیں، ہم عنفوانِ شباب میں مزے لے لے کر گایا کرتے تھے۔ اُن کے اس ارشاد سے میں نے محسوس کیا کہ وہ منظومات بھی جنسِ کاسد نہیں، اور نہ انھیں تلف نہ کر دینا چاہیئے۔ لہٰذا اب کہ "گنجِ معانی" کا ترمیم شدہ ایڈیشن زیرِ اشاعت تھا، یہی بہتر خیال کیا گیا کہ انھیں اسی کتاب میں شامل کر لیا جائے۔

لیجئے جوش صاحب! یہ حصّہ گنجِ معانی کا آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اسے میری ناصحانہ شاعری کا کفارہ سمجھ کر قبول فرمایئے۔ میں تو اب بھی اس پر یہی کہوں گا

بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے، خدا کرے کوئی! (غالب)

تلوک چند محروم

تصویرِ جاناں

موجدِ فوٹوگرافی! صدقے اس ایجاد کے — اُڑ گئے خاکے نقوشِ مانی و بہزاد کے

بند شیشوں میں ترے جادو سے پریاں ہو گئیں — وہ پُرانی داستانیں صرفِ نسیاں ہو گئیں

شاکرِ احساں ہیں تیرے عاشقانِ بے نوا — اور تو کیا پاس ہے، دیتے ہیں وہ تجھ کو دُعا

اپنے اپنے دوست کی تصویر سب کو مل گئی

یا ترے دربار سے جاگیر سب کو مل گئی!

میں بھی زانجملہ ترے احسانمندوں میں ہوں ایک — ہوں ترا مدحت سرا، اور ترے بندوں میں ہوں ایک

آرزو مدت سے تھی تمثالِ جاناں کی مجھے — واہ ہیں! اوج پہ میری قسمت، تو نے وہ دیدی مجھے

ہیں وہی اندازِ دلکش، ہے قدِ رعنا وہی — بھولی بھالی، پیاری پیاری صورتِ زیبا وہی

ہے وہی زُلفِ دوتا، اور ہے خمِ گیسو وہی — چاند سا ماتھا وہی، اور چشمِ پُرجادو وہی

ہے دہن کا نقطۂ موہوم بھی ظاہر یہاں — ہے کمر کا نقشۂ معدوم بھی ظاہر یہاں

انکھڑیوں میں ہے وہی مستی شرابِ ناز کی — غمزہ ہائے جاں فزا میں گفتگو ہے راز کی

نازکا پُتلا وہی اور اُس پہ جوبن ہے وہی — دست و بازو ہیں وہی، سینہ وہی، گردن وہی

مست آنکھیں یہ وہی ہیں، ساغرِ جم کی قسم! — ہیں لبِ جاں بخش وہ ہی، ابنِ مریم کی قسم

کیا ہوا محروم گر عارض کی رنگت اور ہے

سامنا عاشق کا ہے، اس وقت حالت اور ہے!

دیکھتی ہے کس طرح اے چشمِ ظاہر بیں مجھے؟ کیا کہوں کس نے سکھائے دیکھنے آئیں مجھے

طعنہ زن ہیں کیوں نظر بازی پہ میری بے خبر دیکھنے والا ہوں میں بھی، داد لے اہلِ نظر!

کس کو بتلائیں؟ یہاں کوئی نہیں، ہوتا کوئی!

محرمِ رازِ نہاں کوئی نہیں، ہوتا کوئی!

تو تو اے تصویر تھی آئینۂ دل میں نہاں عکس تیرا اُڑ گیا، کاغذ کے پُرزے پر کہاں!

حیف اے کاغذ کے ٹکڑے! مجھکو تجھ سے عار ہے تجھ کو تابِ شعلۂ نارِ عذارِ یار ہے

آہ اے کاغذ کے ٹکڑے! مجھکو تجھ سے پیار ہے تو مرے پہلو میں ہے، پہلو میں تیرے یار ہے

ہو اجازت گر تو سینے سے لگا لوں میں تجھے نقش جو دل میں ہے آ! اُس سے ملا لوں میں تجھے

کس لئے بولے گی ہم سے! یار کی تصویر ہے یہ بہانہ خوب ہے، بے طاقتِ تقریر ہے

دیکھ تو بیٹھا ہوں تیرے سامنے کیا سرنگوں

تو مرے قابو میں کب ہے؟ میں ترے قابو میں ہوں

مجھ کو پہچانا بھی تو نے؟ میں وہی محروم ہوں ہوں وہی شیدا، وہی دل دادۂ مغموم ہوں!

ہوں وہی ناکامِ قسمت! ہوں وہی حرماں نصیب بے وطن! بے یار و بیکس! بے عزیز و بے حبیب!

تجھ کو اپنی بدنصیبی کی سنا کر داستاں یہ نہیں اچھا تجھے غمگیں کروں او جانِ جاں

کچھ سناتا قصۂ شبہائے ہجراں میں تجھے تیری زلفوں کی طرح کرتا پریشاں میں تجھے

سوزشِ دل سے میں سرگرمِ فغاں ہوتا ذرا سرد مہری کا تری بھی امتحاں ہوتا ذرا

یہ مرا اک وہم ہے، ان اُلجھنوں سے کیا تجھے

کوئی روئے، کوئی تڑپے، کچھ نہیں پروا تجھے!

(نومبر ۱۹۰۱ء)

نامۂ دِل رُبا

نہ کہو کہ حال میرا اُنھیں جا کہا صبا نے
یہ کیا ہے کام سارا مرے نالۂ رسا نے

ہوا لطفِ غائبانہ، یہ کرم کیا خدا نے
ثمرِ قبول لا کر مجھے دے دیا دُعا نے

نہ رہا ذرا تغافل۔ نہ رہے ذرا بہانے
پسِ مدّت آ دکھایا یہ اثر مری وفا نے

لکھا اپنے ہاتھ سے خط مجھے میرے دل رُبا نے!

یہ طرازِ دلنوازی، یہ ادائے جانفزائی
مجھے لفظ لفظ اِس کا ہے نویدِ دل کشائی

اُنہی پیارے پیارے ہاتھوں نے لکھی ہے یہ لکھائی
بیدِ صانعِ حقیقی نے رکھی ہے کیا صفائی

ہے اثر کسی نظر کا، کہ حروفِ روشنائی
لگے تیرگیٔ قسمت کو چمک کے یوں مٹانے

لکھا اپنے ہاتھ سے خط مجھے میرے دل رُبا نے!

نہیں کاغذ، اِک چمن ہے، لئے برگ و بارِ رنگیں — یہ نہیں ہیں اِسکی سطریں، ہے بنفشہ زارِ رنگیں
یہ خطوط ترچھے بانکے، ہیں نکیلے خارِ رنگیں — ہیں نقاط داغِ لالہ، کہ ہے داغدارِ رنگیں
نہیں لفظ، ہنس رہے ہیں گُلِ نو بہارِ رنگیں — مجھے اپنے گلبدن کی جو لگے ہیں بو سُنگھانے

لکھا اپنے ہاتھ سے خط مجھے میرے دل رُبا نے!

ہے یہ ثبت نام کس کا، اِسی نام پر فدا ہوں — اِسی نام کی قسم ہے، یہی نام جپ رہا ہوں
جو فراق میں جیا ہوں، اِسی نام پہ جیا ہوں — میں جو مر کے جی اُٹھا ہوں، اِسی نام سے اُٹھا ہوں
اِسی نام سے جہاں میں فقط آشنا ہوا ہوں — یہ ہزار داستانی جو لکھا ہے آشنا نے

لکھا اپنے ہاتھ سے خط مجھے میرے دل رُبا نے!

شب و روز دلفگاری مجھے خوں رُلا رہی تھی — مرا گریہ، میری زاری، مرا تن گھلا رہی تھی
مجھے مرگِ نوجوانی جو کھڑی بُلا رہی تھی — نہ دوا میں کچھ اثر تھا، نہ کوئی دُعا رہی تھی
مری جانِ زار چھپکے سے لبوں پہ آ رہی تھی — کہ پیامِ یار پہنچا مجھے موت سے چھڑانے

لکھا اپنے ہاتھ سے خط مجھے میرے دل رُبا نے!

مرا دل حریمِ حسرت، مرا جاں سرائے غم تھی — سرِ شام یاں اُترتی نئی اِک بلائے غم تھی
جرسِ فغانِ دل کی جو صدا نوائے غم تھی — مرے کاروانِ ہستی کا نشاں صدائے غم تھی
ہوئی نغمۂ مسرت جو نوائے نائے غم تھی — مرے درد کے فسانے ہوئے عیش کے ترانے

لکھا اپنے ہاتھ سے خط مجھے میرے دِل رُبا نے!

اسے چوم لوں فدا میں، اِسے آنکھ سے لگا لوں — دلِ غم نصیب! تیری سبھی حسرتیں نکالوں

نظرِ فلک سے اس کو، میں کسی طرح بچا لوں
کروں چاک اپنا سینہ، اسے پیار سے چھپا لوں
یہ ہے میہمان جانی، اسے دل میں ہی بٹھا لوں
کہ مرے لئے سفر کے، اسے دُکھ تھے اُٹھانے

لکھا اپنے ہاتھ سے خط مجھے میرے دل رُبا نے!

نہ سنبھال مجھکو ساقی! کوئی بھر دے جام مجھکو
مئے بیخودی پلا دے، کہ ہے غم حرام مجھ کو
گئی میری تیرہ بختی۔ یہ ملا پیام مجھکو!
ہوئی صبحِ عید روشن، مری غم کی شام مجھکو
مرے پیارے بیوفا نے ہے لکھا سلام مجھکو
مری سر نوشتِ قسمت کو بدل دیا خدا نے

لکھا اپنے ہاتھ سے خط مجھے میرے دل رُبا نے!

مہِ نوجمال! تیری جو شبیہہ پاس ہوتی
نہ یہ دل اُداس ہوتا، نہ یہ جان بے ہراس ہوتی
مجھے گلشنِ محبت کی ہوا جو راس ہوتی
گلِ ہجر بھی جو کھاتا، تو نہ دل کو یاس ہوتی
مری جان تن حزیں میں نہ کبھی اُداس ہوتی
نہیں پھر بھی کچھ شکایت کہ لگے ہو غم بٹانے

لکھا اپنے ہاتھ سے خط مجھے میرے دل رُبا نے!

(جنوری ۱۹۰۰ء)

شِکوۂ جُدائی

تو گُلشنِ جہاں میں گُلِ نوبہار ہے! (۱) محرومِ زار بھی ترا ہم شکلِ خار ہے
رہتے ہیں گُلستاں میں گُل و خار ایک جا — ہم دونوں کِس لیے نہیں اے یار ایک جا

مشہور تیرا نام جہاں میں ہے سیم تن (۲) زردی میں ہو رہا ہے طلا میرا تن بدن
اے جانِ سیم و زر ہیں تعلّق ضرور ہے — پھر کونسی ہے بات کہ تُو مجھ سے دُور ہے

تو ماہِ دل فروز ہے، داغِ سیاہ میں (۳) ٹیکا کلنک کا ہوں کوئی پُرگناہ میں
چھاتی پہ مہ کی داغ کو دیکھوں جَلا کروں — شبہائے غم میں دستِ تاسُّف مَلا کروں!

قامت پہ تیری تیر کا سب کو گُماں ہوا (۴) اور میرا قد بھی ضعف سے جُھک کماں ہُوا
گو صحبت ایک پل کی ہے تیر و کمان میں! — ہم کو نہیں ہے یہ بھی مُیسّر جہان میں

ہیں تیرے زُلف و خال سیاہی میں لاجواب (۵) اور تیرہ بختیوں میں نہیں ہے مرا جواب

پھر کیوں نہیں رسائی مری زلف و خال تک | مجھ تیرہ روز کا نہیں اُن کو خیال تک

(۶) بیمار تیری نرگسِ شہلا کا نام ہے | آزارِ عشق سے مرا قصہ تمام ہے

اِس کو ذرا نہیں مرے آزار کی خبر! | بیمار کو نہیں غمِ بیمار کی خبر

(۷) تو نازکی میں جانِ جہاں بےمثال ہے | محروم بھی تو شاعرِ نازک خیال ہے

کیوں اِن نزاکتوں میں مری جاں! نفاق ہے | عاشق کا تیرے دشمنِ جاں کیوں فراق ہے

(۸) تجھ کو صفائے حُسن ملی مجھ کو عشقِ پاک | اِن پاکبازیوں پہ بھی ہوں تیرے پا کی خاک

پھر کیوں خفا ہے عاشقِ اندوہناک سے | رنجش ہوئی ہی کیا تجھے اِس مُردہ خاک سے

(۹) "تُو[1] انتہائے حُسن ہی میں انتہائے عشق" | ہے تجھ سے نامِ حُسن تو مجھ سے بقائے عشق

آ مل کے حُسن و عشق کو شیر و شکر کریں | ایامِ غم ہیں تلخ۔ انھیں مختصر کریں

---

[1] یہ مصرعہ ڈاکٹر اقبال کا ہے۔

شبِ غم

دلِ بدنصیب! دیکھا، وہی وقت آگیا ہے
تری تیرہ روزگاری نے اثر دکھا دیا ہے

وہی غمکدہ ہے میرا۔ وہی شامِ غم فزا ہے
وہی تو ہے اور تیری وہی غم بھری صدا ہے

شبِ غم بُری بلا ہے! شبِ غم بُری بلا ہے!

وہی شام دُھندلی دُھندلی، وہی رات کالی کالی
وہی خامشی ہوا میں، وہی بدلیوں کی کالی

وہی شمع پھیکی پھیکی مرے ساتھ رونے والی
وہی میں، وہی مرا دل، وہی مشورے خیالی

شبِ غم بُری بلا ہے! شبِ غم بُری بلا ہے!

وہی جھینگروں کی رُوں رُوں، وہی انکے سازِ وحشت
سرِ شام ہی سے مجھ پر لگے کھلنے رازِ وحشت

میں گزاروں کس طرح سے یہ شبِ درازِ وحشت
رکھوں نام اپنا وحشی، کہ اُٹھاؤں نازِ وحشت

شبِ غم بُری بلا ہے! شبِ غم بُری بلا ہے!

نہ سکون فزائے خاطر ہوئی کچھ ضیائے انجم
مرے زخمِ دل پہ چھڑکا وہ نمک کہ ہائے انجم!

مرے کام کچھ نہ آیا اثرِ ضیائے انجم! — کہ بلائے شب کے دیدے ہوئے دیدہ ہائے انجم!

شبِ غم بُری بلا ہے! شبِ غم بُری بلا ہے!

مرے گھر میں کیوں خموشی؟ مرے دل پہ کیوں تباہی؟ — یہ مکاں ہے یا کہ صحرا! میں مکیں ہوں یا کہ راہی؟

در و بام پر ہے یکسر، شبِ گور کی سیاہی — میں ہوں زندہ یا کہ مُردہ؟ مجھے کیا ہوا الٰہی؟

شبِ غم بُری بلا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے!

میں ہوں گھر میں یوں سفر میں کوئی جیسے بے نوا ہو — اُتر آئے شامِ غربت، وہ غریب تھک گیا ہو

نہ تو ہمسفر ہو کوئی، نہ ہی کوئی رہنما ہو — وہیں بیٹھ جائے حیراں، یہی دل میں کہہ رہا ہو

شبِ غم بُری بلا ہے! شبِ غم بُری بلا ہے!

نظر آ رہی ہیں کیسی، یہ مجھے مہیب شکلیں — ہے غضب! کہ ہوتی جاتی ہیں مرے قریب شکلیں!

مرے واہمے نے کھینچی ہیں کئی عجیب شکلیں — شبِ غم کی ہیں یہ سادی، دلِ غم نصیب شکلیں

شبِ غم بُری بلا ہے! شبِ غم بُری بلا ہے!

مجھے دی مری قضا نے شبِ غم کی میزبانی — مجھے کھائے، یہ بھی ہوگی کوئی رسمِ میہمانی

مری جانِ زار حاضر! مگر آہ! ناتوانی — کہیں دہر میں نہ پھیلے مرے بخل کی کہانی

شبِ غم بُری بلا ہے! شبِ غم بُری بلا ہے

ترے رحم سے بسر ہو یہ شبِ محن الٰہی — نظر آئے پھر کسی کی مجھے انجمن الٰہی

مری روح چھوڑ جائے نہ دیارِ تن الٰہی — کہیں دامنِ شبِ غم ہی بنے کفن الٰہی

شبِ غم بُری بلا ہے! شبِ غم بُری بلا ہے!

(جنوری سنہ ۱۹۱۱ء)

مِل کے روئیں

ہیں دردمند دونوں اور دلفگار دونوں — رُو کر نکالتے ہیں دل کا بخار دونوں

ہم تم ہیں ایک منزل کے رہ سپار دونوں — غم سے پگھلنے والے پایانِ کار دونوں

برسات نے ملائے ، یہ خوب یار دونوں

آ - مِل کے روئیں ہم تم - ابرِ بہار دونوں!

بھاتا ہے مجھ کو رونا ، ابرِ بہار تیرا — ہے موتیوں کی مالا اشکوں کا ہار تیرا

معشوق ہو کہ عاشق ، دونوں ہیں پیار تیرا — بُلبل کو اور گُل کو ، ہے انتظار تیرا

رونے سے تیرے ہوں گے یہ کامگار دونوں

آ - مِل کے روئیں ہم تم ، ابرِ بہار دونوں!

اے ابر! جس طرح سے تیرا ہی کام رونا
تقدیر نے دیا ہے۔ تجھ کو مدام رونا
میرے نصیب میں بھی ہے صبح و شام رونا
رونا تڑپ تڑپ کر، جی تھام تھام رونا

ہیں اپنی اپنی قسمت پہ اشکبار دونوں
آ۔ مل کے روئیں ہم تم۔ ابرِ بہار دونوں!

ہے کیوں یہ اشک ریزی؟ میں اس سے بے خبر ہوں
اتنی خبر ہے مجھ کو رونے سے بہرہ ور ہوں
سر تا پا ہوں گریہ۔ پر محض بے اثر ہوں
تو آسمان پر ہے اور میں زمین پر ہوں

لیکن ہیں فی الحقیقت ہم خاکسار دونوں
آ۔ مل کے روئیں ہم تم۔ ابرِ بہار دونوں!

سینے میں دل ہے میرے۔ اور برق تجھ میں پنہاں
دونوں میں اک تڑپ ہے، بیتاب دونوں یکساں
دونوں مچل مچل کر۔ کرتے ہیں ہم کو حیراں
شوریدہ سر ہیں دونوں! دونوں ہیں خانہ ویراں

وہ دیکھ! کس طرح ہیں اب بے قرار دونوں
آ۔ مل کے روئیں ہم تم۔ ابرِ بہار دونوں!

کرتے ہیں ابرِ نیساں! اب مل کے اشکباری
دیکھیں کہ رنگ لائے، کیا اپنی آہ و زاری
کچھ کر دکھائیں ہم بھی۔ مرضی ہو گر تمہاری
ہو جائے گی یہ دنیا، اک پل میں غرق ساری

جی بھر کے روئیں گے جب زار و قطار دونوں
آ۔ مل کے روئیں ہم تم۔ ابرِ بہار دونوں!

وہ کون ہے؟ جو ہم کو اتنا رُلا رہا ہے — رونے میں اپنے اُس کو کیا جانے کیا مزا ہے
ہنستا ہے رونی صورت، جب اپنی دیکھتا ہے — گر وہ ہنسے تو رونا۔ اپنا بہت بجا ہے

روئیں گے اِس کے آگے، اب زار زار دونوں
آ۔ مِل کے روئیں ہم تم۔ ابرِ بہار دونوں!

دریا کا ہو کنارا۔ چھائی ہوئی گھٹا ہو — بجلی تڑپ رہی ہو، اور چل رہی ہوا ہو
اِک دم مزاج برہم، صبر و قرار کا ہو — قلب و جگر کو تھامے محروم بھی کھڑا ہو

ہو جائیں دل ہی دل میں بے اختیار دونوں
اُس وقت مِل کے روئیں ابرِ بہار دونوں!

(ستمبر ۱۹۰۷ء)

ناکام آرزو

آغازِ آرزو ہو۔ کہ انجامِ آرزو
ہیں آرزو کے ساتھ ہی آلامِ آرزو

ہیچ آرزو و ہیچ ترا انعامِ آرزو
کچھ مجھ سے پوچھ، میں بھی ہوں ناکامِ آرزو

اے ہم نشیں! نہ لیجیو پھر نامِ آرزو!

مجھ پر چلا ہوا ہے کسی کا فسوں ابھی
یادِ طلسمِ کہنہ میں ہوں سرنگوں ابھی

بھولے نہیں ہیں دل کو لبِ لعل گوں ابھی
میں سرگراں خمارِ شبینہ میں ہوں ابھی

ساقی! نہیں ہے آرزوئے جامِ آرزو!

افسردگی وہ درد ہے جس کی دوا نہیں
حسرت وہ زخم ہے جو کسی سے بھرا نہیں

وہ کون ہے جو اس پہ چڑھا اور گرا نہیں
وہ کون ہے جو اس سے گرا اور مرا نہیں

ہر چند کچھ بلند نہیں بامِ آرزو!

اے چارہ گر! تو میرے مرض سے ہے بےخبر
پہلے تو جا کے وہم کا اپنے علاج کر

مجھ کو نہ ضعفِ دل ہے، نہ کمزوریٔ جگر
ہوتا ہے دم مرا نہ ادھر اور نہ کچھ اُدھر

میں نیم جاں ہوں کشتۂ صمصامِ آرزو!

کیا ولولے تھے جب ہوسِ باز دید تھی | کیا جوش تھے جو حسرتِ گفت و شنید تھی
میرے نفس نفس میں صدائے نوید تھی | اُف! کیسی دل فزا مری صبحِ اُمید تھی

جانکاہ اس سے بڑھ کے ہے اب شامِ آرزو!

وہ انتظارِ فصلِ بہاری کی کلفتیں! | وہ برق و باغباں کے ستم کی شکایتیں
دورِ خزاں کی وہ دلِ پُرغم پہ آفتیں | صیّاد میں نے دیکھی ہیں لاکھوں مصیبتیں

تڑپائیو نہ مجھ کو تہِ دامِ آرزو!

کب تھا میں شمعِ مُردہ کی مانند سوگوار | گرمیٔ اضطراب تھی پہلو میں شعلہ بار
وہ جوشِ اشتیاق و تمنائے بیقرار | وہ دن بھی تھے کہ تھا ہمہ تن چشمِ انتظار

سُنتا تھا ذوق و شوق سے پیغامِ آرزو!

پہلو میں دل ہے یوں مرا جیسے پڑا ہوا! | سو جائے جیسے کوئی مسافر تھکا ہوا
اے برق! خوب تجھ سے مرا عقدہ وا ہوا | شاخِ مراد جل کے گری۔ فیصلہ ہوا

پروان چڑھ چکا ثمرِ خامِ آرزو!

ماتم نشینِ حسرتِ مرحوم کون ہے؟ | کل شب سے نالہ ریز نہ معلوم کون ہے؟
محوِ بکا یہ شاعرِ مغموم کون ہے؟ | کیا پوچھتے ہو دوستو محروم کون ہے؟

ہے اک فریب خوردۂ ایّامِ آرزو!

(۱ اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء)

کاش میں بلبلِ چمن ہوتا

کاش میں بلبلِ چمن ہوتا! غنچہ و گل پہ نغمہ زن ہوتا!

عارضِ گل کو چومتا پھرتا صحنِ گلشن میں جھومتا پھرتا

دیکھتا میں ادائیں پھولوں کی! خوب لیتا بلائیں پھولوں کی

شاخِ گل پر نثار ہو جاتا دِل کو حاصل قرار ہو جاتا

پیار کرتا کلی کلی سے میں! چھوٹتا دِل کی بیکلی سے میں

خندۂ گل پہ لوٹ جاتا میں آپ میں مشکلوں سے آتا میں

زیرِ احسانِ ناز میں ہوتا یعنی محوِ نیاز میں ہوتا

جب کہ پہلو میں گل کو لیتا میں جان و دل اس پہ وار دیتا میں

اوس میری رقیب کیوں ہوتی ؟ | پھول کے وہ قریب کیوں ہوتی ؟
ہر سحر اُٹھ کے اِس قدر روتا | روئے گُل آبِ اشک سے دھوتا
سوئے گلشن نسیم کیوں آتی | جب مری آہ کام کر جاتی
سوئے گُل اُسکو بڑھنے دیتا میں ؟ | دستِ گُلچیں نہ کاٹ لیتا میں
صحبتِ گُل میں رات بھر رہنا | مستِ نکہت سے تا سحر رہنا
پھر تپِ غم سے کیوں تپش ہوتی | خارِ فرقت کی کیوں خلش ہوتی

لحنِ دل کش میں یہ غزل گاتا
گُل کی نظروں میں بس سما جاتا

غزل

اے گُل ! اے مایۂ وقارِ چمن ! | طُرّۂ فرقِ افتخارِ چمن
ختم ہے تجھ پہ صنعتِ صانع | بے بدل ہو تُو اے نگارِ چمن
خوبرو کونسا ہے تیرے سوا | نازپروردۂ کنارِ چمن
سر پہ رکھتے ہیں سب حسین تجھکو | تجھ سے ہے خوبی و بہارِ چمن
شانِ شاہی خدا نے بخشی ہو | بیگماں تُو ہے تاجدارِ چمن
مخملی تیرا فرشِ پا انداز | جس کو کہتے ہیں سبزہ زارِ چمن

ہے ترا چاکرِ درِ دولت سروِ آزادِ پاسدارِ چمن

پنکھا جھلتی ہے آکے بادِ نسیم پاؤں دھوتی ہے جوئبارِ چمن

میں جو ہوں بلبلِ نواپرداز ساکنِ کنجِ خوشگوارِ چمن

ہے یہیں تیری محفل آرائی

اس لئے میں بھی ہوں نثارِ چمن

چونک محروم! کس خیال میں ہے کیا دھرا ایسی قیل و قال میں ہے؟

بے خبر دیکھ یوں اگر ہوتا! اک جہاں تجھ پہ نوحہ گر ہوتا

برق و گلچیں و باغباں صیّاد ہوتا ہر ایک مائلِ بیداد

کرتا پھرتا شجر شجر فریاد کون سنتا وہاں مگر فریاد

یہ نہ ہوتا ترے لئے گُل سے جاگتا نشّہ تغافُل سے

حُسن میں یہ جو بے نیازی ہے دشمنِ جانِ عشقبازی ہے

حُسن کیوں چھوڑے اپنی عادت کو مُفت میں کھوئے قدر و قیمت کو

آسماں پر قمر میں تاباں ہو شمعِ محفل میں یا فروزاں ہو

عارضِ گُل میں جلوہ افگن ہو یا کسی کی جبیں میں روشن ہو

کبک و پروانہ بُلبل و محروم جاں سپارانِ جلوۂ موہوم

غمِ فرقت میں بیقرار کوئی جورِ بیجا سے دلفگار کوئی

کوئی جل بُھن کے خاک ہوتا ہے   قصّہ دم بھر میں پاک ہوتا ہے
اشکِ خوں نیں کوئی بہاتا ہے   کوئی کچھ اور گل کِھلاتا ہے
حُسن کِس کا شریک حال ہُوا؟
کِس کے غم سے اُسے ملال ہُوا؟

حسرتِ پرواز

(ترجمہ از انگریزی)

کاشکے اُڑنے کو دو چھوٹے سے پَر ہوتے مرے
اور اک ننھا سا ہوتا طائرِ پرواز میں
آ پہنچتا اُڑ کے تیرے پاس او جانِ جہاں
ذوق و شوقِ وصل میں کرتا ہوا چہکاریں
آہ! لیکن یہ تصوّر اک خیالِ خام ہے
اور تڑپتا ہوں پڑا تنہا یہیں لاچار میں!

نیند میں پیارے! مگر میری یونہی پرواز ہے
اور تیرے پاس آتا ہوں میں ہر شب خواب میں
تب تو گویا ایک عالم ہے مرے زیرِ نگیں
اور لاثانی ہوں میں حشمت میں رعب و داب میں
صبحدم جب آنکھ کھلتی ہے۔ وہی تنہائی ہے
دل کو پاتا ہوں اُسی تشویش و پیچ و تاب میں!

ہے ٹھہرنا نیند کا امرِ محال آ ہی گئی:
بادشہ بھی دے نہیں سکتا اُسے حکمِ قیام
اسلئے جاگ اُٹھتا ہوں لاچار میں پیش از طلوع
نیند ہو جاتی ہے اس صورت میں گو میری حرام
محو ہوتا ہوں طلسمِ جاں فزا میں اسکے میں
بند کر لیتا ہوں آنکھیں دیکھنے کو خوابِ شام!

(سنہ ۱۹۰۶ء)

موسمِ نو بہار میں

جوشِ نمودِ گل سے ہے حُسنِ چمن اُبھار میں
تازہ ادائے پُرخلش نکلی ہے خار خار میں

پھوٹی ہیں کونپلیں نئی پہلوئے شاخسار میں
میں ہی تو ایک غم بھرا دل ہوں لیے کنار میں

اب کے فسردگی ہے اور میرے دلِ نگار میں
ورنہ ہے تازگی وہی موسمِ نو بہار میں!

سرو و سمن بنا ؤ میں، سُنبلِ تر سنگار میں
رکھدئے ہیں پرو کے دل زلف کے تار تار میں

ایسی ادائے دلنواز اب کے ہے برگ و بار میں
داغ پہ داغ پڑگئے سینۂ لالہ زار میں

اب کے فسردگی ہے اور میرے دلِ نگار میں
ورنہ ہے تازگی وہی موسمِ نو بہار میں!

صبحِ بہار خندہ زن دشت میں، کوہسار میں
چشمۂ نور کی جھلک چشمہ و آبشار میں

بکھری ہوئی کرن کرن کسوتِ زرنگار میں
سیر کو بامِ چرخ سے اُتری ہی سبزہ زار میں

اب کے فسردگی ہے اور میرے دلِ فگار میں
ورنہ ہے تازگی وہی موسمِ نوبہار میں!

نغمہ سرا ہیں بلبلیں، دل نہیں اختیار میں
کیوں نہ ہوں دل میں ولولے جبکہ ہو گل کنار میں

محوِ خرامِ ناز یوں سرو ہیں سبزہ زار میں
جیسے نہال قد چلیں مل کے بہم قطار میں

اب کے فسردگی ہے اور میرے دلِ فگار میں
ورنہ ہے تازگی وہی۔ موسمِ نوبہار میں!

ہے وہ غضب کی آب و تاب شبنمِ آبدار میں
ہو نہ تمیز اس میں، اور گوہرِ شاہوار میں

نرگسِ صحنِ باغ کے، دیدۂ پُرخمار میں
یوں ہے عیاں کہ اشک ہو گویا چشمِ یار میں

اب کے فسردگی ہے اور میرے دلِ فگار میں
ورنہ ہے تازگی وہی موسمِ نوبہار میں!

اگلے برس جو رنگ تھا گل کے رُخِ عذار میں
اگلے برس جو داغ تھے سینۂ لالہ زار میں

اگلے برس جو سبزہ تھا پہلوئے جوئبار میں!
اب بھی ہے وہی فضا اور اُسی نکھار میں

اب کے فسردگی ہے اور میرے دلِ فگار میں
ورنہ ہے تازگی وہی موسمِ نوبہار میں

ابرِ بہار! لطف کیا مجھ کو تری پھوار میں
تجھ سے تو کم نہیں ہوں میں گرچہ ہوں حالِ زار میں

اشکِ سیہ اُس کا جوش دیکھ دیدۂ اشکبار میں
برق کی بیقراریاں ہیں دلِ بیقرار میں

اب کے فسردگی ہے اور میرے دلِ فگار میں
ورنہ ہے تازگی وہی موسمِ نوبہار میں!

ہائے وہ دل! جو خوش نہ ہو موسمِ خوشگوار میں
حیف ہے ایسے غنچے پر جو نہ کھلے بہار میں

میری بہار ہمنشیں! گردشِ روزگار میں
یا ہو عدم کے دشت میں یا ہو گلِ مزار میں

اب کے فسردگی ہے اور میرے دلِ فگار میں
ورنہ ہے تازگی وہی موسمِ نوبہار میں!

(جولائی سنہ ۱۹۰۹ء)

پروانہ

آفریں! ننھے سے کیڑے آفریں! — یہ ذرا سی جان یہ عشقِ آتشیں
بڑھ گیا فرہاد و مجنوں سے کہیں! — تیرے مرنے کی ادا ہے دل نشیں

شکوۂ حُسنِ تغافل کیش کیا!
جان دینے کے سوا درپیش کیا!

شہپرِ ذوقِ فنا پر اُڑ چلا! — سوزِ اُلفت کی ہوا پر اُڑ چلا
عشق کے اوجِ سما پر اُڑ چلا — اُڑ چلا راہِ وفا پر اُڑ چلا

گھر سے نکلا جستجوئے یار میں!
تاکہ گم ہو جائے کوئے یار میں!

اُڑتے اُڑتے آن پہنچا شمع پر — وہ جُھلس کر رہ گئے نازک سے پر

ہو گیا افسانۂ غم مختصر — جَل بُجھا بے شکوۂ سوزِ جگر

حُسن کے شُعلے سے لپٹا آن میں

جینے مرنے کو نہ لایا دھیان میں!

اُف! یہ تیرا تھرتھرانا گردِ شمع — اضطرابِ عاشقانہ گردِ شمع

یہ ترا چکر لگانا گردِ شمع — ہے طوافِ مخلصانہ گردِ شمع

شام کو چھپ چھپ کے یہ آنا ترا

چُھپکے چُھپکے ہائے! جَل جانا ترا!

بسکہ ہے دلدادۂ سوزِ وفا — ہو گیا ہے بہرہ اندوزِ وفا

ظُلمتِ شب تجھ کو نورِ روزِ وفا — تیرا جلنا طلعت افروزِ وفا

یہ ترے ننھّے سے پَر تپکے سے بال

ہیں سراپا دفترِ شرحِ وصال!

عشق پروانے کا ہی باقی ہوس — جسکو جلنے میں نہیں کچھ پیش وپس

بوالہوس لاکھوں ہیں یاں مثلِ مگس — ہیں وہ شہرِ عشق میں خاشاک و خس

ایسے عاشق ہر جگہ ہیں خیل خیل

عاشقی بدنام ہے جن کے طفیل!

اے کہ تجھ کو آرزوئے عشق ہے   شامۂ سرمستِ بوئے عشق ہے

جانتا بھی ہے جو خوئے عشق ہے   مشہدِ عشاق کوئے عشق ہے

شمع پر پروانے کو دیکھا نہیں!

عشق بازی کھیل بچوں کا نہیں!

سیکھ پروانے سے آئینِ فنا   جس کا جل بجھنا ہے تلقینِ فنا

شمع خود ہے پیروِ دینِ دفا   قدردانِ منزلت بینِ فنا

ساتھ ڈھلتی رات کے ڈھلتی ہوئی

تا سحر روتی ہے یہ جلتی ہوئی!

دل میں پیدا ہمتِ پروانہ کر   ورنہ مرغِ شوق کا پر۔وانہ کر

رازِ پنہانی کسی پر۔وانہ کر   اپنی ہستی کی ذرا پروا۔نہ کر

دل کو تو پہلے جلا۔پھر آپ جل

عشق کا دعوی ہے۔تو چُپ چاپ چل!

(مارچ ۱۹۱۲ء)

پیغام

۱

اے بادِ سحر! اے بادِ سحر!   اے راہ سپارِ دشتِ سفر
اے راحت بخشِ جان و جگر!   جب اس کی گلی میں ترا ہو گذر

آہستہ ایک صدا دینا!

گر نیند میں ہو وہ رشکِ قمر   دامن کی ہوا سے جگا دینا

اے بادِ صبا! اے بادِ صبا
میرا پیغام سُنا دینا!

۲

یوں کہنا میرے دلبر سے		اُس شوخِ تغافل پرور سے
دل سخت کیا کیوں پتھر سے		کیا کاوش عاشقِ مضطر سے

یوں دل سے کسی کو مٹا دینا!

سیکھا ہے کس غارت گر سے		یوں یاد سے اپنی بھلا دینا

اے بادِ صبا! اے بادِ صبا

میرا پیغام سُنا دینا!

۳

بھاری ہیں صدمے فرقت کے		ٹوٹے ہیں پہاڑ مصیبت کے
پائے ہیں نتیجے اُلفت کے		راتیں غم کی دن آفت کے

دونوں کا کام رُلا دینا!

یہ طور اگر تھے نخوت کے		پہلے ہی سے تھا جتلا دینا

اے بادِ صبا! اے بادِ صبا!

میرا پیغام سُنا دینا!

۴

سُوجھی ہے کس کو جلانے کی		ٹھانی ہے کس کو مٹانے کی
منحوس تھی سارے زمانے کی		ساعت وہ دل کے آنے کی

تیرا وہ نویدِ وفا دینا!

غایت اب مجھ کو ستانے کی جو کچھ ہے مجھے بھی بتا دینا

اے بادِ صبا، اے بادِ صبا!

میرا پیغام سُنا دینا!

۵

تو شاد رہے گلزاروں میں یاں دَورِ خزاں ہی بہار و نہیں

دل شاد کبھی تھے ہزاروں میں اب ہم ہیں غم کے ماروں میں

سیکھا ہنستوں کو رُلا دینا!

جا بیٹھیں گے کہساروں میں کیا شہر سے لینا؟ کیا دینا؟

اے بادِ صبا! اے بادِ صبا!

میرا پیغام سُنا دینا!

۷ جون ۱۹۱۱ء

نگاہِ ناز سے مجھ کو نہ دیکھ!

نگاہِ ناز سے مجھکو نہ دیکھ! پتھر ہوں — گرا نہ برقِ نظر مجھ پہ۔ میں سمندر ہوں
نہ ضائع مجھ پہ کئے جا عبث یہ تیر پہ تیر! — کہ ایسے تیر سلامت تو پھر بہت نخچیر
دل و جگر پہ مرے کچھ اثر ہو۔ ناممکن! — کسک ذرا بھی اِدھر یا اُدھر ہو، ناممکن

جو تیغِ ابرو و تیرِ مژہ سے بسمل ہو!
وہ کیوں جگر ہو مِرا؟ کس لئے مرا دل ہو!

انہی نگاہوں سے دِل کو چھپائے پھرتا ہوں — کہاں کی عاشقی؟ خود جاں بچائے پھرتا ہوں
معاف رکھ! کہ نہیں ہوں میں ناز کے قابل — یہ دل مرا نہیں نذر و نیاز کے قابل
تو گلبدن ہے، مگر آہ تازگی دل کی! — ہزار حیف کہ مُرجھا گئی کلی دل کی
طلسمِ حُسن جو پیشِ نظر تھا۔ ٹوٹ گیا! — حباب تھا کہ وہ جھُوٹا گھر تھا، ٹوٹ گیا

شمیمِ گیسوئے خوباں! ہوائے شوق کہاں
دلِ ستم زدہ میں وہ ادائے شوق کہاں
پناہ مانگتا ہوں اضطرابِ الفت سے!
بچی ہے جان بہ مشکل عذابِ الفت سے
لگی بجھائی ہے دل کی بہ ہزار مشکل سے
ہے بیقرار نے پایا قرار مشکل سے

وہی مثل نہ ہوا اے صبر و ہوش کے بیری!
"ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھیری"

نگاہِ ناز سے مجھ کو نہ دیکھ او کافر!
کہ حُسن و عشق سے بیگانہ ہے دلِ مضطر
دیارِ عشق کی آب و ہوا نہ راس آئی
تو بھاگ نکلا دلِ محوِ ناشکیبائی
حدودِ عشق کو پھر تا ہی کب سے چھوڑے ہوئے
تعلقاتِ محبت تمام توڑے ہوئے
بہت کسی کا ستایا ہوا، بہت مایوس
کسی سے یار و گر اب یہ ہو چکا مانوس
مثالِ بُلبُلِ صحرا، کہ دُور گلشن سے!
ہزار کوس پہ بزم و گُلاب و سوسن سے
بنا کے شاخِ مغیلاں پہ آشیاں اپنا
چھپائے نکہتِ گُل سے بھی وہ نشاں اپنا

کہ دل کو یاد نہ آجائے بیوفائیِ گُل!
بَلا سے وہ پیئے ایذا ہو خار کا چنگل

اگرچہ وادیِ دُنیا ہے خار خارِ تمام
مگر حدیقۂ الفت کو بھی ہزار سلام

گلا رقیب کا مجھ کو۔ نہ یار کا شکوہ!
نہ طرز گردشِ لیل و نہار کا شکوہ!

(نومبر ۱۹۱۲ء)

حسرتِ عشق

واحسرتا! کہ میں نہ ہوا دردمندِ عشق — مجھ کو کیا نہ قابلِ ذوقِ گزندِ عشق

پہنچا نہ آہ! میرے گلو تک کمندِ عشق — تڑپا نہ خاک و خوں میں جراحت پسندِ عشق

پہلوئے دل پہ زخم نہ کاری ہوا کوئی

خونِ جگر سے چشمہ نہ جاری ہوا کوئی!

بجھتی جو آبِ تیغ سے وہ تشنگی نہ دی — دل ہی دیا فضول جو دل کی لگی نہ دی

جو انتہائے عشق ہی، وہ بیخودی نہ دی — کھتی جنیں کی آرزو مجھے، وہ زندگی نہ دی

سوزِ دروں نہیں، تپشِ جانفزا نہیں

کیونکر کہوں، کہ زیست مری بے مزا نہیں!

ساغر سے کیوں گرے مئے جوشاں کو عار ہے — ہم مشربوں سے میری نظر شرمسار ہے

ساقی! تری نگاہِ کرم پہ مدار ہے — مایوس دل نہیں! ابھی امیدوار ہے

قسمت میں خُم نہیں ہے تو اک جام ہی سہی

وہ ہی مثل ہی پھول نہیں پنکھڑی سہی!

ملتا اگر نصیب مجھے عندلیب کا — ہرگز نہیں شکوہ سنج نہ ہوتا نصیب کا
دیتا وہ درد مجھکو جو ذوقِ حبیب کا — محتاج میرا درد نہ ہوتا طبیب کا

آزاد ہو کے کشمکشِ روزگار سے!
ہوتا ترانہ ریز کسی شاخسار سے!

ہوتی مرے نوشتہ میں تقدیر شمع کی — شب ہائے تارِ زیست میں تنویر شمع کی
ملتی جو بزمِ دہر میں توقیر شمع کی — منظور جان و دل سے تھی تعزیر شمع کی

منظور مجھ کو سوز و گدازِ شبانہ تھا
ملتا جو شانِ عشق سے جلنا بُرا نہ تھا!

یا جلتا شب کو شعلۂ جانانہ بن کے میں — یا گرتا شمعِ حُسن پہ پروانہ بن کے میں
یا پھرتا دشتِ نجد میں دیوانہ بن کے میں — اُڑتا ہوا پہ نالۂ مستانہ بن کے میں

یا آوم آوم کہتا ہوا اک اُمنگ میں
گرتا پھسل کے حلقۂ گرداب گنگ میں!

یا رب کدھر گئے مرے لیل و نہارِ عشق — میں خام رہ گیا، نہ ہوا پختہ کارِ عشق
اب کیوں نہیں ہے وہ خلشِ نوکِ خارِ عشق — باغِ جہاں میں آہ! نہ لوٹی بہارِ عشق

پہلو میں دل ہے، دل میں وہ احساس کیوں نہیں؟
اس گُل میں تھی جو پہلے وہ بُو باس کیوں نہیں؟

اے لذتِ فراق! میں تجھ کو ترس گیا — ذوقِ اسیری! ہاتھ سے کُنجِ قفس گیا

اے عشق! الغیاث کہ دنیا میں پھنس گیا گوہر اس آب و تاب کا کیچڑ میں دھنس گیا

اے اضطراب! دیکھ مرا دل ٹھہر چلا

پہلو میں آہ! ولولۂ شوق مر چلا!

ہاں اے نسیمِ آہِ سحر! تجھ کو کیا ہوا اے گریۂ سحاب اثر! تجھ کو کیا ہوا

اے آفتابِ داغِ جگر! تجھ کو کیا ہوا بارانِ اشکِ دیدۂ تر! تجھ کو کیا ہوا

وقفِ خزاں ہوا چمنِ تنگ بوئے دل

رنگیں نہ ہو سکا سخنِ آرزوئے دل!

بے رنگِ عشق خاک ہے تصویرِ زندگی ہے آفتابِ عشق سے تنویرِ زندگی

دل دادگانِ عشق ہیں دلگیرِ زندگی ان کی نظر میں ہیچ ہے توقیرِ زندگی

خاکسترِ وجودِ بشر میں شرر ہے عشق

انساں کو زندہ جانئے ہمدم اگر ہے عشق

ہیں رہنمائی عقل سے منہ اپنا موڑ کر جستے ہے راہ و رسمِ رفاقت کو چھوڑ کر

دربانِ ننگ و نام کی گردن مروڑ کر نکلوں گا ایک دن درِ زنداں کو توڑ کر

وابستہ سلاسلِ اندیشہ تا کجا

سر زیرِ پائے وہمِ جفا پیشہ تا کجا

(فروری ۱۹۱۲ء)

رفتارِ عشق

یاد ہیں ایامِ بے آزارِ الفت کے مزے
تھے سوا اُن سے مگر ردِ محبت کے مزے

ہم انھیں دیکھا کیے اور وہ ہمیں دیکھا کیے
ہائے! وہ پہلی نگاہیں، اجنبیت کے مزے

شوقِ افزوں، مانعِ عرضِ تمنا دابِ حسن
بارہا دل نے اٹھائے ایسی حالت کے مزے

وہ نگاہِ شوق کی گستاخیاں، وہ جرأتیں
ہمت افزا تھوڑی تھوڑی اُلفت کے مزے

پھرتے ہیں آنکھوں میں اب تک، دل کو اب تک یاد ہیں
وہ ادائے گردشِ چشمِ عنایت کے مزے

وہ دلِ پُرآرزوئے عشقِ رسوائی پسند
وہ ہوائے شوق میں ترکِ نصیحت کے مزے

فخرِ الزامِ محبت، پاکبازی پردہ ناز
شیخ پر طعنِ ریا، حوروں کی تہمت کے مزے

وہ تصوّر ہی ہیں وہمِ غیر، قصدِ انتقام
اضطرارِ کشمکشِ خونِ حمیت کے مزے

لذتِ سیرِ چمن اُس غیرتِ گلشن کے ساتھ
سرو کے سائے میں بحثِ قد و قامت کے مزے

رام پاکر اُن کو چھیڑا، اور کیا پیدا بگاڑ
سو طرح پیدا کیے منت سماجت کے مزے

آپ ہی کرنا اُنھیں آمادۂ جور و جفا
آپ ہی پھر رُوٹھنے جا کر شکایت کے مزے

وہ نہ جانا محفلِ جاناں میں بُلوائے پہ بھی
وہ خیالِ امتحانِ جذبِ اُلفت کے مزے

ہائے آخر ہو گئی برہم مری بزمِ نشاط
چرخ کو بھائے نہ میری عیش و عشرت کے مزے!

یار کے عزمِ سفر پر دل کا یوں کہنا مجھے
چل دیئے وہ، آ اُٹھالیں ہم بھی رحلت کے مزے

جلوہ گاہِ یار کے دیوار و در پر ہے نظر!
لے رہا ہے دل مرا چپ چاپ حیرت کے مزے

گرمیٔ اُلفت سے اے محروم پھر ہو گرمِ دل
کچھ نہیں افسردگی ہائے طبیعت کے مزے!

(فروری ۱۹۰۷ء)

دلِ بے قرار سو جا

نہیں عہدِ بتاں کا کوئی اعتبار سو جا — نہ کر انتظار سو جا، دلِ بے قرار سو جا!

تجھے کس کی آرزو ہے؟ میں ترا رفیقِ غم ہوں — مجھے تجھ سے پیار سو جا، تجھے مجھ سے پیار سو جا

وہ کریں گے برق و باراں کا بہانہ مجھ سے آکر — نہ ہو بیقرار سو جا۔ نہ ہو اشکبار سو جا

جو سمجھ ہو تجھ میں ناداں، تو یہ بات خوب سمجھے — کہ جہاں ہیں عہدِ خوباں، نہیں استوار سو جا

تجھے پھینک آؤں گا میں اسی در پہ صبح ہوتے — نہ تڑپ کہ رازِ الفت، نہ ہو آشکار سو جا

نہ حبیب کا گلا ہے، نہ رقیب کی خطا ہے — یہ نصیب کا لکھا ہے، نہیں اختیار سو جا

بڑی میٹھی خوابِ راحت ہے خدائی دیکھو ساری
مگر اک تجھی پہ ظالم ہے، خدا کی مار سو جا!

تضمین غزل جناب آرشد

اُلٹے ہیں کیا زمانے کے اطوار دیکھنا — ہے عجز سے غرور کو پیکار دیکھنا
آزردگانِ دھر پہ آزار دیکھنا — بالائے چشم ابروئے خمدار دیکھنا
بیمار پر کھچی ہے یہ تلوار دیکھنا!

میرے ستم ظریف کا دیکھے کوئی شعار — روتا ہوں میں تو چھیڑ کی لیتا ہے بار بار
پائی وہ دادِ گریہ کہ روؤں نہ زینہار — بولے وہ چھیڑ کر مجھے پایا جو اشکبار
ٹوٹے نہ آنسوؤں کا کہیں تار دیکھنا!

ناز و کرشمہ یعنی یہ اسبابِ دلبری — سب کو دکھا کے کرتے ہو کیوں جلوہ گستری
سودے میں کوئی سود و زیاں سے نہیں بری — تم خود متاعِ دل کے نہ ہو جاؤ مشتری
اچھا نہیں ہے روز کا بازار دیکھنا!

بے صبریاں ہیں کیسی یہ اے آہِ آتشیں! — تیزی ترے اثر کی ضرورت مجھے نہیں
تجھ کو خبر نہیں ہے، وہ کتنے ہیں نازنیں — نازک بہت ہیں چوٹ نہ دل کو لگے کہیں
تھمنا ٹھہرنا، آہِ شرر بار! دیکھنا

فتنے خرامِ ناز سے کیا کیا اُٹھا گئے — ٹھکرا کے خفتگانِ عدم کو جگا گئے

وہ آئے اور تہلکہ آ کر مچا گئے
گھبرا کے حور سے اپنے مزار سے آ گئے
محشر میں اُن کی شوخیِ رفتار دیکھنا!

آمد ہے تیری آج مگر سبزہ زار میں
سب سرو منتظر ہیں لبِ جو قطار میں
جلد آ کہ اک بہار ہو پیدا بہار میں
حیرانی چھا گئی ہے ترے انتظار میں
نرگس کو ہو گیا ہے کچھ آزار دیکھنا!

تمکینِ حسن خیر سے ہونے لگی ہوا
اٹکھیلیاں وہ کرنے لگے صورتِ صبا
جھینے لگا ہے رنگ مرے اضطراب کا
دیتا ہے اُنکی شوخ مزاجی کا کچھ پتا
رہ رہ کے سوئے روزنِ دیوار دیکھنا!

کس کس ادا سے کرتے ہیں عاشق پہ جور وہ
شرمندہ آپ ہوں جو کریں دل میں غور وہ
چھوڑیں گے کب الٰہی! تغافل کے طور وہ
میں آرزوئے دید میں مرتا ہوں اور وہ
کہتے ہیں حشر میں مرا دیدار دیکھنا!

کوچہ ہے میرے گل کا، وہ پھولا پھلا چمن
جس کی فضا کو پہنچے نہ فردوس کا چمن
اللہ! کوئے یار کہاں، وہ کجا چمن
اے عندلیب تجھ کو مبارک ترا چمن
مجھ کو نصیب کوچۂ دلدار دیکھنا!

محروم کے سوال پہ بیٹھے ہیں اُڑ کے وہ
کیسا جواب، صاف نہیں دیتے اکڑ کے وہ
شاید کسی سے آئے تھے پہلے ہی لڑ کے وہ
ارشد جو ... مانگا تو بولے بگڑ کے وہ
یہ دل کرے گا تم کو بہت خوار دیکھنا!

(جولائی سنہ ۱۹۱۱ء)

ترانۂ عشق

(انگریزی سے ترجمہ)

تارے سدا سفر میں ہیں پہرو کے تھامتے ! — دُنیا کے جس مقام پہ اُس کا قیام ہے
آئے گا روئے ماہ نظر خاص خاص وقت — بالائے بامِ چرخ یہی انتظام ہے
دُنیا کے گرد جائے مسافر جہاں کہیں — سیر و سفر کے واسطے عالم تمام ہے
ہو سطحِ بحر پر کہ کسی سبزہ زار میں — ہر اک جگہ پہ جلوۂ خورشید عام ہے

اُلفت بھی ہے یونہی دلِ عاشق کے ساتھ ساتھ
دُنیا کے جس مقام پہ اُس کا قیام ہے!

دُنیا کے جس مقام پہ اُس کا قیام ہے — بجھتا ہوا شرار کواکب کو پائے گا
آخر نقابِ ابر میں بالائے بامِ چرخ! — مُنہ اپنا شاہدِ مہِ تاباں چھپائے گا
قائم ہے یہ نظام طلوع و غروب پر! — خورشید بعدِ شام نظر کس کو آئے گا؟
خورشید ڈوب جائے مگر عشق جلوہ زا — کالی اندھیری رات کو بھی دن بنائے گا

عاشق کی رات ہوگی شبِ قدر سے سوا
دن اُس کو صبحِ عید کے جلوے دکھائے گا!

محبت

(ترجمہ از شکسپیئر)

سراپا اشکِ غم ہونا، کہ آہِ نارسا ہونا
اسی کا نام ہے دنیا میں اُلفت آشنا ہونا

نظر عہدِ وفا پر صدق سے آٹھوں پہر رکھنا
بدل خدمتگزارِ دلبرِ رنگیں ادا ہونا

سراسر پیکرِ جذبات و احساسات بن جانا
عقیدت کیش ہونا، اور اطاعت انتہا ہونا

خیالِ احترامِ حُسنِ جاناں میں مگن رہنا
بعجزِ عاشقی خاکِ سرِ راہِ وفا ہونا

سراپا صبر ہونا اور سراپا محض بے صبری
بہت ضدّین کا دشوار ہے گو ایک جا ہونا

نظر کو اور دل کو صاف رکھنا آزمائش میں
بہ اُمیدِ وفا جینا، پرستارِ جفا ہونا!

عشق

(ترجمہ از شکسپیئر)

مطرب خوشنوا! اگر نغمہ غذائے عشق ہے
تان اُڑاتے جاؤ یونہی، یہ بھی دوائے عشق ہے

اتنی غذا کھلا اسے پھر نہ زیادہ کھا سکے
جذبۂ شوق مر مٹے، پھر نہ یہ سر اُٹھا سکے

ہاں! وہی تان پھر اُڑا طرزِ لطافت آشنا
نغمۂ سامعہ نواز، صورتِ موجۂ صبا!

موجِ صبا چلے کوئی جیسے بنفشہ زار میں
دیتی ہوئی شمیمِ گُل لیتی ہوئی کنار میں

•

بس کر اب اسکو ختم کر، اب تو نہیں ہے دلنواز
آہ! بدل گئی ہے کیا پل میں تری نوائے ساز

تازہ و تیز تر ہے تو، عشقِ تلوّن آشنا
سارے تخیلات کو تیرے وجود میں فنا!

بحر سے کم نہیں ہے کچھ قوّتِ جاذبہ تری
زور یم خیال کو جانتی ہے بلا تری

جذبہ ہو یا خیال ہو، تجھ میں جو کچھ سما گیا
کتنا ہی سربلند ہو، پست سے پست تر ہوا

تو ہے طلسم سر بسر، عشقِ تلوّن آشنا
تیری ہی ایک ذات ہے نقشِ تغیّرات کا!

شمع

(آنریبل پنڈت بشن نرائن ابرؔ لکھنوی کے دو شعروں کی تضمین)

شام سے بزمِ وفا میں پاؤں پھیلاتی ہے شمع
آہ! جم کر بیٹھنے لیکن کہاں پاتی ہے شمع
رسمِ قطعِ راہِ الفت سیکھ کر آتی ہے شمع
ابتدا میں انتہائے عشق دکھلاتی ہے شمع
پاؤں رکھتے ہی یہاں سر سے گزر جاتی ہے شمع!

رہروِ تنہا ہے لیکن یکّہ تازِ عشق ہے
سرفرازِ عشق ہے، محوِ نیازِ عشق ہے
چپکے چپکے مائلِ سوز و گدازِ عشق ہے
بزم کیا خلوت میں بھی یہ پاسِ رازِ عشق ہے
گر ہوا بھی آتی ہے خاموش رہ جاتی ہے شمع!

زوالِ حُسن

(ترجمہ از شیکسپیئر)

معشوقہ تری ہو تجھ سے کم سِن
ورنہ دو چار عشق کے دن
عورت کو سمجھ گلاب کا پھول
پرآں ہے شمیم گل یہ مت بھول
گُل کھِل کے جو نا کمال آیا
گویا وقتِ زوال آیا
گرنے لگیں پتیاں زمیں پر
صادق ہے یہ حُسنِ نازنیں پر!

پیمانِ وفا[1]

(انگریزی سے ترجمہ)

(مزاحیہ)

دُور میری سے رہا میں سال تین ‏ واپسی پر اُس کو پایا باوفا
چھیڑ دی طرزِ وفا پر گفتگو ‏ گو نہ تھی اس بات کی حاجت ذرا
پاس تھے چُولھے کے ہم بیٹھے ہوئے ‏ گرمیٔ اُلفت سے میں نے یوں کہا

---

[1] یہ ترجمہ ایک انگریزی مجموعۂ نظم سے کیا گیا۔ غالباً نام اس کتاب کا Recitation for Girls تھا۔ بوالعجب!

جانِ من! فرقت میں گذریں مدتیں!
دامنِ عہدِ وفا اُجلا رہا!

یوں کہا میری نے اے آرامِ جاں!
دل میں میرے نقش تیرا ہی رہا

مُوبمُو تم کو سُنا دیتی ہوں میں
تین سالوں میں جو کچھ میں نے کیا

اس سے کھُل جائے گا تم پر خود بخود
میں رہی ہوں با وفا یا بے وفا

•

اوّل اوّل جب جُدا تم سے ہوئی
ہو گئی میرے الم کی انتہا!

کھو گئے صبر و قرار و اختیار
دل کو میرے ضبط کا یارا نہ تھا!

جس نے دیکھا میرے حالِ زار کو
درد کو سمجھا وہ میرے لا دوا!

خوبیٔ قسمت کہ ایلڈرناٹ سے
ایک دن کیپٹن کلفرڈ آ گیا

بندھ گئی ڈھارس دلِ ناشاد کی
ساتھ اُس کے جی بہل جانے لگا

اُس سے ہنسنا کھیلنا بھایا مجھے
نوجواں اِتنا سجیلا گو نہ تھا

اُس کی آنکھیں صاف کہتی تھیں کہ ہے
قدر دانِ جوہرِ ناز و ادا

جانِ من! یہ بے وفائی تو نہیں!
تم کہو گے بے وفائی اِس کو کیا؟

پھر سُناؤں دوسرے کی سرگذشت
دوسرا- ہاں! وہ فرنگی فیس تھا

گھر میں وہ میرے چچا کے ایک دن
مجھ سے ایّامِ کرسمس میں ملا

کنجِ گلشن میں جہاں ملے جانِ من
لب سے لب ملتے ہیں اکثر بر ملا

کیا کہوں میں آہ! کتنے پیار سے! بوسۂ اوّل مرا اُس نے لیا!
اس جگہ ہم پورے چھ ہفتے رہے وہ زمانہ کس قدر جلدی گیا!

جانِ من! یہ بے وفائی تو نہیں
تم کہوگے بے وفائی اس کو کیا؟

پھر مرا واقف ہوا وہ نوجواں لارڈ سیسل فوسموٹ اک نیسرا
لگ گیا کوڑا ہمسمندِ ناز کو اُس نے چڑھنے کو مجھے گھوڑا دیا
تھی یہی گھڑ دوڑ اور سیر و شکار وقت ہنستے کھیلتے گذرا مرا
ہاتھ تھے بس اُس کے اور میری کمر کیونکہ گھوڑے پر اُترنا چڑھنا تھا

جانِ من! یہ بے وفائی تو نہیں
تم کہوگے بے وفائی اس کو کیا؟

ریگی ویری کو بھی ہو تم جانتے! گانے والوں میں ہے کتنا خوشنوا
ایک جلسے میں جو ہم باہم ملے! ہوگئی بس ابتدا میں انتہا!
جا کے جنگل میں کا کفٹن کے رہے دونوں باہم اور دنیا سے جدا
ہائے وہ ایام بھی کیا خوب تھے وہ زمانہ زندگی کا عطر تھا
دیکھئے خاتم جو یہ اُنگلی میں ہے نذر کی اس نے بصد صدق و صفا

جانِ من! یہ بے وفائی تو نہیں
تم کہوگے بے وفائی اس کو کیا؟

ہاتھ میری کا ہیں لے کر ہاتھ میں! اس طرح اے دوستو! گویا ہوا
حیف ہے گر ایسے نازک ہاتھ سے ٹوٹ جائے رشتۂ عہد وفا!
وہ لگی کہنے مسز ڈیری ہوں میں اس میں شبہ و شک کی گنجائش ہے کیا

جانِ من! یہ بے وفائی تو نہیں
تم کہو گے بے وفائی اس کو کیا؟

بول اٹھا پھر میں کہ اے آرام جاں! بے وفائی یہ نہیں ہے مطلقا
میں بھی شادی کر کے آیا ہوں یہاں! مل گیا تھا طالبِ دل دوسرا

جانِ من! یہ بے وفائی تو نہیں
تم کہو گی بے وفائی اس کو کیا؟

قطعات

۱

ہے لگا رکھا عبث محروم ہم نے دل کو رو
جی میں آتا ہے کہ ترکِ عشقِ خوباں کیجئے

تا بہ کے یہ بت پرستی، تا کجا یہ کافری
معتکف ہو بیٹھئے، اور ذکرِ یزداں کیجئے

دخل ہو اصنام غارتگر کا اس میں کس لئے
گھر خدا کا ہے یہ دل کیوں اسکو ویراں کیجئے

مصحفِ رخسار میں تشبیہ ہے کمزوری
اس سے یہ مطلب کہ پیدا ضعفِ ایماں کیجئے

مغتنم صبحِ جوانی ہے پئے فکرِ معاد
کیوں سعادت کی سحر کو شامِ حرماں کیجئے

اس سے کیا حاصل کہ پیمانِ حقیقی توڑ کر
سست پیمانوں سے کہئے، عہد و پیماں کیجئے

لٹیے کانٹوں پہ بستر کیوں کسی کے ہجر میں
سوتے سوتے کیوں خیالِ نوکِ مژگاں کیجئے

کس لئے الجھائے گیسو میں دلِ بیتاب کو
خود پریشاں ہو جئے، انکو پریشاں کیجئے

کیسی وحشت چھوڑ کر گھر بار اپنا کس لئے؟
سوئے صحرا جائیے، قطعِ بیاباں کیجئے

ایک دن گھر کو جلا ڈالیں نہ یہ گھر کے چراغ
داغہائے دل سے کیوں ہر شب چراغاں کیجئے

شمع رویوں سے لگایا کیجئے ہرگز نہ لو
کس لئے پھر شکوہ ہائے سوزِ پنہاں کیجئے

روئیے کیوں جا کے کنجِ باغ میں ارتجالاً
گُل کو خنداں کیجئے بلبل کو گریاں کیجئے

فصلِ گُل میں ہو کے کیوں منّت کشِ دستِ جنوں
ٹکڑے داماں کیجئے پُرزے گریباں کیجئے

شاعری کے نام پر اک داغ ہے عشقِ مجاز
فائدہ کیا ہے کہ وصفِ لالہ رویاں کیجئے

کس لئے کہلائیے محروم یعنی نامراد
خود ہی اپنے آپ کو کیوں صرفِ حرماں کیجئے

جن سے اُمیدِ جوابِ خط نہ ہو اُن کے لئے
کس لئے ہر روز فکرِ تازہ عنواں کیجئے

کیجئے موزوں نہ اشعارِ طرب انگیز کیوں
کیوں غزل میں پیروئِ سوگواراں کیجئے

یہ تو سب کچھ کیجئے، پر آ گیا وہ شوخ پھر!
نذرِ دل گزرانئے، یا پیشکشِ جاں کیجئے!

۲

اک روز ہم نے اُن سے کہا ہنس کے راہ میں
"ہم سے مِلا کرو تمھیں دلبر بنائیں گے"

بولے کہ ہاں، مگر مجھے یہ تو بتائیے
دلبر مجھے بنائیں گے؟ کیوں کر بنائیں گے؟

ذرّہ نہیں ہوں میں کہ بزورِ مبالغہ
جس کو خجل کُنِ خورِ محشر بنائیں گے

قطرہ نہیں ہوں میں جسے ہنگامِ فکرِ شعر
لفظوں کی آب و تاب سے گوہر بنائیں گے

حضرت! کبھی یہ تم نے بنانے کی ایک ہی
جو یہ سنیں گے۔ تم کو مقتدر بنائیں گے

دلبر نہیں ہو تم جو سکھاؤ گے دلبری
شاعر ہو یوں کہو کہ سخنور بنائیں گے

سو ہم کو شاعروں سے نہ کچھ شعر سے غرض
اِن کو کبھی نہ عاشقِ مضطر بنائیں گے

ہوں گے خدا کے سامنے ہر وقت! او خدا!
مومن بنیں گے خود، ہمیں کافر بنائیں گے

یہ عشق بھی ہی خوب کہ زُلف سیاہ کو
ظالم بلا کبھی، کبھی اژدر بنائیں گے

مرنے کے بعد بھی ہمیں قاتل پکار کے
اِن ابروؤں کو دشنہ و خنجر بنائیں گے

سیرِ چمن کا شوق بھی اُن کو ضرور ہے
بالوں کو گھاس، رُخ کو گلِ تر بنائیں گے

دل میں اُٹھے گی بادہ پرستی کی لہر جب
بے سوچے سمجھے آنکھوں کو ساغر بنائیں گے

سچ مچ مگس مزاج ہیں ایسے کہ جھوٹ موٹ
جھوٹے لبوں کو قندِ مکرر بنائیں گے

دل کو تو اپنے موم سے سمجھیں گے نرم تر
لیکن ہمارے دل کو یہ پتھر بنائیں گے

لکھیں گے خط کبھی تو چھاپیں گے سو طرح
کاغذ کے ایک پُرزے کو دفتر بنائیں گے

بے پیر و شوخ و قاتل و سفاک کے خطاب
ہم کو عطا کریں گے، فسوں گر بنائیں گے

للکار اُٹھیں گے راہ میں محروم کی طرح
"ہم سے بلا کرو تمھیں پیمبر بنائیں گے"!

۳

بچپن میں دیکھ تجھکو، کہتے تھے لوگ اکثر
چھوڑا اگر قضا نے کچھ یہ ہونہار ہوگا

انجام بیں، اُلفت ہوتا کوئی تو کہتا
ہو کر بڑا جہاں میں کمبخت خوار ہوگا

۴

محروم ہم کو عشق نے شاعر بنا دیا
بے ساختہ زباں سے نکلتی ہے لگی بات

کرتے رہیں گے مولوی صاحب تمام عمر
"مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلات"

رُباعیات

۱

پھر ساتھ عجب دھوم کے آیا ساون
آئی ہے گھٹا جھوم کے۔ آیا ساون
اشکوں کی گھٹا نہ کس مہینے برسی
کب گھر میں نہ محروم کے آیا ساون؟

۲

کیوں عشق میں عمر کھو رہا ہے محروم
خوابِ غفلت میں سو رہا ہے محروم
مژگانِ دراز کا تصور کیسا؟
کانٹے رستے میں بو رہا ہے محروم

۳

محروم یہ دیکھ بھال آخر کب تک؟
خوبوں کا تمہیں خیال آخر کب تک
مانا کسی گُل سے اُنس ہو بھی جائے
رنگِ حسن و جمال آخر کب تک

۴

اُلفت کا مآل دیکھنا تھا اے دل
کرنا تھا خیال، دیکھنا تھا اے دل
خوبانِ جہاں پہ تو بہت للچایا
اپنا بھی جمال دیکھنا تھا اے دل!

۵

دیکھا ہم نے کبھی ہے نا شاد دل کا
ہنگامہ کبھی تھا آہ! برپا دل کا

باقی کچھ کچھ ہیں حسرتوں کے آثار
اُجڑے ہوئے شہر کا ہے نقشہ دل کا!

۶

کیا خوب ادا سیکھی ہے جل جانے کی
رونے کی ضرورت ہے نہ چلّانے کی
محروم سلگ سلگ کے جینا کیسا
ہے قابلِ رشک موت پروانے کی!

۷

حرماں ہی ازل سے گو نصیبِ محروم!
اغیار کا کب ہوا حبیبِ محروم
بہتر ہو مرا رقیب مجھ سے کیوں کر
محروم ہوں میں تو وہ رقیبِ محروم

۸

اُلفت کا اثر چھپائے کوئی کیوں کر
ہاں! سوزِ جگر چھپائے کوئی کیوں کر
کب تک نہ ہو شعلۂ محبت ظاہر!
دامن میں شرر چھپائے کوئی کیوں کر

۹

دنیا فانی ہے اور ہم بھی فانی
درویش بھی، شاہِ باحشم بھی فانی
فانی ہر چیز ہے، پر افسوس! کہ ہیں
دِل کش نازآفریں صنم بھی فانی

۱۰

بے حد ہوئے، بے شمار ٹوٹے وعدے
ہم نے بھی عوض میں دل کے لُوٹے وعدے
تاثیرِ لبِ شکرفشاں سے ظالم!
کتنے میٹھے ہیں تیرے جھوٹے وعدے!

غزلیات[1]

ہر سمت اک ظہور ہے تیرے جمال کا
تو نورِ شرق و غرب و جنوب و شمال کا

ماہِ تمام نیم تبسم ہے اک ترا!
خورشید ایک شمّہ ہے تیرے جلال کا

پائی ہے تجھ سے چشمِ کواکب نے روشنی
تمغہ دیا ہے بدر کو تو نے کمال کا

دیتا ہے "ناتواں کو توانائی عروج"
اوجِ فلک سے ہے یہ اشارہ ہلال کا

تو ہے نہاں مگر ترے جلوے کہاں نہیں
ہر لختِ سنگ آئینہ تیرے جمال کا

خود اُس کے حسن کو بھی تماشا کرے کوئی
صانع جو رُخِ گُل کا ہی چشمِ غزال کا

محروم اک اُمید پہ ہوں گرمِ جستجو
"لا تقنطوا" جواب ہے میرے سوال کا

---

[1] بیشتر غزلیں رسالہ "اصلاحِ سخن" لاہور اور "کمال" دہلی کی طرحوں میں لکھی گئیں اور انہی رسالوں میں شائع ہوئیں۔

شبِ محفلِ عدو میں جو وہ ہم سے دُور تھا!
دستِ رسائے شوق! یہ کس کا قصور تھا!
دکھلائی کیوں نہ شعلۂ رخسار کی جھلک
گر تم کو میرے جی کا جلانا ضرور تھا!
اظہارِ شوقِ دید پہ عذرِ حجاب ہے!
ہاں پھر وہ کس کا جلوہ سرِ کوہِ طور تھا!
پہلے ہی دور میں ہوئے ہوش و حواس گُم!
توبہ! شرابِ عشق میں کتنا سرور تھا!
حُسنِ کلام صدقۂ ذوقِ جمال ہے
محروم شاعری کا ہمیں کب شعور تھا!

(جولائی ۱۹۰۹ء)

ہمارے واسطے ہے ایک جینا اور مر جانا
کہ ہم نے زندگی کو جادۂ راہِ سفر جانا

یکایک منزلِ آفاتِ عالم سے گزر جانا
ڈریں کیوں موت سے جب ہے اِسی کا نام مر جانا

تری نظروں سے گر جانا، ترے دل سے اُتر جانا
یہ وہ افتاد ہے جس سے بہت اچھا ہی مر جانا

جواباً برہنیاں تجھکو ہم نے چشمِ تر جانا
کہ ہر اک قطرۂ اشکِ چکیدہ کو گہر جانا

ہم اپنے رہزن و رہبر تھے لیکن سادہ لوحی ہے
کسی کو راہزن سمجھے، کسی کو راہبر جانا

ہیں ایسے راہرو کی جستجو میں مر مٹا جس نے
تنِ خاکی کو راہِ عشق میں گردِ سفر جانا

لبِ بام آئے تم اور اُن کے چہرے ہو گئے پھیکے
قمر نے تم کو خورشید اور تاروں نے قمر جانا

نہ بھولے گا ہمیں محروم صبحِ روزِ محشر تک[1]
کسی کا موت کے آغوش میں وقتِ سحر جانا!

---

[1] مقطع بعد میں شامل ہوا۔ اہلیہ کی وفات کی طرف اشارہ ہے۔ (محروم)

جس پہ رندوں کو گمانِ لغزشِ مستانہ تھا
پائے ساقی پر وہ اپنا سجدۂ شکرانہ تھا!

دشت پیمائے جنوں تھا کوئے لیلیٰ چھوڑ کر
عاشقِ صادق ہوا اپنے قیس، پر دیوانہ تھا

نام کوثر رکھ دیا، ہم سے چھپانے کے لئے
بزمِ واعظ میں کبھی ذکرِ عشرتِ میخانہ تھا

بے تحاشا کون پڑتا ہے پرائی آگ میں
سوزِ الفت کا ہیولیٰ تھا، کہاں پروانہ تھا

سردِ مہریہائے خوباں سے ٹھٹھر کر رہ گیا!
ورنہ دِل اپنا ثمرا بہ ذوقِ بیتابانہ تھا

ہمنشیں! مجھسے نہ کر ذکرِ فراغتہائے زیست
دام کے نیچے مری قسمت کا دانہ دانہ تھا

وصل سے کچھ کبھی نہ تھی کم زلفِ شبہائے ہجر!
شمعِ شامِ غم خیالِ جلوۂ جانانہ تھا

وسعتِ وحشت کی تجھسے کیا کہیں اے قیس ہم
جو ترا نہ ویرانہ تھا، اپنا وہ خلوت خانہ تھا

بختِ خوابیدہ کی تاثیرِ نہاں سے سو گئے
ورنہ خواب آور کہاں محشر کا افسانہ تھا!

سرِ مدفن مرے جوشِ بہارِ نرگسستاں تھا
کہ وقتِ نزع بھی مجھ کو خیالِ چشمِ جاناں تھا

وہیں تک ضبطِ وحشت میں دلِ بیتاب کوشاں تھا
ترے کوچے سے ہم نکلے، تو پھر کوسوں بیاباں تھا

اٹک رہنا قیامت تھا، نکلنا دشمنِ جاں تھا
یہ پیکاں تھا کسی کا، یا ہمارے دل کا ارماں تھا

رُخ و گیسو کو تیرے دیکھ کر کیا کوئی خوش ہوتا
وہ حیرانی کا باعث، یہ پریشانی کا ساماں تھا

مری تحریرِ قسمت کے لئے او کاتبِ قسمت!
بجائے روشنائی کیا، سوادِ شامِ ہجراں تھا؟

حیرت زدہ میں اُن کے مقابل میں رہ گیا
جو دل کا مُدّعا تھا، مرے دل میں رہ گیا
خنجر کا وار کرتے ہی قاتل رواں ہوا
ارمانِ دید دیدۂ بسمل میں رہ گیا
جتنی صفا تھی سب رُخِ جاناں میں آگئی
"جو داغ رہ گیا مہِ کامل میں رہ گیا"
اے ہمرہانِ دشتِ محبّت چلے چلو
اپنا تو پائے شوق سلاسل میں رہ گیا
وحشت فزا بہت تھی ہوا دشتِ قیس کی
پردہ کسی کا پردۂ محمل میں رہ گیا
محرومؔ دل کے ہاتھ سے جاں تھی عذاب میں
اچّھا ہوا کہ یار کی محفل میں رہ گیا!

زہے قسمت! اگر تم کو ہمارا دل پسند آیا

مگر یہ داغ کیونکر اے مہِ کامل پسند آیا

کیا ہے قتل، لیکن دیکھئے جاں کب نکلتی ہے!

کہ اُن کو رقصِ بیتابانۂ بسمل پسند آیا

جو مومن بھی ہے، مانگے گا دُعا صدقِ تناسخ کی

ترے ہاتھوں سے مرنا جس کو اے قاتل پسند آیا

نہ پوچھو کب سے میں شامل ہوا ہوں تیرہ بختوں میں

کسی کے عارضِ روشن کا جب سے تل پسند آیا

یہ گستاخی ہے اے مخدوم، اپنی حد سے بڑھنا ہے

کہ تا حدِ زمینِ غالبِ مشکل پسند آیا

شہرہ تمہارے حُسن کا، اب عام ہوگیا
رکھیو معاف، اگر کوئی بدنام ہوگیا

اے دل! ترے طفیل ہوں مشہور عشقباز
تو نے کیا تھا کام۔ مرا نام ہوگیا

چشمِ بتاں میں ہے کوئی تسخیر کا عمل
جس پر پڑی نگاہ۔ وہی رام ہوگیا

مر ہی گیا خوشی سے میں سُن کر پیامِ دوست
پیغامِ وصل موت کا پیغام ہوگیا

پھرنے میں کس لئے نہیں آتے ہیں دن مرے
کیا بند دورِ گردشِ ایام ہوگیا

اے دل یہ کیا فسردگی آغازِ عشق میں
گُل کیوں ترا چراغ سرِ شام ہوگیا

محروم کو کبھی طاعتِ خالق پہ ناز تھا
سُنتے ہیں اب تو بندۂ اصنام ہوگیا

محروم فصلِ گُل کا ہمیں انتظار کیا؟ — زندہ کرے گی مُردوں کو یادِ بہار کیا[*]

تم سے رکھے اُمید کوئی خاکسار کیا! — دامن پہ رہ سکا ہے کسی کا غبار کیا؟

ہم خوش ہوں اے تصورِ مژگانِ یار کیا — راحت فزائے دل ہو کلیجے کا خار کیا

ہو دورِ غم، کہ عہدِ خوشی دونوں ایک ہیں — دونوں گذشتنی ہیں، خزاں کیا بہار کیا!

پژمردہ جب سے ہے دلِ غمدیدہ کی کلی — میرے لئے ہیں ایک خزاں کیا بہار کیا

پہلی سی وہ تڑپ ہی، نہ پہلا سا اضطراب — پہلو میں مر گیا ہے، دلِ بیقرار کیا؟

دل خوش ہوا خرامشِ بادِ نسیم سے — یاد آگئی نزاکتِ رفتارِ یار کیا؟

اُس سحرِ فن کے پاس سناں تھی نہ تیر تھا — پھر ہو گیا الٰہی کلیجے کے پار کیا؟

ہم بیکسوں سے سختیٔ عہدِ فراق پوچھ — اے بیخبر کسی سے بڑھاتا ہے پیار کیا؟

حُسنِ بُتاں ہے مایۂ ہستی سو بے ثبات — مانگیں دعائے زندگیٔ پائدار کیا!

آئے گا اب نہ وہ گُلِ خنداں نظر کہیں
محروم فصلِ گُل کا ہمیں انتظار کیا!

---

[*] یہ غزل بھی اہلیہ کی وفات کے بعد کی ہے۔ (محروم)

ہے جانتا بھی کہ ہوگا انجام نا اُمیدی اس آرزو کا

یہ دل کا دیوانہ پن تو دیکھو کہ پھر بھی سودا ہے جستجو کا

نہ کچھ صدائے شکست اس میں نہ اُس میں پروانکی صدا ہے

نہیں ہے کچھ اعتبار اے باغباں، ترے گل کے رنگ و بو کا

نہ ساغرِ دل کو چھیڑ میرے، کہ ہوں گے آلودہ دست و داماں

سنبھل کے ساقی یہ سمجھ کے ناداں! بھرا ہوا جام ہے لہو کا

کسی کے عذرِ حجاب پر ہم نہ چھوڑ بیٹھیں گے دل کا دعوے

وہ سامنے آ ہی جائیں اپنے تو فیصلہ ہوگا روبرو کا

پڑھا جو تعریفِ تابِ دنداں میں شعر میں نے کنارِ دریا

صدف سے نکلی صدا کہ ڈوبا سفینہ گوہر کی آبرو کا

پردہ جو اُٹھے تری جبیں کا — شرمندہ ہو چاند چودھویں کا

کمبخت کے پیچھے کس کو بھیجوں — قاصد بھی تو ہو رہا وہیں کا

مُثبت ہے نفی، نفی تو مطلب — ہاں ہوگا تری نہیں نہیں کا

دے ہاتھ سے گر وہ رشکِ شیریں — ہو زہر میں لطف انگبیں کا

حیرت میں ہوں دیکھ بتکدے کو — اللہ! یہ گھر ہے کس مکیں کا

دیکھو تو ضیائے ماہ و خورشید — پرتو ہے تمام اک حسیں کا

آرام کہیں نہیں ہے دل کو — ہر وقت خیال ہے وہیں کا

تربت پہ مری اُگے گی سُنبل — کُشتہ ہوں میں زلفِ عنبریں کا

ہے روزِ ازل سے تیرہ قسمت — عاشق تری چشمِ سُرمگیں کا

محروم ہے، اور بے خودی ہے
دُنیا کا خیال ہے، نہ دیں کا!

ستم کوئی نیا ایجاد کرنا
تو مجھ کو بھی مری جاں! یاد کرنا
قیامت ہے دلِ نالاں قیامت
ترا رہ رہ کے یہ فریاد کرنا
چلو اب لطف ہی کو آزماؤ
تمھیں آتا نہیں بیداد کرنا
مرے کو مارنا ہے او ستمگر!
شہیدِ ناز پر بیداد کرنا
اسیرِ زُلف ہے محروم اُن کا
جنھیں آتا نہیں آزاد کرنا

بدنام ہوں پر عاشقِ بدنام تمہارا ناکام ہوں پر طالبِ ناکام تمہارا

میں اس کو نہ بیچوں عوضِ ملکِ سلیماں ہے ثبت سرِ خاتمِ دل نام تمہارا

ہاں ساغرِ دل خونِ تمنّا سے بھرا ہے پُر بادۂ گلگوں سے وہاں جام تمہارا

محرومیٔ قسمت ہے مری خاص دگرنہ مشہورِ جہاں ہے کرمِ عام تمہارا

چھپتے نہیں نظروں میں مہ و مہر کے جلوے رہتا ہے تصوّر سحر و شام تمہارا

تم جس سے پھرو، اُس سے ہو برگشتہ زمانہ دم بھرنے لگی گردشِ ایّام تمہارا

جاتی رہی دل سے ہوسِ سیرِ گُلستاں جب سے نظر آیا رُخِ گُلفام تمہارا

غفلت میں کٹی جاتی ہے محروم جوانی
اچھا نظر آتا نہیں انجام تمہارا!

مُسکراہٹ ہے کسی کی خندۂ گُل کا جواب
گریہ اپنا گریۂ خونینِ بُلبل کا جواب

ہیں بتوں کی مُشکبو زُلفیں تو چہرے لالہ رنگ
ہند کا ہر شہر ہے تاتار و کابُل کا جواب

پنجۂ وحشت سے کچھ کچھ دیدۂ خونبار سے
"دامنِ عاشق بنا ہے دامنِ گُل کا جواب"

سرنگوں خورشید ہے، ماہِ مبیں ہے داغدار
کس سے بن آئے تری شانِ تجمّل کا جواب

باغِ دنیا سے اُٹھیں گے، دیکھ لینا شادؔ شاد
ہیں سبک روحی میں ہم بھی نکہتِ گُل کا جواب

شعرِ طالبؔ[1] پر تو اے محرم مجھ کو وجد ہے
ہے یہ طالب طالبِ خوشگو کے آمل کا جواب

---

[1] منشی ونائک پرشاد طالبؔ بنارسی مشہور ڈراماٹسٹ اور شاعر

(جنوری سنہ ۱۹۱۰ء)

نہاں رہا شاہدِ حقیقی، جمالِ قدرت دکھا دکھا کر
دکھائے ظلمت کے اور طبقے خرد نے پردے اٹھا اٹھا کر

سمجھ میں آیا نہ رازِ صنعت ذرا بھی صورت گرِ ازل کا
بنا رہا ہے مٹا مٹا کر، مٹا رہا ہے بنا بنا کر!

صنم اگر دیرِ شش جہت میں ذریعۂ یادِ حق نہ ہوتے
تو ذکر پر ان کے شیخ و زاہد نہ بول اُٹھتے "خدا خدا کر"

عزیز ذلت کو کر دیا ہے، ذلیل عزت کو کر دیا ہے
عدو کو سر پہ چڑھا چڑھا کر، نظر سے ہم کو گرا گرا کر

الٰہی اہلِ وطن پہ کب تک رہے گا خوابِ گراں کا عالم
کہ سو گئے بسترِ عدم پہ جگانے والے جگا جگا کر

وہ شوخ پہلے ہی تھا تجبُّو کا، بُرا ہوا غیارِ فتنہ جُو کا!
بگاڑ ڈالا ہے اَور اُس کو لگا لگا کر، سجھا سجھا کر

اگر ہے منظور سربلندی، تو دُور نظروں سے کر بلندی
کہ اوجِ شمس و قمر نے پایا ہے سر کو اپنے جُھکا جُھکا کر

کمالِ طرزِ ستم ظریفی، مگر وہ کیا دے گا داد اِس کی
یہ غیر سے اور ذکر میرا، مجھی کو ظالم! سُنا سُنا کر

جو بُت کو بُت دیکھتا ہو واعظ اُسی کو جا کر سُنا یہ باتیں
جنابِ مخدوم اور ترکِ صنم پرستی، خدا خدا کر!

جب وہ سمجھے شعلۂ آہِ رسا کو دیکھ کر
جل گیا میں اپنی تاثیرِ وفا کو دیکھ کر

یاد ہے ابتک طبیبوں کو وہ حسرت کا سماں
آسماں کو دیکھنا میرا دوا کو دیکھ کر

آرزوئیں اپنے دل کی مل گئیں سب خاک میں
غیر کے کوچے میں تیرے نقشِ پا کو دیکھ کر

دیکھ کر خوابِ زلیخا چونک اُٹھے روزِ ازل
"ہو گئے ہم آشنا نا آشنا کو دیکھ کر"

ہم کو یاد آیا گیا گلشن میں وہ سروِ ناز
لغزشِ مستانۂ بادِ صبا کو دیکھ کر

کیا ہی بیجا ہے یہ استعمالِ رحمتہائے حق
رو سیہ کرتے ہیں مے نوشی گھٹا کو دیکھ کر

فکرِ روزی کیلئے بیشک ہے گردش لازمی
ہم کو سوجھا ہے یہ مضموں آسیا کو دیکھ کر

خواب میں بھی رات بھر آہو نظر آتے رہے
شب جو سوئے تیری چشمِ فتنہ زا کو دیکھ کر

ہاں چلا چل اے دلِ پُر ذوق یہ منزل نہیں
کیوں ہے ششدر تو طلسمِ ماسوا کو دیکھ کر

فکر کی صیقل پہ اے محرؔ دم یوں چمکا اُسے
آئنہ پانی ہو طبعِ پُر صفا کو دیکھ کر!

بوئے کمال تجھ میں اگر ہے وطن کو چھوڑ
کیا قدر نافہ کی جو نہ آئے ختن کو چھوڑ

ہوں بیقرار جب سے چلا ہوں وطن کو چھوڑ
بیتاب عندلیب ہو جیسے چمن کو چھوڑ

اُس رشک یاسمن کا نظارا کیا نہیں
اے عندلیب! وصف گل و نسترن کو چھوڑ

کبھی بھی کج سرشتوں کا زیور رہے مہر بسر
کس کام کی ہے زُلف اگر وہ شکن کو چھوڑ

محروم تجھ کو یاد نہیں مصرعہ امیر
"آرام چاہتا ہے تو فکرِ سخن کو چھوڑ"

ہم دل جلوں کو اے بُتِ نامہرباں نہ چھیڑ
بھڑکے گا اور شعلۂ سوزِ نہاں، نہ چھیڑ

صیّاد اور خزاں کے ستم اس پہ کم نہیں
تو عندلیبِ زار کو اے باغباں نہ چھیڑ

دُنیا میں اے زباں! روشِ صلحِ کُل نہ چھوڑ
جس سے کسی کو رنج ہو ایسا بیاں نہ چھیڑ

ہمدم! کہیں نہ حسرتِ خوابیدہ جاگ اُٹھے
ایّامِ حُسن و عشق کی پھر داستاں نہ چھیڑ

ہے خاتمہ قریب جوانی کی رات کا
محروم پھر فسانۂ زُلفِ بُتاں نہ چھیڑ

وہ بتِ شوخ ہوا رام غلط
دعوئے مدعیِ خام غلط

ترکِ عشقِ بتِ خودکام غلط
ہم پہ واللہ یہ الزام غلط

کوئی تدبیر نہ بیٹھے گی درست
غم نہ ہوگا دلِ ناکام غلط

شکر اے دل! نہ ہوئی شادی گر
کہہ دیا تھا کہ ہے پیغام غلط

چشمِ فتاں کی عنایت ہیں یہ
فتنۂ گردشِ ایام غلط

بلبلِ مستِ بہاراں ہم ہیں
اثرِ بادۂ گلفام غلط

ہجر میں رات گذرتی ہی نہیں
توسنِ عمرِ سبک گام غلط

قیس و فرہاد نے پایا کیا نام
مرد ہو عشق سے بدنام غلط

کس کی حسرت ہے بتا دے ہم کو
ورنہ محشر ہو ترا نام غلط

مرا حالِ غم ہے سُنانے کے قابل

نہیں پر ابھی تم رُلانے کے قابل!

اُٹھانے کے قابل ہیں سب ناز تیرے

مگر ہم کہاں ناز اُٹھانے کے قابل

مجھے دیکھ کر آج مقتل میں بولے

یہ عاشق بھی ہے آزمانے کے قابل

مزا غم میں کچھ بوالہوس کو نہ آیا

یہی ایک نعمت تھی کھانے کے قابل

سمجھ لو، کہ دل ہو گیا گھر خدا کا

ہوا جب بُتوں کے بسانے کے قابل

سُنے کون سرحد[1] میں محروم ان کو

ترے شعر ہیں داد پانے کے قابل

---

[1] شمال مغربی سرحدی صوبہ، جہاں بزمانۂ طالب علمی یہ غزل موزوں ہوئی۔

فوّارہ ساں نہ جوشِ خودی میں اُچھل کے چل

نیچا ہے سرِ غرور کا، غافل سنبھل کے چل

کر دے نہ سست رَو یہ تیرا ہم سفر تجھے

اے تیغِ یار ساتھ نہ مل کر اجل کے چل

چالیس تو چل چکا ہے، تُو کتنی ہی آج تک

اب ایک چال رہ گئی، وعدے پہ کل کے چل

دو دن کا یہ اُبھار ہے، جتنا بہار ہے

اے گُل نہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل

محفل میں اُن کی غیر ہیں چلیے کہ بیٹھیے

محزوم دیکھ شمع کو یعنی کہ جل کے چل

اب جی میں ہے کہ ہاتھ سے جانے نہ پائے دل
آنے نہ دوں کسی پہ جو قابو میں آئے دل

تو جس کو دیکھتا ہے، وہ کہتا ہے "ہائے دل"!
اک سرسری نظر بھی ہے صبر آزمائے دل

یہ جنس وہ ہے مفت بھی لیتا نہیں کوئی
بازارِ حسن و عشق میں کیا ہی بہائے دل

ظالم ہوئے تمہارے مگر چین بھی نہیں
آزارِ جاں ہو پھر بھی ہو لیکن دوائے دل

کس سے سنوں جو تم نہ کرو بات پیار کی
کس سے کہوں جو تم نہ سنو ماجرائے دل

تکلیفِ سیرِ گل مجھے اے ہم نشیں نہ دے
پھولوں سے کم نہیں ہیں مرے داغہائے دل

ناصح! علاجِ عشق ہے ہر چند ترکِ عشق
لیکن ہے یہ خیال بھی حسرت فزائے دل

کیا خوب ساز ہے، کہ نوا سنجِ راز ہے!
محرومِ دل پذیر ہے، کتنی صدائے دل!

خنجر بدست ہے وہ بُتِ شنگ آج کل
چھڑنے کو ہند میں ہے کوئی جنگ آج کل

ممکن ہے مر گیا ہو ترا وحشیِ حزیں
لڑکوں کے ہاتھ میں جو نہیں سنگ آج کل

کس مستِ ناز کے لبِ لعلیں کو دیکھ کر
پانی ہے شرم سے مئے گل رنگ آج کل

لیتا ہے نام دُنگ کی مستوں کے سامنے
ناصح جو آبرو سے ہے کچھ تنگ آج کل

اُس گُل کی بُو صبا! نفسِ یار اے صبا!
غنچے سے بھی زیادہ ہوں دل تنگ آج کل

اُلفت بھی چل رہی ہے زمانے کے ساتھ ساتھ
اگلے سے عاشقی کے نہیں ڈھنگ آج کل

بزمِ سخن کا رنگ ہے پھیکا پڑا ہوا!
محروم کیوں خموش ہے نیرنگ[1] آج کل

---

[1] میر غلام بھیک نیرنگ مرحوم جن کا کلام رسالہ مخزن لاہور میں شائع ہوتا رہا۔ غزل ابھی مخزن میں شائع ہوئی۔

ادائے ناز سے مستانہ جب وہ چلتے ہیں
قدم قدم پہ گماں ہے۔ ابھی پھسلتے ہیں

خبر نہیں ہے ذرا بیخودانِ اُلفت کو
وہ رُوٹھتے ہیں، بگڑتے ہیں یا مچلتے ہیں

الٰہی کیسے ہیں میری اُمید کے پودے
نہ پھولتے نظر آتے ہیں یہ نہ پھلتے ہیں

چمکتے پیری میں ہیں، بھول گئے پہ داغہائے شباب
کہ شام ہوتی ہے جس دم چراغ جلتے ہیں

بس ایک آہ کی باقی کسر ہے اے تفِ آہ!
ابھی پسیجتے ہیں وہ۔ ابھی پگھلتے ہیں

سفر میں زحمتِ پا سے جو جی چُراتے ہیں
وہ بیٹھے دُور ہی منزل سے ہاتھ ملتے ہیں

خیالِ حُسنِ گذشتہ سے کیوں ملول ہو تم
بہاریں ہوتی ہیں آخر شباب ڈھلتے ہیں

دلِ شکستۂ شاعر ہے منبعِ مضموں
کہ ٹوٹتی ہے صدف، تو گہر نکلتے ہیں

نہیں ہے فنِ سخن شغلِ بیہودہ محروم
یہی ہے جس سے ہزاروں کے جی بہلتے ہیں!

ہے صبح اور آج پریشاں ابھی سے ہیں
یعنی شبِ فراق کے ساماں ابھی سے ہیں
جوبن شباب کا بھی نہیں اور تیرے لب
شرمندہ سازِ لعلِ بدخشاں ابھی سے ہیں
ہو کر جواں نہ بھولیو بہرِ خدا، کہ ہم!
دلدادہ تیرے اوبتِ ناداں ابھی سے ہیں
بل بے بہارِ عشق، کہ زخمِ جگر مرے
خجلت دہِ ہزار گلستاں ابھی سے ہیں
روزِ جزا ہے دُور پرائے کردگار! ہم
شرمندۂ فزونیٔ عصیاں ابھی سے ہیں
محرومِ پختگی تو بہت دُور ہے، مگر
قائل ترے سخن کے سخنداں ابھی سے ہیں!

کچھ نئے داغ، کچھ پُرانے ہیں
آج اُن کو سبھی دکھانے ہیں

پُر ہے نوحوں سے زیست کا دیواں
ناسخنشناس کو یہ ترانے ہیں!

کوہ و صحرا و ساحلِ دریا
بے ٹھکانوں کے سو ٹھکانے ہیں

عمرِ انساں ہے ایک لحظہ ۔ مگر
اس میں کیا مختلف زمانے ہیں!

بولے ذکرِ وفائے لیلےٰ پر
یہ حکایات ہیں، فسانے ہیں

لے چلا دِل کسی کی محفل میں
موت آنے کے یہ بہانے ہیں

ہم بھی ایسے نئے نہیں محروم
یہ مضامیں اگر پُرانے ہیں!

شکوے فضول سب ستمِ آسماں کے ہیں
پامال ہم تو گردشِ چشمِ بتاں کے ہیں!

خلوت نشیں حرم کے ہیں، یا دیر کے مکیں
سب سجدہ کرنے والے، اُسی آستاں کے ہیں

ہر ذرہ اُن کی بزم کا، خورشید ہے مجھے
یارب مری نگاہ ہیں، جلوے کہاں کے ہیں

پائیں حضورِ عشق سے۔ یہ سرفرازیاں
نالے بہت بلند، جو مجھ ناتواں کے ہیں

شیریں بنی زباں پہ۔ نہ اہلِ غرض کی جا!
دل میں بھرا ہے زہر، یہ میٹھے زباں کے ہیں

آراستہ ہیں دل میں، تصور کی مجلسیں!
وہ میرے ہم محفلِ رازِ نہاں کے ہیں

گھر میں ہوں یا سفر میں ہوں، دشمن ہیں آسماں!
ہر جا ہیں تیرہ بخت، کہ ہندوستاں کے ہیں

محرومِ آزمائے طبیعت غزل میں کیا؟
یہ فکر کم نہیں ہے کہ دن امتحاں کے ہیں!

لہ ۱۹۱۱ء میں بزمانۂ طرابلس کہی گئی

قابل ہماری سیر کے، باغِ جہاں نہیں

نشو و نمائے نخلِ محبت یہاں نہیں

تسکینِ دل نہیں، کہ وہ تسکینِ دل نہیں

آرامِ جاں نہیں، کہ وہ آرامِ جاں نہیں

دل آپ کا ہی شنگ سے ہے سخت ورنہ یا

سوزِ نہاں نہیں ہے، کہ آہ و فغاں نہیں

جن کے کلامِ تلخ میں ہے زہر کا اثر

ہے مارِ سرخ اُن کے دہن میں زباں نہیں

کیوں پیش و پس ہے آپکو لینے میں دل مرا

دیتا ہے دل اِک نگاہ پہ۔ اتنا گراں نہیں

چکی کے دو ہیں پاٹ، کہ ہم جن میں پس گئے

محروم یہ زمیں نہیں، وہ آسماں نہیں!

جہاں میں یادگارِ زندۂ سوزِ نہاں ہوں میں[1]
میں اپنا آپ خاکستر ہوں اے ہمدم! کہاں ہوں میں

ابھی تک نیم بسمل ادجفائے آسماں! ہوں میں
کمی کچھ بُرّشِ خنجر میں ہی یا سخت جاں ہوں میں

نہ میں شمعِ شبستاں ہوں، نہ ہوں دلسوزِ پروانہ
الٰہی! کس لئے پھر سربسر آتش بجاں ہوں میں

گرائیں بجلیاں تو نے مرے نخلِ تمنا پر
جلاؤں گا تجھے آہوں سے وہ اے آسماں ہوں میں

سرِ راہِ فنا اُٹھ اُٹھ کے اکثر بیٹھ جاتا ہوں!
جو ہو بیگانۂ منزل وہ گردِ کارواں ہوں میں

ملی بحرِ فنا میں کیا مجھے گرداب کی قسمت
کہ جب تک ہوں اسیرِ اضطرابِ جاوداں ہوں میں

مسرت نام ہے کس چیز کا، محروم کیا جانوں
جہاں ماتم کدہ ہی، اور مصروفِ فغاں ہوں میں!

---

[1] یہ غزل اہلیہ کی وفات کے بعد کہی گئی۔ اسے طوفانِ غم کی منظومات سے متعلق سمجھنا چاہیئے۔

زوالِ حُسن ساری ہے، گُلوں میں، گلعذاروں میں[1]
نہاں ہے خارِ حسرت کی خلش پھولوں کے ہاروں میں
نشاط افروزیٔ دل بزمِ فانی کے نظاروں میں؟
فروغِ جلوۂ مہتاب ناممکن شراروں میں!
نہ چھیڑ اے آرزوئے نغمہ میرے سازِ ہستی کو
کہ پنہاں جُز نوائے غم نہیں کچھ اسکے تاروں میں
شبستانِ فلک میں محوِ خوابِ ناز ہے کوئی
کہ ایمائے خموشی ہے، کواکب کے اشاروں میں
یہ احساں مُفت کا ہے، حالِ عاشق پوچھتے جاؤ
کہاں ہے تابِ گویائی، تمھارے غم کے ماروں میں
پسندِ خاطرِ محروم، طرزِ صاف گوئی ہے
چھپا سکتا ہوں ورنہ دل کا مطلب استعاروں میں!

---

[1] یہ غزل اور اسی زمین میں دوسری غزل راولپنڈی پولٹیکل کانفرنس کے طرحی مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی بسنہ ۱۹۲۰ء یا سنہ ۱۹۲۱ء ہوگا یا اس کے قریب ٹھیک یاد نہیں۔ (محروم)

خزاں کا رنگ ہے خاکِ وطن! تیری بہاروں میں
ہجومِ داغِ حسرت دیکھتا ہوں لالہ زاروں میں
اُداسی تیرے کملائے ہوئے پھولوں کی ملتی ہے
چراغِ صبح میں یا آخرِ شب کے ستاروں میں
صدائے گریہ دھیمی دھیمی اب راتوں کو آتی ہے
گئے وہ دن کہ تھا جوشِ ترنم آبشاروں میں!
نشاط انگیز اب ساون کی جھڑیاں ہو نہیں سکتیں
کہ عالم تیر باراں کا ہے، بارش کی پھواروں میں
یہی عالم رہا گر تیرے ضبطِ سوزِ پنہاں کا
تو پھوٹیں گے بجائے غنچہ شعلے شاخساروں میں
تڑپ کر سنگریزوں سے شرر باہر نکل آئیں
جو تیرا اضطرارِ دل بیاں ہو کوہساروں میں
غم آلودہ نہ ہوں اشعارِ محرومِ حزیں کیوں کر؟
کہ ہے تاثیرِ غم خاکِ وطن تیرے نظاروں میں

کسی کی جستجو ہے ، اور میں ہوں
وہی اک آرزو ہے ، اور میں ہوں
تصوّر ہے کسی کا ، اور دل ہے
وہ صورت روبرو ہے اور میں ہوں
میں اپنے پنجۂ وحشت کے صدقے
سدا شغلِ رفو ہے اور میں ہوں
نہیں کھُلتا ہے رازِ ہستیٔ گُل
طلسمِ رنگ و بُو ہے اور میں ہوں
بدلتا ہے زمانہ پر یہاں تو
وہی بیگانہ خُو ہے اور میں ہوں
کیا اے عشق تُو نے خوب رُسوا
کہ چرچا کو بکُو ہے اور میں ہوں
وہی ہے دل ۔ وہی فرقت کا رونا
وہی محروم تُو ہے اور میں ہوں

بے یار رات بھر رہے ۔ بے خواب ابر میں
تہ کر کے رکھدی چادرِ مہتاب ابر میں
یادِ جمالِ یار میں برقِ تپاں کی طرح
بے چین ہی رہا دلِ بے تاب ابر میں
چھن چھن کے نور ہے تہِ برقع، سے آ رہا
وہ رُخ نقاب میں ہی، کہ مہتاب ابر میں
عاری سدا کمال سے ہے اوجِ ظاہری
پانی کی بوند ہے اوج نایاب ابر میں
رہنے دیں مجھ غریب کو مستِ مئے خیال
خود ذوق شوق سے پئیں احباب ابر میں
کس کو اماں قضا سے بسفینہ ہلال کا
اوجِ فلک پہ ہو گیا ۔ غرقاب ابر میں
محروم جام و ساقی و شاہد سے کیا ہیں
ہیں اشک و آہ شغل کے اسباب ابر میں

آہیں جائیں وہ کلیجا تھام کر، اتنا تو ہو
میری آہوں میں، مرے نالوں میں اثر اتنا تو ہو

شمع سے کم ہو نہ سوزش میں بشر اتنا تو ہو
سر سے اک شعلہ اُٹھے، سوزِ جگر اتنا تو ہو

خنجرِ شوقِ شہادت سے رگِ گردن کٹے
"سر ہو جس سے بارِ گردن، دردِ سر اتنا تو ہو"[1]

سیرِ گلشن کی ہوس اے ہم صفیرو! اب کسے؟
کھول دے کوئی قفس میں، بال و پر اتنا تو ہو

آنسوؤں کے تار سے پہنچے خبر دل کی وہاں
مجھ کو تجھ سے فائدہ، اے چشمِ تر اتنا تو ہو

حسرتِ پابوس ہے، آنکھوں سے مل لیں اسے
ہم کو مِل جائے کسی کی خاکِ در اتنا تو ہو

میرے کانوں سے سُنے، میری زباں سے کہہ سکے
آشنائے رازِ اُلفت، نامہ بر اتنا تو ہو

تجھ کو اے محروم، ذوقِ پارسائی ہی سہی
بُت پرستی میں جوانی ہو بسر، اتنا تو ہو!

---

[1] مصرعِ طرح تھا کسی مشاعرے کا۔

لاکھوں ہیں دلرُبا، کوئی دلدار بھی تو ہو
غم دے چکے بہت، کوئی غمخوار بھی تو ہو

فریاد مَیں تو ہیں، مرے زخمِ جگر کریں
اُس بزم میں اجازتِ گفتار بھی تو ہو

قسمیں نہ بار بار دلائیں تو کیا کریں
اقرار سا کوئی ترا اقرار بھی تو ہو

افسوس ہے کہ ساتھ تمہارے نہیں رہے
موجودگی جہاں ہے وہاں خار بھی تو ہو

محروم لاجواب ہے، یہ مصرعۂ اسیر!
"عیسیٰ ہیں سینکڑوں، کوئی بیمار بھی تو ہو"

سمجھ کر رہینِ وفا، ہر کسی کو
ستمگر! نہ اتنا ستا ہر کسی کو

بُتِ بے وفا! تجھ کو معلوم بھی ہے
کہ ہونا ہے پیشِ خدا ہر کسی کو

نہ بھولے کوئی بے بقا زندگی پر!
کہ لینی ہے راہِ فنا ہر کسی کو

کسی کو ہے اپنا، کسی کو پرایا
کیا دِل نے درد آشنا ہر کسی کو

وہ کرتے ہیں مُردوں کو ٹھوکر سے زندہ
"یہ سُن سُن کے مرنا پڑا ہر کسی کو" [1]

کرم پر نہ ہو ناز اہلِ کرم کو
کہ ہے دینے والا خدا ہر کسی کو

مرے حق میں ہونے لگا قہر ظالم
ترا پیار سے دیکھنا ہر کسی کو

بلا تیری زُلفِ معنبر کو کہہ کر
ڈراتے ہیں اے مہ لقا ہر کسی کو

کبھی اپنے شیداؤں کا امتحاں کر
نہ پائے گا محروم سا ہر کسی کو!

---

[1] مصرعہ طرح

رُخِ انور پہ بکھرتے ہیں جو عنبر گیسو
دِل کو کرتے ہیں پریشان ستمگر گیسو

کبھی آتے نہ قریبِ رُخِ دلبر گیسو
تیرہ بختی ہیں جو ہوتے مرے ہمسر گیسو

تُل کے آئی ہے گھٹا، مُلکِ حبش پر گویا
تِل پہ رُخسار کے ہیں جمع جو گھر کر گیسو

مُصحفِ رُخ کو پڑے شام و سحر چومتے ہیں
کس سلیقہ کا رُکے چھپنے سی ہیں کافر گیسو

کیسے بادل ہیں کہ خورشید کو بھی ڈھانپے ہیں
نیچے نیچے ہے جبیں، اور ہیں اوپر گیسو

دیکھتے دیکھتے ہی دل کو اُڑا لیتے ہیں
دیکھنے کو تو نظر آتے ہیں بے پر گیسو

مل رہا زنگی سے زنگی ہے فرنگستاں میں
خالِ رُخسار پہ ٹھیرا ہے جو آ کر گیسو

آبِ کوثر سے ہی فردوس میں سُنبل شاداب
قطرہ ہائے عرقِ رُخ سے جو ہیں تر گیسو

نہ سخن میں اِنھیں ہم باندھ بٹھاتے محروم
یُوں اُٹھاتے نہ اگر فتنۂ محشر گیسو!

یہ نہیں ہے شانِ وفا صنم! کہ کریں بجوش مقابلہ[1]
تری سختیوں سے کریں گے ہم، بخدا! خموش مقابلہ

ترے پائمالِ ستم ہیں گو، مگر ان میں تاب و تواں یہ ہے
شب و روز کرتے ہیں، موت سے ترے سرفروش مقابلہ

تو جو خوں ہوا ہے تو کیا ہوا، کہ دمِ اخیر تلک کیا
غمِ بے حساب سے تو نے اے دلِ صبر کوش مقابلہ

جدا ادا ہے تیغ بکف ہے وہ، جو سخن ہے خنجرِ جانستاں
تری فوجِ ناز سے تا کجا، کریں چشم و گوش مقابلہ

گئی جان حسرتِ دید میں، مگر اُف نہ آئی زبان پر
تلک[2] اس کو کہتے ہیں ضبطِ غم۔ یہ ہے بے خروش مقابلہ

---

[1] یہ غزل کانگریس کے خموش مقابلے PASSIVE RESISTANCE کے دور میں کہی گئی۔
[2] اپنے نام کا مخفف

جو یونہی رہے گا مرے جگر سے، تری نظر کا مُعاملہ
تو سمجھ لے بس کوئی دن ہے اور مرے جگر کا معاملہ

بچوں تیری آتشِ عشق سے، یہ مجال و تاب کہاں مجھے
مرے دل کا اور ترے حُسن کا ہے خس و شرر کا معاملہ

کوئی ایسا شہر بسائے عشق، نہ کچھ ہو جس میں سوائے عشق
نہ ہو نام و ننگ کا مخمصہ، نہ ہو سیم و زر کا معاملہ

یہ انوکھی چھیڑ ہے زاہدا، تجھے مجھ سے کیا مجھے تجھ سے کیا
ترے زُہدِ خشک سے ہے جُدا، مری چشمِ تر کا معاملہ

تھے کھُلے ہوئے مرے بال و پر، میں قفس سے اُڑ نہ سکا مگر
یہ ہے دل کے ذوق پہ منحصر۔ نہیں بال و پر کا معاملہ

یہ نظر نظر کا مقابلہ ہے پیامِ غارتِ دل تلکؔ[1]!
کہ ضرور پہنچے گا شہر تک سرِ رہگذر کا معاملہ!

---

[1] تلک، اپنے نام کی تخفیف

گرے ہم لڑکھڑا کر پائے ساقی پر جو مستانہ

کہا پیرِ مغاں نے ہے یہ مستی میں بھی فرزانہ

کمالِ عشق میں ممکن نہیں وہم رقابت ہو

لڑا کب شمع پر جلنے میں پروانے سے پروانہ

مجھے کیا ہے جو میں شیخ و برہمن کی طرح بھٹکوں

بنا لیتا ہوں دل کو گاہ کعبہ گاہ بت خانہ

ہماری مے پرستی کی خبر ہے چشمِ ساقی کو

نہ ساغر کی ضرورت ہے، نہ ہے درکار پیمانہ

گیا ہے چھوڑ کر وہ خُوروش نقشِ قدم اپنے !

انھیں پھولوں سے ہے گلزارِ جنت اپنا کاشانہ

محبت اور جنوں میں قرب ہے اور بُعد بھی کتنا

کہاں لیلےٰ کا کوچہ اور کہاں مجنوں کا ویرانہ

تو ہے اُس ماہ کا طالب، نہ پہنچا کوئی بھی جس تک

جواں ہو کر بھی ضد تیری رہی محرومِ طفلانہ

آئی کیا تم پہ طبیعت کہ مصیبت آئی
چین پایا نہ کبھی جب سے طبیعت آئی

شامِ ہجراں میں وہی زُلف کی ظلمت آئی
دلِ مہجور! مصیبت پہ مصیبت آئی

دستِ قسّامِ ازل چوم، تری قسمت میں
کچھ کبھی گر چاشنیٔ دردِ محبّت آئی

اک بلا آنکھیں دکھاتی ہوئی آئی دیکھو
بیکسو! تا روں بھری کیا شبِ فرقت آئی

رات پروانوں کو جب شمع پہ جلتے دیکھا
اپنی محرومی پہ پھر دل سے مجھے حسرت آئی

داغِ فرقت نے دکھائی خودِ محشر کی تپش
آئی کیا شامِ الم، صبحِ قیامت آئی

جو اُٹھا محفلِ ساقی سے اُٹھائیں محروم
دورِ ساغر کی نہ مجھ تک کبھی نوبت آئی

مہرباں تھے وہ مگر بے سود، غمخواری رہی
دل رہا پہلو میں جب تک، دل کی بیماری رہی

کس کو فرصت تھی، خیالِ لذّتِ دیدار کی
سامنے جبتک رہے وہ، بے خودی طاری رہی

ہم وہی ہیں آمد و رفتِ کوئے جاناں وہی
لاکھ رسوائی رہی، ذلّت رہی، خواری رہی

شاملِ تعمیرِ دنیا تھی یہی بے رونقی
عشق کے دم سے، مگر کچھ گرم بازاری رہی

کثرتِ غم نے مٹا دی کاوشِ احساسِ غم
ہمنشیں! اب ہم سے مشقِ گریہ و زاری رہی

خودنمائی سے رہا پرہیز ہم کو عمر بھر

خود فراموشی اب آئی، پہلے خودداری رہی

المدد اے دردِ دل! آنکھوں کے چشمے خشک ہیں

وہ بھی دن تھے جب یہیں سے نہر سی جاری رہی

فیضِ قاتل نے دکھائی ہم کو بھی کیا کیا بہار

پھول زخموں کے رہے، داغوں کی گلکاری رہی

ہجر کی شب اور تو کوئی نہ تھا پرسانِ حال

شاملِ سوز و گداز، اک شمع بیچاری رہی

تیرے چشم و رُخ نے پرتو جب سے ڈالا باغ پر

چاک داماں گُل رہا، نرگس کو بیداری رہی

کردیا یاسِ دوامی نے، ہر اک سے بے نیاز

اب کہاں محروم، تابِ ناز برداری رہی!

سیہ بختی پہ رہتی ہے نظر اہلِ بصیرت کی
اسی سُرمے سے بینائی ہے قائم چشمِ عبرت کی!

فلک خود مُبتلائے گردشِ ایّام پھرتا ہے
ہے ناداں جو رکھے اس سے تمنّا عیش و عشرت کی

بہارِ باغِ امکاں ہے سُبک دستوں کی محنت سے
سواری آتی ہے دوشِ ہوا پر ابرِ رحمت کی

نظر کر خندۂ گُل پر ریاضِ دہر میں غافل
نہایت مختصر ہے، جو گھڑی ہے یاں مسرّت کی

دُعائے سینہ ریشاں رائیگاں ہرگز نہیں جاتی
زمیں سے تا فلک وسعت ہے دامانِ اجابت کی

بیاباں گردِ مجنوں، کوہ کن کاٹے پہاڑوں ہیں
کٹھن اے بوالہوس! ہیں منزلیں راہِ محبت کی

دلِ حیراں سے حیرانی نہ نکلی ہے، نہ نکلے گی!
میں انساں ہوں الٰہی، یا ہوں پُتلی چشمِ حیرت کی!

گردش نہ کام آئی ذرا سالِ ماہ کی ۔ حالت وہی رہی مرے حالِ تباہ کی

وحشت ہے مجھکو یاد میں زلفِ سیاہ کی ۔ زنجیر بھی ہو سلسلۂ دودِ آہ کی

کھائے ہزار تیر نہ سیدھا ہوا کبھی ۔ دل کو ہوس رہی تری ترچھی نگاہ کی

آخر ہیں یہ بھی تو اُسی صانع کی صنعتیں ۔ قلعی نہ آپ کھولئے خورشید و ماہ کی

دیں گے بھلا وہ اپنے کئے کی سزا کسے ۔ فریاد کیا سُنیں وہ کسی دادخواہ کی

میرا قصور کیا ، جو کھچوں آپ کی طرف ۔ تم مثلِ کہربا ، مری صورت ہے کاہ کی

مجھ کو یہ رشک ہے کہ مجھے بھی خبر نہ ہو ۔ اچھی کہی یہ وعدے پہ تم نے گواہ کی

مطلب غزل سے ہے مجھے اظہارِ مدعا
محروم آرزو نہیں کچھ آہ واہ کی !

لے کے آئی مژدۂ رحمت ہوا برسات کی
دل بڑھا، جوبن چڑھا، بڑھی سر پہ گھٹا برسات کی

آبشاروں سے نکلتی ہے صدائے مرحبا
اور جھرنوں کے ترنم سے نوا برسات کی

گل بداماں ایک چھینٹے سے ہوئے سب کوہ و دشت
موسمِ گل سے بھی رونق ہے سوا برسات کی

سبزۂ افسردہ، نخلِ مردہ میں جان آ گئی
فی الحقیقت ہے دمِ عیسیٰ ہوا برسات کی

سبزہ و گل، مور و ماہی، مردم و وحش و طیور
پرورش برسات کرتی ہے برا برسات کی

صبحدم ہوتی ہے کیا کیا، باعثِ تسکینِ روح
کونسے طبقے سے آتی ہے، ہوا برسات کی

لوٹتا ہوں میں تصور میں مزے برسات کے
ورنہ دیکھی کس نے ڈیرے[1] میں فضا برسات کی

فرصتِ فکرِ سخن محروم کو کب ہے، مگر
بھا گئی دل کو ردیفِ خوشنما برسات کی!

---

[1] ڈیرہ اسمٰعیل خاں

مانگتے ہی رہ گئے بیکس دعا برسات کی!
آسماں! تونے نہ دکھلائی گھٹا برسات کی!

خشک گذرا اب کے ساون بھی، بہت حیراں ہوں میں
ہوگئی تبدیل یارب! فصل کیا برسات کی

آسماں پر ایک بھی بادلی نظر آتی نہیں
ہے نظر بدلی ہوئی واحسرتا! برسات کی

مانگتا ہوں میں دعائے ابر رو رو کر ابھی
آرزو تجھ کو اگر ہے ساقیا! برسات کی

پھول مرجھائے ہوئے ہیں، غنچے کملائے ہوئے
حال پر اُن کے کرم کر، اے ہوا برسات کی

زرد ہے دھانوں کی رنگت؛ خشک دہقانوں کے لب
بھیج دے کالی گھٹا، اب اے خدا برسات کی!

انتظار ابر میں محروم بھی ہے بے قرار
اپنی رحمت سے دکھا اس کو فضا برسات کی

وہ برقِ نظر دل کو تڑپا گئی — مجھے جلوۂ طُور دکھلا گئی

ہوا جب سے آزارِ الفت پدید — مسیحائی تیری مسیحا! گئی

کِسے چُھو کے آئی تھی بادِ نسیم — کہ بیگانہ وش مجھ سے کترا گئی

صبا! قیس کی بات کا بھی جواب — کِدھر نکہتِ زُلفِ لیلےٰ گئی

جدھر آنکھ اُٹھائی، ہوئے دل خراب — نظر کیا گئی، موجِ صہبا گئی

پلایا محبت نے زہرابِ غم — جوانی ہماری ہمیں کھا گئی

گیا دِل سے اب خوف روزِ جزا — قیامت تری چال میں آگئی

ابھی آنکھ نرگس نے کھولی نہ تھی — ”خدا جانے کس کی نظر کھا گئی“

نہ محروم کو چھیڑ، جا! ناصحا!
طبیعت اگر آ گئی — آگئی!

لہ مشاعرہ صدائے ہند لاہور کی طرح ۱۹۰۷ء

نہ ہر گز تشنگیٔ شوق میرے دل سے نکلے گی
اگر نکلے گی آبِ خنجرِ قاتل سے نکلے گی

مرے آرام کی صورت، مرے ہی دل سے نکلے گی
میں جس لیلیٰ کا مجنوں ہوں اسی محمل سے نکلے گی

زمینِ شورِ الفت میں، نہ تخمِ آرزو بونا
کہ بہبودی نہ کچھ اس سعیٔ لاحاصل سے نکلے گی

نکالے سے کسی کے کب گرہ دل کی نکلتی ہے!
اگر محروم نکلی۔ مرشدِ کامل سے نکلے گی!
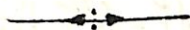
کم نہ تھی صحرا سے کچھ بھی خانہ ویرانی مری!
میں نکل آیا کہاں اے وائے نادانی مری

کیا بتاؤں میں کسی کو رہبرِ ملکِ عدم!
اے خضر! یہ سرزمیں ہی جانی پہچانی مری

جان و دل پر جتنے صدمے ہیں اسی کے دم سے ہیں!
زندگی ہی فی الحقیقت، دشمنِ جانی مری

ابتدائے عشق گیسو میں نہ پھنس یہ الجھنیں!
بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی آخر پریشانی مری

دشتِ ہستی میں و ہراں ہوں، مدعا کچھ بھی نہیں
کب ہوئی محتاجِ لیلیٰ قیس سامانی مری

اور تو واقف نہیں کوئی دیارِ عشق میں
ہے جنوں شیدا مرا، وحشت ہے دیوانی مری

باغِ دنیا میں یونہی رو ہنس کے کاٹوں چار دن
زندگی ہے شبنم و گُل کی طرح فانی مری

بعدِ ترکِ آرزو بیٹھا ہوں کیسا مطمئن
ہو گئی آساں ہر اک مشکل بآسانی مری

ہاں! خدا لگتی ذرا کہہ دے تو اے حُسنِ صنم
عاشقی اوروں کی اچھی، یا کہ حیرانی مری

سختِ دل کھانے کو ہے، خونِ جگر پینے کو ہے
میزبانِ دہر نے کی خوب مہمانی مری

نغمہ زن صحرا میں ہو، جس طرح کوئی عندلیب!
یوں ہے اے محرومِ سرحد[1] میں غزل خوانی مری!

[1] شمال مغربی سرحدی صوبہ

رہی فراق میں بھی شکل روبرو تیری!
شبیہہ کھینچی تصوّر نے ہو بہو تیری

معاف رکھ، جو ہے گُلہائے ترسے پیار مجھے
کہ اِن میں رنگ ترا کچھ ہے، کچھ ہے بُو تیری

نسیمِ صبح کا جھونکا نفس نفس تیرا!
رہے گی سوختہ جانوں کو آرزو تیری

یہ فخر کم ہے کہ ہم قابلِ خطاب تو ہیں؟
عزیز اور کسے القاب سے ہے "تُو" تیری

دہانِ غنچہ ترے، زبانِ سوسن سے
چمن چمن میں سُنی میں نے گفتگو تیری

دل و جگر پھُکے جاتے ہیں سوزِ ہجراں سے
لگن عذاب ہوئی مجھ کو شمع رو تیری

کہاں کہاں ترے محروم کو بقولِ سرورؔ[1]
"کشاں کشاں لئے پھرتی ہے جستجو تیری!"

(سنہ ۱۹۱۱ء)

[1] منشی درگا سہائے سرورؔ جہان آبادی

جب وہ صورت نظر نہیں آتی ۔ کب مری آنکھ بھر نہیں آتی !

کوئے دلدار سے نسیم سحر ۔ آتی ہے جب ، ادھر نہیں آتی

کیا ہوا سوزِ غم کہ اشکوں سے ۔ بُوئے داغِ جگر نہیں آتی

حُور سے کیا ملے گا دل واعظ ۔ یاں طبیعت اگر نہیں آتی

موت کو بھی خبر نہیں شاید ۔ کہ وہاں سے خبر نہیں آتی

یار ہنستا ہے میرے رونے پر ۔ شرم کچھ اے اثر! نہیں آتی

زندگی یا تو ہے وبال کوئی ۔ یا مجھی کو یہ کر نہیں آتی

شبِ ہجراں وہ شب ہے جس کے بعد ۔ تا قیامت سحر نہیں آتی

نہ ہو اُن کی کمر یہ ناممکن ! ۔ ہو گی ، لیکن نظر نہیں آتی

شبِ فرقت کی داستاں ہے طویل ۔ نیند المختصر نہیں آتی

ہے طبیعت تری رسا محروم

تجھ کو اُردو مگر نہیں آتی !

:

تیرا رُخِ روشن صنما! دیکھنے والے
ہیں جلوۂ انوارِ خدا، دیکھنے والے

کیا دیکھتا ہے خال و خط و چشمِ حسیناں
کھول اور بھی آنکھوں کو ذرا دیکھنے والے

موسیٰ نے جو دیکھا تھا کبھی طور پہ جلوہ!
نِت دیکھتے ہیں تیری ادا، دیکھنے والے

عاشق نہ سہی، اِس میں کسے شک ہے کہ ہم ہیں
کر کر کے وفا، جور و جفا، دیکھنے والے

دل اُن کا چمن میں نہ لگا ہے نہ لگے گا!
جو ہیں ترے کوچے کی فضا دیکھنے والے

ظالم! ترا کیا حال ہو اِس ظلم کے بدلے
دیکھیں گے اِسے روزِ جزا، دیکھنے والے

بھولے سے بھی ہم عشق کسی کا نہ کریں گے
یوں کہتے ہیں انجام مرا دیکھنے والے

تیغِ نظرِ یار کے کھنچنے کی کسر ہے
چکھیں گے مزا دیکھنے کا دیکھنے والے

بیگانگی ٹپکے ہے نگاہوں سے تری کیوں
میں ہوں وہی محروم ترا، دیکھنے والے!

آہِ شرر آمیز میں کیوں کر اثر آئے!
جلتے ہوئے پودے میں کہاں سے ثمر آئے

غافل! تجھے یاں دیکھنا کچھ بھی اگر آئے!
ہر ذرے میں خورشید کا جلوہ نظر آئے

دی کیسے نزاکت نے اجازت یہ سفر کی!
"تم آنکھوں سے دل میں مرے کیوں کر اُتر آئے"[1]

پھر لذّتِ ایذا کی ہوئی دل کو تمنّا
اللہ کرے وہ بُتِ بیداد گر آئے

محفل میں تری شمع بھی روتی ہوئی آئی
اک ہم ہی نہ اِس بزم میں با چشمِ تر آئے

(ق)

اے منعمو! جاؤ گے تہی دست جہاں سے
جس طرح، کہ اِس دہر میں بے سیم و زر آئے

دے جاؤ یہیں تم نے لیا ہو جو یہاں سے
قاروں کی حکایات سے عبرت اگر آئے

دھس جاؤ نہ حسرت سے زمیں میں دمِ رحلت
اور بارِ چہل گنج نہ بالائے سر آئے

محروم تصنّع کی ضرورت نہیں مجھ کو
میری یہ تمنّا ہے غزل میں اثر آئے!

[1] مصرع طرح

عہد میں ابتری نہ ہو جائے
بات پھر سرسری نہ ہو جائے

اللہ اللہ فروغِ طلعتِ حُسن
پھر کہیں مشتری نہ ہو جائے

دیکھ کر بُت کو لے خدا کا نام
عاشقی کافری نہ ہو جائے

اُلفتِ خال سے مجھے حاصل
سوختہ اختری نہ ہو جائے

یوں بھی نفرت نہ آدمی سے ہو
یوں بھی انساں پری نہ ہو جائے

آتشِ عشق سے اسے پگھلا
دل ترا کنکری نہ ہو جائے

وہ نگاہیں کچھ اور کہتی ہیں
دلبری دلبری نہ ہو جائے

چشمِ تر کو سنبھالنا محروم
شاخِ غم پھر ہری نہ ہو جائے!

نہ پھر جہاں میں دلا! اوجِ عزّ و شاں کے لئے
یہ کام چھوڑ سیہ بخت آسماں کے لئے

مری فغاں ہی سے رونق ہے میری ہستی کی!
صدا جرس کی ضروری ہے کارواں کے لئے

خلش نے دل کو مرے کچھ مزا دیا ایسا!
کہ جمع کرتا ہوں میں خارِ آشیاں کے لئے

کیا ہے وار تو کام اب تمام کرتا جا!
نہ چھوڑ مجھکو ستم ہائے آسماں کے لئے

نہیں ہے شکوۂ خوبانِ آتشیں رخسار
ازل سے وقف ہے دل سوزشِ نہاں کے لئے

خدا کرے یہ سمجھ لے مآلِ عشقِ بتاں
دعا کرو کوئی محرومِ خستہ جاں کے لئے!

یہ شفق کے رنگ جو دیکھتا ہے تو صُبح و شام نئے نئے!

ہیں کسی کے خوں نے کھِلائے گُل بُتِ لالہ فام نئے نئے!

نہیں اب فغاں میں بھی کچھ مزا، کہ نشیمن اپنا قفس ہوا

وہ زمانہ خوب تھا جبکہ ہم تھے اسیرِ دام نئے نئے!

ہوا ہم کو تجربہ پے بہ پے، کہ مآلِ وعدہ جو ہے سو ہے!

کئے جائیں عہد پہ عہد آپ برائے نام نئے نئے!

غمِ تازہ ہے دلِ مردہ کا، الم آرزوئے فسردہ کا

تری بزمِ ناز میں دیکھ دیکھ کے اہتمام نئے نئے!

دلِ زار محوِ جمال ہو، تو ابھی سبیلِ وصال ہو

چلے آئیں محفلِ دلرُبا سے تجھے پیام نئے نئے

کبھی عرش سے بھی پرے گئے، کبھی فرش ہی پہ دھرے رہے

نظر آئے منزلِ عشق میں ہمیں نت مقام نئے نئے

جو مزا زلالِ سخن میں ہے، وہ کہاں شرابِ کہن میں ہے

تلک آج ساقیِ غیب نے دیئے بھر کے جام نئے نئے

لختِ دِل اشکِ میں، نے خونِ جگر آتا ہے[1]

تجھ پہ رونا مجھے اے دیدۂ تر آتا ہے

منزلِ دہر میں اُکتا گئے رہتے رہتے

دیکھئے کب ہمیں پیغامِ سفر آتا ہے!

جی مِرا جس سے بہلتا تھا وہ صورت نہ رہی

اب جہاں صورتِ ویرانہ نظر آتا ہے!

سَحر پاس وہ آتی ہے شبِ ہجر کے بعد

داغِ تازہ لئے خورشیدِ سحر آتا ہے

فرقتِ یار میں کیا ہوگا مآلِ محروم

کچھ نظر دیدۂ انجام نگر! آتا ہے؟

---

[1] یہ غزل اہلیہ کی وفات کے بعد کہی گئی۔ اسے طوفانِ غم کی منظومات میں شامل سمجھئے۔

[لہ] جب ترا جلوۂ رخسار نظر آتا ہے! — مجھ کو اک عالمِ انوار نظر آتا ہے

نظر آتا نہیں جس روز وہ رشکِ خورشید — دن مجھے مثلِ شبِ تار نظر آتا ہے

خواب میں بھی تو نہیں چین میسر ہم کو — کہ وہی فتنۂ بیدار نظر آتا ہے

حشر میں میری طرف جھک کے کہا رحمت نے — مجھ کو یہ شخص گنہ گار نظر آتا ہے

جذبۂ دل میں ہوا پھر اثرِ بے اثری — پھر وہ کچھ مائلِ اغیار نظر آتا ہے

اس کی تدبیر کبھی اے شیشہ گرو! ہو کہ نہیں — دل کے آئینے میں زنگار نظر آتا ہے

نظر آتے تھے کبھی خار میں جلوے گل کے — پھول بھی اب تو مجھے خار نظر آتا ہے

عین دیوانہ ہے وہ اپنی نظر میں ندوؔ! — اہلِ دنیا کو جو ہشیار نظر آتا ہے

نوجوانی میں ترے رخ پہ یہ زردی محرومؔ
ہو نہ ہو عشق کا آزار نظر آتا ہے!

بے دیدِ یار آئے گی ہرگز نہ کل مجھے
اے شوق! وہ جہاں ہوں وہیں لیکے چل مجھے

مایوس بارہا میں گیا زیرِ بام سے
شکوہ نہیں ہے آپ سے کچھ بے محل مجھے

کہتے ہیں میرے کوچے میں رکھنا نہ پھر قدم
جانا پڑے گا اب تو وہاں سر کے بل مجھے

واعظ! اسی لئے تو حسینوں سے کام ہے
معلوم ہے فضیلتِ حُسنِ عمل مجھے

اُن کی ہر ایک بات ہے حنظل سے تلخ تر
اچّھا ملا یہ نخلِ محبّت سے پھل مجھے

شاید ابھی شباب کے باقی ہیں ولولے
محروم آج تک جو ہے ذوقِ غزل مجھے!

پھر یاد میرے دل میں کسی بے وفا کی ہے
پھر جانِ مبتلا کو تمنّا جفا کی ہے

پھر میں ہوں اور جوشِ محبّت کے ولولے
پھر دل ہے اور یاد کسی دِلربا کی ہے

جلوے دکھا رہا ہے تصوّر مجھے۔ کہ پھر
تصویر روبرو مرے اک مہ لقا کی ہے

پھر ابتدائے شُعلہ فشانیِٔ شوق ہے
پھر خاطرِ حزیں میں تپش انتہا کی ہے

پھر میں خدا کو بھُول کے یادِ صنم میں ہوں
محرؔوم کیا کروں، یہی مرضی خدا کی ہے!

ابرِ تر گریاں ہے تو اِک فصل ۔ اِک موسم میں ہے
یہ کہاں شامل ہمارے گریۂ پیہم میں ہے

مرتی رہتی ہے سدا پہلو میں حسرت اک نہ اک
شاد کیا ہو دِل کہ دائم حلقۂ ماتم میں ہے

حسرت افزا داستانِ آدم و حوّا ہے کیا
آہ! فرقت ابتدا سے قسمتِ آدم میں ہے

کاٹتا ہوں زندگی اُمیدِ بعدِ مرگ پر!
پرتوِ صبحِ مسرّت ، میری شامِ غم میں ہے

میری چشمِ شوق کو کیفیتِ نظّارہ دے
دیکھوں ہر ذرّے میں جو کچھ ذکرِ جامِ جم میں ہے

نامرادِ دہر ہیں ہنگامہ کوشانِ جہاں
جز خس و خاشاک کیا دامانِ موجِ یم میں ہے

دشمنِ جاں تجھ کو کہہ کر دیتے ہیں دشمن کو دم
ورنہ تیرے دم سے ہی کچھ دم ہمارے دم میں ہے

پردہ در یہ پردہ ہی، در پردہ اے پردہ نشیں
تو نہاں نظروں سے ہے چرچا ترا عالم میں ہے

آکے کر دے گی برابر موت اک دن دخل و خرج
کیوں اسیرِ حرصِ دنیا فکرِ بیش و کم میں ہے

صبحِ پیری ہے تری اور سر پہ ہے وقتِ رحیل!
تو ابھی الجھا خیالِ گیسوئے برہم میں ہے

قربِ ذاتِ پاک سے انساں نہ کیوں کر پاک ہو؛
ذرہ روشن تر شعاعِ نیرِ اعظم میں ہے

ہم نے یا ان ماہرویوں نے ڈبویا دہر کو؟
دید سے جن کی تلاطم۔ دیدۂ پُرنم میں ہے

یادِ حق میں ذکرِ بُت اور ذکرِ بت میں یادِ حق
کچھ نہیں کھلتا، کہ یہ محروم کس عالم میں ہے؟

بے رونقی کا رنگ مری چشمِ تر میں ہے

خوں میں ہے اب وہ جوش نہ وہ خونِ جگر میں ہے

پروانہ جس کا میں ہوں، جو میری نظر میں ہے

وہ نور شمع میں ہے، نہ شمس و قمر میں ہے

وہ بے قرار دل مرے پہلو میں ہے، جسے

دشتِ سفر میں چین ۔ نہ آرام گھر میں ہے

عالم روا روی کا ہے آنکھوں پہ یہ عیاں

دُنیا میں ہے بشر، کہ مسافر سفر میں ہے

ہے اک ادائے ناز کسی کا غرور بھی

سچ ہے کہ عیبِ حُسن بھی شاملِ ہُنر میں ہے

ابتر ہوا علاج سے حالِ مریضِ عشق

ہر روز داغِ تازہ دلِ چارہ گر میں ہے

محروم دل سے عشق کے جذبات تو گئے

شوقِ غزل سرائی ابھی میرے سر میں ہے!

مرغِ دل پھانسنے کو زُلف کا جال اچھّا ہے

حیلہ بازی کے لیئے دانۂ خال اچھّا ہے

دل کے طالب نظر آتے ہیں حسیں ہر جانب

اِس کے لاکھوں ہیں خریدار، کہ مال اچھّا ہے

بوالہوس! اُلفتِ خوباں کے مزے لُوٹ کے دیکھ

غمِ دُنیا سے محبّت کا مآل اچھّا ہے

تابِ نظّارہ نہیں گو مجھے خود بھی لیکن!

رشک کہتا ہے کہ ایسا ہی جمال اچھّا ہے

دل میں کہتے ہیں کہ اے کاش! نہ آئے ہوتے

اُن کے آنے سے جو بیمار کا حال اچھّا ہے

مطمئن بیٹھ نہ اے راہروِ راہِ عروج

ترا ہمدم ہے اگر خوفِ زوال، اچھّا ہے

نہ رہی بیخودیٔ شوق میں اتنی بھی خبر

ہجر اچھّا ہے کہ محرومِ وصال اچھّا ہے!

وہ ادا جو دشمنِ صبر و قرار و ہوش ہے
دل اُسی پر ہے فدا، کتنا اذیّت کوش ہے

گفتگو ہے باعثِ نا اتفاقی ہائے خلق!
مجتمع ہیں لب بہم، جب تک زباں خاموش ہے

دم ہوا گلشن میں اپنا رشک سے کیوں کر نہ ہو
وہ گُلِ خنداں نسیمِ صبح سے ہمدوش ہے

باعثِ شرمندگی ہوگی حیاتِ جاوداں
ورنہ لوگوں سے خضر کس واسطے روپوش ہے

مجھ کو آتی ہے ہنسی چرخِ کہن کو دیکھ کر
ظالم اس پیری پہ مہر و ماہ در آغوش ہے

میکدے پر واعظو! چھائی ہے رحمت کی گھٹا
میکشوں کے جمگھٹے ہیں، شورِ نوشا نوش ہے

اے بتو! محروم ہے، سرمستِ صہبائے ازل
یہ نہ شاہد باز ہے، نے رندِ ساغر نوش ہے!

دیکھئے دل میں کسی کی آرزو کب تک رہے!
اور یوں ہم سے کوئی بیگانہ خو کب تک رہے!
شوخیوں سے جب وہ قائم اک جگہ رہتے نہیں
پھر تصور آہ! اُن کا روبرو کب تک رہے
مُنہ میں بھر لاتا ہے پانی شیخ! نامِ حُور پہ
دیکھنا یہ ہے کہ اب تیرا وضو کب تک رہے
بھیجتے ہیں آج مرگِ ناگہانی کو پیام
تیرے وعدوں پر کوئی اے حیلہ جُو کب تک رہے
فرصتِ اظہارِ اُلفت دیں تو اے دل کچھ کہوں
دیکھئے یہ ابتدائی گفتگو کب تک رہے
بُلبلِ شیدا! بہت دلکش ہے بیشک حُسنِ گُل
آہ! لیکن اختلاطِ رنگ و بُو کب تک رہے
چھیڑتے ہیں خوبرویوں کو، سُنا ہے آپ بھی
دیکھئے محترم صاحب! آبرو کب تک رہے!

تجھے کبھی تو بُتِ گلعذار دیکھیں گے
اگر خدا نے دکھائی بہار دیکھیں گے

بہار میں وہ نئی اک بہار دیکھیں گے
گلے میں تیرے جو پھولوں کے ہار دیکھیں گے

سحر کے آنے کا وعدہ تو کر گئے، لیکن!
مریضِ ہجر کا آ کر مزار دیکھیں گے

کرے گا موسمِ گُل ہم کو وقفِ داغِ جنوں
بہار دیکھنے والے بہار دیکھیں گے

جنابِ شیخ! چلو سیرِ دَیر کر آئیں!
بتوں میں صنعتِ پروردگار دیکھیں گے

نہیں ہیں منتظرِ موسمِ بہار اے موت
ہم اپنے پھولوں میں رنگِ بہار دیکھیں گے

ہمارے غنچۂ دل پر پڑی نہیں وہ اوس
کہ اِس پہ کچھ اثرِ نو بہار دیکھیں گے

یہی نظر ہے کہ ہم سے ابھی ہے بیگانہ
ابھی ہم اُس کو کلیجے کے پار دیکھیں گے

ہمارے پہلو سے جس روز تو جدا ہوگا
قرار ہم بھی دلِ بے قرار دیکھیں گے

شبِ خزاں سی ہے بے لطف زندگی اپنی
کبھی تو جلوۂ صبحِ بہار دیکھیں گے

اسی اُمید پہ جیتے ہیں طالبِ دیدار
کہ جیتے ہیں تو کبھی روئے یار دیکھیں گے

دکھا رہا ہے تصوّر جو دُور سے ہم کو
وہ دن بھی ہم کبھی محرومِ زار دیکھیں گے

سپوت تیرے تجھے مادرِ وطن کب تک؟
خراب و خستہ و زار و نزار دیکھیں گے

کبھی وہ دَور بھی آئے گا جبکہ بھارت کو
جہاں کے لوگ بچشمِ وقار دیکھیں گے![1]

[1] خدا کا شکر ہے کہ وہ دور شاعر کی زندگی میں آگیا۔

دشتِ وحشت میں جو ہم سلسلہ جُنباں ہوں گے
حضرتِ قیس غبارِ سرِ داماں ہوں گے

دامنِ عمر بھی پھٹ جائے گا جب تک کہ رفو
چاکِ دِل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں ہوں گے

طرفہ تر ہوگی قیامت میں قیامت برپا
آپ جب عرصۂ محشر میں خراماں ہوں گے

روزِ محشر بھی غبار اُن کا بکھر جائے گا
تیرے دلدادہ جو اسیرِ زُلفِ پریشاں ہوں گے

یہ ستم دیکھو کہ گھر سے بھی نہ نکلے وہ شوخ
ہم جو کہہ دیں کہ فدائے رہِ جاناں ہوں گے

پھر بہار آئی ہے محرومؔ بقولِ مومنؔ
"وہی ہم ہوں گے، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے"

متاعِ صبر و سکوں سر بسر لُٹا کے چلے! کہ ہم اشارے پہ اُس چشمِ فتنہ زا کے چلے

بس خوش ہوا دمِ رخصت جو مُسکرا کے چلے خبر نہ تھی کہ وہ برقِ ستم گرا کے چلے

ہنسی خوشی وہ یہاں آئے، پُر رلا کے چلے کہ جاتے جاتے نہ آنے کی پھر سنا کے چلے

بقائے نام کا جھگڑا یہیں چکا کے چلے کہ نقشِ باطلِ ہستی کو ہم مٹا کے چلے

جو سر پہ تاجِ سکندر بھی ہو تو دنیا میں بشر کو چاہیئے ہرگز نہ سر اٹھا کے چلے

مُسافرانِ عدم ہم سے رُوٹھ ہی بیٹھے خفا نہ تھے دمِ رُخصت تو مِل مِلا کے چلے

غزائے گُل سے ہوئی عندلیب کب فارغ چمن میں جھونکے نہ کب صرصرِ فنا کے چلے

فضائے باغِ جناں میں نہ پائیں گے تسکیں ہوائے کوچۂ جاناں یہاں جو کھا کے چلے

تمھیں سے لی ہے صبا نے بھی شوخیِ رفتار چراغِ گورِ غریباں نہ کیوں بجھا کے چلے

رہے گی حاجتِ شرحِ جفا نہ محشر میں اِسی ادا سے جو تم سامنے خدا کے چلے

شریکِ حال ہوئی شمع، کشتی ٹھیری تمھاری بزم سے ہم دادِ گریہ پا کے چلے

بساط کیا تری میدانِ شعر میں محرومؔ!
ہزاروں زورِ طبیعت یہاں دکھا کے چلے!

لئے چرخِ ستمگر نے یہ کن ایّام کے بدلے
دئے زخمِ جگر مجھ کو بُتِ گلفام کے بدلے

عدم سے آنے والوں کو کوئی اِتنا بتا دیتا
کہ ملتی ہیں یہاں بے چینیاں آرام کے بدلے

شبِ ہجراں کی صورت دن ڈھلے سے پھر نظر آئی
الہٰی ! بھیج دے صبحِ قیامت شام کے بدلے

تکلّف برطرف ساقی ! ترے میکش کو ہے کافی
تصوّر تیری آنکھوں کا سرورِ جام کے بدلے

گرفتارِ ازل کو قید اے صیّاد ! کیا کرنا
پئے بلبل شمیمِ گل ہے پیچاں دام کے بدلے

عبادت سے مری بدظن نہ ہو اے بُت ! خدا سے بھی
تجھی کو چاہتا ہوں خوبیٔ انجام کے بدلے

لکھا اُس شوخ نے محروم کو مرحوم جیتے جی
حروف لے وائے ، بیدردی سے میرے نام کے بدلے

ملنے کا جب مزا ہے کہ دل آپ کا ملے
ظاہر میں آپ مجھسے ملے بھی تو کیا ملے!

یہ آرزو ہے اب، نہ رہے کوئی آرزو
یہ مدّعا ہے اب دلِ بے مدّعا ملے

دیتا ہے ترکِ عشقِ بتاں کی صلاح تو
واعظ خدا کرے، کہ نہ تجھ کو خدا ملے

خاطر سے میری آپ اُٹھائیں نہ غیر کو
محفل میں جا ملے نہ ملے، دل میں جا ملے

دِل خاک ہو کے بیٹھ نہ جائے تو کیا کرے
کوچے میں غیر کے جو ترا نقشِ پا ملے

حیراں کھڑا ہوا ہوں میں صحرائے عشق میں
یاور نصیب ہو، تو کوئی رہنما ملے!

اُس گلبدن سے یُوں ہو میں اختلاط ہی
گُلشن میں جیسے پھول سے بادِ صبا ملے

یہ گُلرخانِ دہر وہ گُل ہیں، کہ نام کو
جن میں نہ خُوئے مہر، نہ بُوئے وفا ملے

ہے خرقہ و قبا پہ عبث نازِ امتیاز!
یکساں ہیں جبکہ خاک میں شاہ و گدا ملے

عاشق کی موت وہ ہے کہ قرباں ہو جس پہ زیست
اور زیست وہ کہ موت کا جس میں مزا ملے

بیجا نہیں رکھوں جو میں محروم اپنا نام
مجھ سے اگر نہ وہ بُتِ ناآشنا ملے!

خزاں نے اُجاڑے چمن کیسے کیسے! ہوئے خاک سرو و سمن کیسے کیسے
ملے خاک میں دستِ جورِ خزاں سے گل و لالہ و نسترن کیسے کیسے
دکھائے ہیں سودائے زلفِ بتاں نے ہمیں بھی خطا و ختن کیسے کیسے
ترے ہجر میں مِل گئے ہم کو مونس غم و رنج و درد و محن کیسے کیسے
کبھی ہو کسی کے، کبھی ہو کسی کے بدلتے ہو صاحب چلن کیسے کیسے
مرے بُت سے بھی کوئی ملتا ہے دیکھوں ترے بُت ہیں اے برہمن کیسے کیسے

نہ محروم تو طبعِ موزوں پہ اِترا
ہیں موجود اہلِ سخن کیسے کیسے!

قومی

نہ کی قدر افسوس! اہلِ وطن نے گئے نامراد اہلِ فن کیسے کیسے
ہوائے زمانہ سے گُل ہو رہے ہیں چراغِ سرِ انجمن کیسے کیسے

پڑے جیل میں سڑ رہے ہیں ستم ہے
محبّانِ قوم و وطن کیسے کیسے!

کل ہوا اقــرار سو انکار سے
آج اُنھیں انکار ہے اقرار سے

زہر دیتے ہیں وہ شیرینی کے ساتھ
غیر بھی خوش ہوں نہ اُن کے پیار سے

مُدعا یہ تھا کہ کچھ مغموم ہوں
کہتے ہیں خوش ہوں ترے اشعار سے

ہم سُبک روحوں کو دُنیا سے غرض
دامنِ صَرصَر نہ اُلجھا خار سے

یادِ محروم آگیا وہ رشکِ گل
داغِ حسرت لے چلے گلزار سے

خوش ہوئے لاہور میں محروم ہم! حضرتِ اقبال کے دیدار سے

۱۹۰۹ء

فدا جانِ و دل و ایماں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
بُتِ گمراہ سے پیماں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

بلاتے آنکھ پروانے سے کیوں کر بزمِ الفت میں
طوافِ جلوۂ جاناں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

تصوّر حُور کا اے شیخ! کیونکر دل نشیں ہوتا
خیالِ عارضِ خُوباں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

پشیماں ہیں وہ کر کے پرسشِ حالِ دلِ شیدا
ہویدا حسرتِ پنہاں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

ہوا راہِ فنا میں جب نہ کوئی ہم سفر اپنا
اکیلے کوچ کا ساماں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

ترے جویا تھے کم ہنگامۂ بازارِ عالم میں
تجھے جنسِ وفا ارزاں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

کہاں تھا اختیار اپنا شمیمِ زلفِ جاناں پر
اگر صبر اے دلِ نتواں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

بہائے اشکِ خوں ایمائے فصلِ گُل سے ہم نے بھی
اگر آرائشِ داماں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

یہ فطرت کا تقاضا تھا، کہ چاہا خوبرویوں کو
جو کرتے آئے ہیں انساں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

گئے محروم ہم عشقِ بتاں میں دین و دُنیا سے
جو اِس سودے میں یہ نقصاں نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

مٹے ہیں ذوقِ سخن پر یہ آرزو کرتے — کہ ہم بھی کاش! کبھی اُن سے گفتگو کرتے

زباں کو پھر نہ فغاں سنجِ آرزو کرتے — جو خاکِ پا کو تری سرمۂ گلو کرتے

قسم خدا کی زمانہ یقین کر لیتا — اگر خدائی کا دعویٰ یہ خوبرو کرتے

تمھارے ہاتھ سے مرنا نصیب اگر ہوتا — "مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے"[1]

دوائے دردِ اجل دہر میں اگر ملتی — علاجِ عارضۂ عشق چارہ جُو کرتے

دکھائی دیتے ہیں غنچوں کے عیب بھی اچھے — کہ چاکِ دامنِ گُل کو نہیں رفو کرتے

علاجِ چاکِ جگر کی یہی تھی اک تدبیر — کسی کے تارِ نظر سے اسے رفو کرتے

ریاضِ دہر میں دیتے ہیں جس کو داغِ دروں — برنگِ لالہ اُسی کو ہیں سرخرو کرتے

تری وفا کا یہ انجام تھا تو اے بیدرد — کبھی نہ دردِ محبت کی آرزو کرتے

قبائے عشق سے عاری ہیں حضرت محروم
غزل میں نقلِ محبت ہیں ہو بہو کرتے!

[1] مصرعِ طرح

خدا سے وقتِ دُعا ہم سوال کر بیٹھے
وہ بُت بھی دِل کو ذرا اب سنبھال کر بیٹھے

کیا ہے آنکھ کی گردش سے پیس کرسٹمر
"وہ بے چلے ہی مجھے پائمال کر بیٹھے"[1]

تمام عُمر پریشان رکھا ۔ دمِ آخر
بلا سے میری پریشان وہ بال کر بیٹھے

چلے ہیں طُور کو موسیٰ ۔ مگر ہمیں مطلب؟
کہ ہم بُتوں ہی میں یہ دیکھ بھال کر بیٹھے

رواں ہیں اشک کسی کے فراق میں یارب!
کوئی نہ پرسشِ وجہِ ملال کر بیٹھے

بُرا ہوا لفتِ خُوباں کا ہم نشیں! ہم تو
شباب ہی میں بُرا اپنا حال کر بیٹھے

نہ علم ہے، نہ زباں ہے تو کس لئے محروم
تم اپنے آپ کو شاعر خیال کر بیٹھے!

[1] مصرع طرح

متفرق اشعار

کیا گزرتی ہے دلِ زار پہ غمخوار، نہ پوچھ
کیسا ہوتا ہے غمِ ہجر کا آزار، نہ پوچھ

مئے گلرنگ نہ دے، ساقیِ بزمِ عشرت
اشکِ خوں دیکھ مرے، باعثِ انکار نہ پوچھ

گھیر لیتی ہیں شبِ ہجر بلائیں کیا کیا!
کیا بتاؤں تجھے ظلمات کے اسرار نہ پوچھ

وہ جہاں میں درد ہے کون سا جو فلک نے مجھ کو دیا نہیں
ہنیں شغلِ ماتمِ رفتگاں، کہ ملالِ خونِ وفا نہیں
جسے لوگ کہتے ہیں زندگی، وہ مرے لیے ہوئی جانکنی
یہ مقامِ شکر ہے اے تِلَک[1] کہ ہمیشہ اس کو بقا نہیں

---

[1] تلک اپنے نام کی تخفیف ہے۔

تم بھی اے ماہ جبیں، آؤ یہاں آپ سے آپ
جیسے ہوتا ہے قمر جلوہ فشاں آپ سے آپ

رازِ الفت کو بہت ہم نے چھپایا، لیکن
ہو گیا اشک کی صورت میں عیاں آپ سے آپ

ہم بھی محروم کے اشعار ذرا دیکھیں تو
داد دیتے ہیں جسے اہلِ زباں آپ سے آپ!

ہوں وہ غم نصیب ازل، جسے، دلِ داغدار پسند ہے
نہ فضائے باغ سے انس ہے، نہ گلِ بہار پسند ہے

ہے ادب ترا مژہ صنم، نہیں رکھتا خار پہ میں قدم
کفِ پا کو ورنہ مرے قسم ہے کہ نوکِ خار پسند ہے

نہیں کم یہ داغِ جنوں، اگر تجھے لالہ زار کا شوق ہو
مری چشمِ دجلہ فشاں کو دیکھ جو آبشار پسند ہے

نظر فریب ہو گیا وہ حسنِ جاں فزائے گل
کہ مثلِ عندلیب میں ہوا غزل سرائے گل

ہوئے ہیں زینتِ چمن گلِ انجمن در انجمن
ابھی تو جوشِ گل نہیں ابھی ہی ابتدائے گل

فلک ہے درپئے گزندِ مردمِ شگفتہ رُو
ریاضِ دہر میں ہمیشہ خار پر ہے پائے گل!

مزے کی چیز ہے ترکِ تمنّا اور ریاضت بھی
مگر کچھ کم نہیں واعظ حسینوں کی محبت بھی
کوئی سوتا ہو جیسے ڈوبتی کشتی کے تختے پر
اگر کچھ ہے تو بس اتنی ہی اس دنیا کی راحت بھی
دوائے تلخ بچّوں کو ہے دیتی مادرِ گیتی
نہیں بے مصلحت انساں کو دنیا کی مصیبت بھی!

ہم گلشنِ دہر میں اے ہمدم، آزارکشِ بیداد رہے!
سبزے کی طرح پامال ہوئے، نکہت کی طرح برباد رہے
جُوں شمع ہماری قسمت میں تھا گریۂ غم اور سوزِ نہاں
اے بزمِ جہاں کیا تیرا گلہ، تو حشر تلک آباد رہے
اے چرخ یہ جھوٹے دعوے ہیں ہم جیسے غم کے ماروں کے
تاثیر اگر ہو آہوں میں، قائم تیری بنیاد رہے؟

نے آرزوئے زیست نہ ذوقِ فنا مجھے
اتنا کوئی بتائے یہ کیا ہو گیا مجھے
وہ رنگِ شوق اب دلِ افسردہ میں کہاں
کیوں آپ پیستے ہیں برنگِ حنا مجھے
صحنِ چمن سے فصلِ بہاری نکل گئی
صیّاد، مار ڈال، نہ کر اب رہا مجھے
اس بے وفا کے گیسوئے مشکیں کی کیا خطا
محروم اپنے دل نے پریشاں رکھا مجھے!

تجھے جن نگاہوں سے ہم دیکھتے ہیں — مری جان، اغیار کم دیکھتے ہیں
ترے زُلف و عارض کے محوِ تماشا — اندھیرا، اجالا، بہم دیکھتے ہیں

دلِ شیدا کی خطا کیا ہے جو دیوانہ ہے — آنکھ اُٹھتی ہے جدھر، دہر پہ میخانہ ہے
بے خبر آہ سے، فریاد سے بیگانہ ہے — جرأت آموزِ فنا عشق میں پروانہ ہے

پڑ گئی ایک نظر جس پہ، اُڑے ہوش اُس کے
گردشِ چشمِ صنم گردشِ پیمانہ ہے!

وہ تو آئینِ وفا سے دُور ہیں — دل کے ہاتھوں ہم مگر مجبور ہیں
گو بظاہر ہیں اسی دنیا میں ہم — درحقیقت اس سے کوسوں دُور ہیں

آپ کو مجھ سے کدورت نہیں، کیا فرمایا؟ — صدقے اس صاف بیانی کے بجا فرمایا!
گلشنِ کوئے حسیناں سے جو تو آتی ہے — ہر گُل نے بھی کچھ لے بادِ صبا فرمایا

کیسے بے مہر ہیں محروم بتانِ عالم!
اُن کو اللہ نے کیوں حُسن عطا فرمایا!

تیری نگاہِ ناز کو دل کی تلاش ہے　　پہلو میں دل کہاں ہے مرے دل کی لاش ہے

شیریں جو سنگ دل ہے تو فرہاد شکوہ کیا　　تو بھی کہاں کا موم ہی، خارا تراش ہے

محروم ہیں وہ کشتۂ غم ہوں بقولِ ذوق
دل جس کا پارہ پارۂ جگر پاش پاش ہے

کون سے پردے ہیں وہ پردہ نشیں ہی یارب　　پردہ اُٹھتا ہے تو پردا نظر آتا ہے مجھے

کیا ارادہ ہے شبِ غم ترا اے جانِ حزیں　　دلِ بیتاب تو جاتا نظر آتا ہے مجھے!

مطلع

کھُل سکے اُن پہ کس طرح واقفِ سوز و ساز ہوں
چاہیئے اب کہ شمع ساں میں بھی زباں دراز ہوں!

دیگر

وہ کہہ گئے تھے کہ آئیں گے ہم چراغ جلے!
نمودِ شام سے پہلے جگر کے داغ جلے!

دیگر

پڑھے ہے یہ دل کلمہ حسرآن اُس کا
وہ بُت بے وفا ہے تو ایمان اس کا

دیگر

قرار محرومِ منتظر کو کہاں شبِ انتظار آیا
نہ نیند آئی، نہ چین پایا، نہ موت آئی، نہ یار آیا

فرد

ہو گیا آخر تلف وہ کاروانِ آرزو!
مدتوں جس نے اُڑائی دل کے ویرانے کی خاک!

بہ درگاہِ آفریدگار

(۱)

مہ و مہر و ثُریّا آفریدی — چہ صورت ہائے زیبا آفریدی
گرایں ہا آفریدی از پئے ما — چرا بے ذوق ما را آفریدی!

(۲)

بتانِ ماہ سیما آفریدی — نگارانِ خود آرا آفریدی
دل و دیں گرچہ شد تاراجِ ایشاں — چساں گویم کہ بے جا آفریدی!

(۳)

عیاں بُودی چو دُنیا آفریدی — زمین و آسماں ہا آفریدی
گُناہِ ما چہ بُود اے داورِ پاک — نہاں گشتی چو ما را آفریدی!

غزل

همین است آرزوئے من که بوسم آستانے را
زمینِ سجدۂ صد شوق سازم آسمانے را

چرا اے آسماں کردی، غریبِ ناتوانے را
حریفِ فتنۂ چشمے کہ آشوبِ جہانے را

ہزاران دل ستانان دل بہ غارت می برند اینجا
نکو کردی، اگر دادی بہ رغبت دلستانے را

حبیبِ نکتہ یابے نیست در دنیائے غمخواری
دگرنہ قطرۂ اشکیست کافی داستانے را

بہ ہر یک کارواں لبیک گوید منزلِ دنیا
ولیکن بر نمی تابد قیامِ میہمانے را

بسر کردیم در تدریس عمرِ خویش را لیکن
ندانستیم درسِ مہر دادن مہربانے را

بیا محروم با من تا حصارِ بلبلی خانہ
بہ بلبل گر بجوئی نکتہ سنجے، نکتہ دانے را![1]

---

[1] مکرمی منشی بشیشور پرشاد منوّر لکھنوی

غزل

کمالِ صنعتِ بُت سازہ کردہ حیرانم
آں عشقِ بُتاں غیر ازیں نمی دانم

ز مرگ چشم ندارم سکونِ خاطر را
ہلاکِ غمزۂ آں چشمِ فتنہ سامانم

دوائے دردِ من است آنکہ ز ہجراں داد
بدار دست تو اے چارہ گر ز درمانم

تلافیِ ہمہ دشواریِ حیات شود
چہ خوش بود کہ بہ بخشند مرگِ آسانم

ہزار لالہ و گُل در جہاں شگفت و بماند
ستم رسیدۂ ہجراں نگاہِ دیرانم

دمے بہ حُرمتِ ایمائے گُل نخشیدم
وگرنہ واقفِ آئینِ ایں گلستانم

فسردہ تا، نہ زپیری، شود دلِ محرم
حدیثِ شوق بہ یادِ شباب می رانم!

غزل

رفت سودائے سیرِ گُل ز سرم — در چمن زارِ عالمِ دگرم

منتِ شیخ و برہمن نہ برم — بے نیازم ز طوفِ دیر و حرم

رہزنِ عقل و ہوش می یابم — بے خیالت بہر چہ در نگرم

میکشم انتظارِ پرتوِ مہ — ہمعنانِ ستارۂ سحرم

چوں بہ کردارِ او نظر کردم — واعظِ شہر خواند بے بصرم

موسمِ گُل رسید و باہوشم — چہ قدر غافلم، چہ بے خبرم!

غزلِ تازہ ام بخواں محرومؔ
تا نگوئی کہ نخلِ بے ثمرم

مُناظَرہ

مابینِ مُلّا کمال مرحوم و علّامہ اقبال مرحوم

مُلّا کمال

بہ مسجد سجدہ پیشِ خدائے — بہ دیر اندر رسومِ بُت پرستی
بنائے دیر ہشدی را بر انداز — خدائے پاک را گر بندہ ہستی

عَلّامۂ اقبال

مرنج از برہمن اے واعظِ شہر! — گر از ما سجدہ پیشِ بتاں خواست
خدائے ما کہ خود صورت گری کرد — بُتے را سجدہ از قدسیاں خواست!

مُلّا کمال

پرستش را نشاید نقشِ فانی — ہمہ اصلِ صنم از خاک و سنگ است

صنم ہا را برہمن می پرستند — ازاں ما را بہ وی پیکار و جنگ است

علامۂ اقبال

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت — فروغِ زندگی تابِ شرر بود
ولیکن گر نہ رنجی با تو گویم! — صنم از آدمی پائندہ تر بود!

ملا کمال

برہمن را ستائش گر چرائی — چہ چیز اندر دریں مدحت سرائی
نمی بینی کہ آں فرسودہ ہمت — بہ لختِ سنگ می جوید خدائی

علامۂ اقبال

برہمن را نگویم ہیچ کارہ — کند سنگِ گراں را پارہ پارہ
نیاید جز بہ دستِ زورِ بازو — خدائے را تراشیدن زخارہ

ملا کمال

بت آرایانِ ہندی گم رہانند — کہ راہِ منزلِ ایماں ندانند
حیات و مرگِ شاں در ظلمتِ کفر — ز تاریکی بہ تاریکی روانند

عَلّامۂ اقبال

درِ صد فتنہ را بر خود کُشادی — دوگامی رفتی و از پا فتادی
برہمن از بُتان طاقِ خود آراست — تو قرآں را سرِ طاقی نہادی

مُلّا کمال

تو ہم مردِ مُسلمانی و دانی — خدا خالق، صنم مخلوق باشد
زکارِ برہمن در حیرتم من — ز سنگی خالقِ خود می تراشد

عَلّامۂ اقبال

تراشیدم صنم بر صورتِ خویش — بہ شکلِ خود خُدا را نقش بستم
مرا از خود برُوں رفتن محال است — بہر رنگی کہ ہستم خود پرستم!

مُلّا کمال

بہ ایں سوزِ سخن محشر نوائی — نہ بینی امتیاز کُفر و اسلام
دلِ معنی فروزت طُرفہ مضراب — کہ می سازد بہ سازِ کُفر و اسلام

علّامہ اقبال

تو اے شیخ حرم شاید ندانی جہانِ عشق را ہم محشرے ہست
گناہ و نامہ و میزاں ندارد نہ او را مسلمی نے کافرے ہست!

مُلّا کمال

بنائے مسجدے خواہم دراں جا اگر بُت خانۂ مسمار بینم
جُز ایں دیگر طریقِ رستگاری نیاید در خیالم در یقینم

علّامہ اقبال

کنشت و مسجد و بُت خانہ و دیر جُز ایں مُشتِ گِلے پیدا نہ کردی
زحکمِ غیر نتواں جُز بہ دل رست تو اے غافل، دلے پیدا نہ کردی!

تضمینات

تضمین مناجات نظامی گنجوی

بصورتِ مثلث

به حالِ من که محرومم ببخشائے خداوندا درِ توفیق بکشائے
به سوئے خود رہِ تحقیق بنمائے

ببخش آں علم کو سُومیت گراید ولے دہ کو یقینت را بشاید
زبانے کافرینت را سراید

درخشاں کن دِلم را صورتِ ماہ مدہ ناخوب را در خاطرم راہ
بدار از ناپسندم دست کوتاہ

دلِ افسردہ را کن شعلہ اندوز درونم را بہ نورِ خود بیفروز
زبانم را ثنائے خود در آموز

رہینِ لطفِ بے اندازہ گرداں بہ داؤدی دلم را تازہ گرداں
زبورم را بلند آوازہ گرداں!

تضمینِ شعرِ ناصر علی

دلِ ہر قطرہ از تابِ رُخت گرداب می گردد
چہ خار و خس کہ خارا ہم شرار زتاب می گردد

نہ تنہا دل حضورِ جلوہ ات بیتاب می گردد
تو چوں جلوہ آئی مغزِ جاں سیماب می گردد
تجلّی می کند بر قیکہ آتش آب می گردد

دیگر[1]

یاد آیا میکہ ظلمت پاش رُو زمانہ بُود
رشکِ لعلِ شب چراغ آں جلوۂ جانانہ بُود

پرتوِ تابانیِ رویت چراغِ خانہ بود
شمعِ رخسارِ تو روشن تا دریں کاشانہ بود
چشمِ ما پروانہ و مژگاں پرِ پروانہ بود

---

[1] یہ تضمین بھی "طوفانِ غم" کی منظومات سے متعلق ہے۔ (محروم)

سخت ناداں

(تضمین شعر ابن یمین)

ذکرِ اورنگ زیبِ عالم گیر — شورش افزائے بزم ویران است
غصہ بر کردہ ہش ہندو را — مسلم او را بدل ثنا خوان است
سخنِ برہمن سناں تمثال — نفسِ شیخ شعلہ ساماں است
اندریں حال قولِ ابنِ یمین — در حقِ ہندو و مسلمان است

"ہر کہ با زندہ از پئے مردہ
میکند جنگ سخت ناداں است"

تضمینِ شعرِ اقبال

تا چند پنہاں از من مہ من — "تاریک باشد تا کے رہِ من
سوزید قلبِ ناآگہِ من — از من بروں نیست منزلگہِ من
من بے نصیبم، راہے نیابم"

قطعات

طبعِ شاعر

طبعِ شاعر کہ میکند پیدا — معنیِ خوب در خورِ تحسیں
زینہار ایں گماں مبر کہ بود — تازہ و خرّم و نشاط آگیں
گل بود جنتِ نگاہ، ولے — نہ بود خاک زیرِ گلِ رنگیں

شاعر و عمل

تو گفتی فلاں شاعرِ خوشنواست — ولے صاحبِ حسنِ کردار نیست
مدار از سخن در امیدِ عمل — کہ او را ہنر جز بہ گفتار نیست

شاعر و محنت

شاعر استم بغیرِ فکرِ سخن — ہیچ فکرِ دگر ندانم کرد
می دہد محنتم زمانہ عبث — بُلبُلم، کارِ خر ندانم کرد

جوانی و پیری مرد و زن

(ترجمہ از انگریزی)

مرد را پیر داں بہ عہدِ شباب — گشت پیرانہ گر خیالِ او
زن جوانست، اگرچہ پیرہ بُود — ہست قائم اگر جمالِ او

سُبکدوش شدنِ مصنّف از ملازمت

سی و پنج سالِ عمرم بہ ملازمت بسر شد — سحرِ شباب خود را بہ تیرہ شام کردم
شَرَفم بہ عہدِ پیری چہ بود کہ در جوانی — بہ سگاں ادب نمودم، بہ خراں سلام کردم

دُعائیہ

گُم کردہ نشانِ منزلم من! — بے راہ نُما و بے دلم من
خوابیدہ بہ راہِ دشتِ پُرہول — رحمے، یارب، چہ غافلم من

نوحہ

رحلتِ مولانا راشد الخیری

اشکِ خوں باز اے دلِ غمدیدہ ریز — باز شعلے آہِ آتش باز تیز

باز شد سرگرمِ کیں چرخِ کہن — ریخت برقِ تازہ بر جانِ وطن

باز شد بزمِ وطن بزمِ عزا — در فضائے او علم شد نالہ ہا

یک جہانِ درد و غم دہلی است باز — محشرستانِ الم دہلی است باز

از جہاں فخرِ جہاں آباد رفت — یادگارِ حالی و آزاد رفت

راشد الخیری عزیزِ ایں و آں

وا دریغ از چشمِ عالم شد نہاں

تازہ دارِ خلقِ پیغمبر برفت — جاں سپارِ طاعتِ داور برفت

محسن و غمخوارِ نسوانِ وطن — چارۂ آزارِ نسوانِ وطن

آں کہ نالیدے بحالِ خستگاں　　نا رمیدے از ملالِ خستگاں

آں کہ نوکِ کلکِ او نشتر زدے　　آں کہ تیرِ آہ بر اختر زدے

آں زبانِ بے زباناں شد خموش

نوحہ خوانِ خستہ جاناں شد خموش

آہ آں تسکین طرازِ بیدلاں　　دل نواز و چارہ سازِ بیدلاں

بر زباں آورد رُودادِ قفس[1]　　نالۂ مُرغانِ ناشادِ قفس

غم نگار و حامیٔ غم دیدگاں　　کشتۂ ناکامیٔ غم دیدگاں

بے قراراں را قرارِ جاں نماند

بے کساں را ہمدم و پُرساں نماند!

---

[1] مولانا راشد الخیری کی نظموں کے مجموعہ کا نام "رودادِ قفس" تھا۔

دہلی کتاب گھر
کی
کتابیں

رُباعیاتِ محروم

مجھے یقین ہے کہ یہ رُباعیاں اُردو کے سنجیدہ ادب میں جو بہت قلیل ہے ایک گراں بہا اضافہ کر دیں گی اور اُن حضرات کو لطف اندوز ہونے اور فائدہ اُٹھانے کا بھرپور موقع دیں گی۔ جو بجا طور پر اس کا یقین رکھتے ہیں کہ شاعری حیاتِ انسانی کو آرائش، آسودگی اور استواری کی دولت بخش سکتی ہے۔

(جوش ملیح آبادی)

جنابِ محروم کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ اُن کا شمار ملک کے نامور اساتذۂ سخن میں ہے۔ اُن کے کلام کی پختگی اور زبان کی دلآویزی اُردو ادب کے ہر شیدائی سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ محروم کا نام بھی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ اُن کا مجموعۂ رُباعیات قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے کی چیز ہے۔

(علامہ کیفی)

تین روپے بارہ آنے

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دھلی

روپ

چھپنے کے پہلے ہی سے کوئی کتاب اس طوفانی طور سے مشہور نہیں ہوئی تھی جس طرح فراقؔ گورکھپوری کی سنگار رس کی رُباعیوں کا یہ مجموعہ. حواسِ خمسہ اور اعضائے جسمانی ان ترانوں میں رُوح کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں. ان رباعیوں میں برقِ طُور کی چمک ہے اور جنّت کی ہواؤں کی ٹھنڈک، ہر رباعی کے ایک ایک لفظ سے سات رنگوں کی پھوار ہوتی ہوئی نظر آتی ہے. یہ شعورِ جمال آفاقی کلچر اور آفاقی ادب کے شاہکاروں میں ہی نظر آتا ہے. بقول مولانا نیازؔ فتحپوری "فراقؔ نے اس صنفِ سخن میں لطیف ترین بُت گری سے کام لیا ہے. ان رُباعیوں میں مغربی کلچر بھی ہے، اور ایرانی کلچر بھی، یونانیوں کا جمالیاتی نظریہ بھی ان میں موجود ہے، اور قدیم ہندو اور بودھ آرٹ کا رقص و نغمہ بھی." (نگار مئی ۱۹۴۵ء)

تین روپے آٹھ آنے

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی

رمز و کنایات

شعریت میں ڈوبا ہوا تفکر، عالم خیال میں ڈوبی ہوئی نغمگی سنگیت میں
ڈوبے ہوئے جذبات، وہ خلوص و صداقت جس میں گویا راگنیاں سی چھائی
ہوئی ہیں وہ آواز جو کائنات کے آنسوؤں میں نہائی ہوئی ہے اور
جس پر خیر و برکت کی روشنیاں اور پرچھائیاں پڑ رہی ہیں۔ یہ ہیں رمز و
کنایات کی غزلوں کی ایسی خصوصیتیں جو سوائے فراق کے اُردو غزل کو
کسی نے دیں؟ ذاتی محبّت کے واردات میں جو نرمی، جو داخلیت، جو
گیرائی اور گہرائی، تخیّل میں جو معصومی و شرافت، شعور میں جو چلبلا پن فراق
نے بھر دیا ہے وہ اُردو شاعری کی تاریخ میں آپ اپنی مثال ہے۔ یہ
غزلیں ایک بار پڑھ کر رکھ دینے کی چیز نہیں ہیں بلکہ ہماری جیون ساتھی
ہیں۔ فراق کی آواز ہمیں رُلاتی بھی ہے اور ہمارے آنسو بھی پونچھتی ہے۔

تین روپے آٹھ آنے

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی

بیکراں

جگن ناتھ آزاد کے مجموعۂ کلام کے مطالعہ سے مجھ پر ایک عجیب کیفیت گزری — میں نے یہ جانا، یہ محسوس کیا کہ جیسے تاریخ کا چکر اُلٹا گھوم رہا ہے، جیسے دُنیا اربابِ سیاست کے ہاتھوں سے نکل کر اہلِ ادب کے قبضۂ قدرت میں آگئی ہے۔ جیسے انسان بہیمیت بھول گیا ہے انسان بن گیا ہے!——

جگن ناتھ آزاد کا کلام غزل، نظم، قطعہ، رباعی، ادبیت میں رچا ہوا ہے۔ اس کی وہی ادبی روایات ہیں جو غالب، اقبال، حسرت موہانی، جوش، چکبست میں وغیرہ مشترک ہیں۔ الگ الگ شخصیت اور طرزِ اظہار کے باوجود!——

یہ ایک گداز طبیعت، دردمند دل، حسّاس شخصیت کا کلام ہے۔ ایک محبت کرنے والے عالی ظرف دوست کی گفتار ہے جو بہت سی باتیں چشمِ سخنگو اور جنبشِ ابرو سے کہہ جاتا ہے۔ وہ جسے بلاغت کہا جاتا ہے آزاد کے کلام میں اس کا وفور ہے یعنی دل و دماغ دونوں کا نور ہے۔ اس ہیجانی دور میں ادبی توازن کو برقرار رکھنا بڑی عظمت کی نشانی ہے جگن ناتھ آزاد کے کلام میں تازگی بھی ہے اور پختگی بھی۔

(تاثیر مرحوم)

تیسرا ایڈیشن —— چار روپے آٹھ آنے

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی

ستاروں سے ذرّوں تک

جگن ناتھ آزاد کا دوسرا مجموعۂ کلام

جگن ناتھ آزاد دورِ حاضر کے دل پسند اور ممتاز شاعر ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے اُنھیں اپنے فرائض کا احساس ہے۔ اس وجہ سے وہ ستاروں کو نظر انداز کرتے ہیں نہ ذرّوں کو۔ آزاد کے شعروں کی نرم آواز اور دھیمی کسک جو بظاہر ایک قسم کے شخصی اظہار اور ذاتی افتادِ طبع کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ اُن کا کلام سننے اور پڑھنے والے کے احساس کا جزو بن جاتی ہے۔ متاثر کرنے کی یہ صلاحیت حقیقی جذبات کے پیش کرنے اور فن کے شعوری طور پر برتنے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں باتیں آزاد کے کلام میں دیکھی جا سکتی ہیں جن کا ارتقا چند سالوں کے اندر ہوا ہے۔ لاہور نے انھیں شعر کہنے اور شعری فضا میں رہنے بسنے پر مائل کیا تھا۔ لاہور کے فراق نے ان کے کلام میں گداز، انسانیت اور غنائیت کے عناصر پیدا کیے ہیں۔ انھیں عناصر کے فن کارانہ اظہار میں ان کی ہردلعزیزی اور ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔

(احتشام حسین)

(دوسرا ایڈیشن)

دو روپے بارہ آنے

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی

وطن میں اجنبی

آزاد کا تیسرا مجموعۂ کلام

پچھلے دنوں دہلی سے پاک و بھارت کے مقبول شاعر جگن ناتھ آزاد پاکستان تشریف لائے تھے، اور پاکستان کے ہر شہر میں اُن کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا اور حاضرین نے اُن کے کلام کو جی کھول کر سُنا اور جی کھول کر داد بھی دی تھی۔ تقسیم نے کئی دلوں میں جدائی کی ایک آگ سی سلگائی ہے اور اس آگ کے سب سے بلند شعلے جگن ناتھ آزاد کے دل میں روشن ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وہ پاک و بھارت میں بے حد مقبول ہیں اور اُن کا کلام ایک بار پڑھ کر بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

(ہفتہ وار "احساس" لاہور نومبر ۱۹۵۴ء)

(زیرِ طبع)

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی

اُردو

"جگن ناتھ آزاد کی ایک طویل نظم ہے۔ جو اُنھوں نے اُردو مجلس دہلی کی پہلی سالگرہ کی تقریب میں پڑھی۔ آزاد نے ایک کامیاب شاعر ہونے کے لحاظ سے جو شہرت حاصل کی ہے اُس کی بنیاد چند در چند خصوصیات پر قائم ہے۔ جن کا تعلق فن سے بھی ہے اور اُن کی ذات سے بھی۔ فن کا جہاں تک تعلق ہے وہ ایسے پختہ کار شاعر ہیں کہ مشکل ہی سے دو چار اُن کی صف میں آسکتے ہیں۔ لیکن جس حد تک اُن کی ذات یا ذاتی تاثرات کی بلندی کا تعلق ہے دو چار بھی ایسے نہ ملیں گے کہ آزاد کے نام کے ساتھ اُن کا نام لیا جائے۔ آزاد کی شاعری خواہ وہ غزل ہو یا نظم، یکسر دردمندانہ خلوص کا اظہار ہے اور اس اظہار میں وہ اُن تمام سلیقوں سے کام لیتے ہیں جو قدیم و جدید اُردو ادب کے مطالعے سے اُن میں پیدا ہوئے ہیں۔"

نگار لکھنؤ

اکتوبر ۱۹۵۱ء

دوسرا ایڈیشن — آٹھ آنے

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی

دِل سے قریب

"جناب انتصار حسین نیوتنوی کے چار ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ پہلے ڈرامے کا نام ہے "دل سے قریب"، اور یہی اس دلچسپ مجموعے کا بھی نام ہے۔ یہ ریڈیائی ڈرامے لکھنؤ۔ پشاور۔ لاہور۔ حیدرآباد۔ بمبئی اور دہلی ریڈیو اسٹیشنوں سے کئی بار نشر ہو چکے ہیں۔ اور مشہور و مقبول ہو چکے ہیں۔ انتصار حسین نیوتنوی صاحب باندی۔ یادِ ایام۔ ننگے پاؤں۔ آوازیں اور کئی ایسے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں کے مصنّف ہیں، جو ہزارہا آدمیوں سے اور ملک کے اہلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اُنھیں ریڈیائی ڈراموں کی نازک اور پیچیدہ تکنیک پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ اُن کا اصلی کمال جھلک اُٹھتا ہے پلاٹوں کی تشکیل و تنظیم اور گرہ کھولنے میں۔ نہایت نرمی اور آہستگی کے ساتھ وہ ایک نہایت فطری اور نہایت غیر متوقع پلاٹ کی داغ بیل ڈالتے ہیں اور ڈرامے کو آگے لے جا کر ایسے جھٹکے پر ختم کر دیتے ہیں کہ ہمیں ایک خوش گوار صدمہ بھی ہوتا ہے، ایک خوش گوار آسودگی بھی ہوتی ہے۔"

(آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

ایک روپیہ بارہ آنے

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی

ہندوستاں ہمارا

"ہندوستاں ہمارا" اُردو کے نہایت مشہور افسانہ نگار بلونت سنگھ جو جگا، تار پود، سُنہرا دیس، اُجلے پھول، پنجاب کی کہانیاں، خدا کی وصیت، شہزادہ اور کئی اور ناولوں، طویل اور مختصر افسانوں کے مصنّف ہیں، کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ زیرِ نظر افسانوں میں مصنّف کا فن اپنے پُورے شباب پر ہے۔ ان افسانوں میں ہم عروسِ زندگی کو چھُوتے ہی نہیں، بلکہ اُسے بھینچ بھینچ لیتے ہیں، اور اتنے زور سے کہ رگ رگ میں ایک کسک اور سینے میں ایک لذّت آفریں درد محسوس ہونے لگتا ہے، احساس کی یہ توانائی، اور اک کی یہ صحت مندی یہ اُن افسانوں کی دل کشی کا خاص راز ہے۔ اس مجموعے میں بارہ افسانے ہیں مصنّف کے دل و دماغ کی لہلہاتی ہوئی اُپجاؤ زمین سے زندگی کے سرچشمے اُبلے پڑتے ہیں۔

(آل انڈیا ریڈیو۔ لکھنؤ)

تین روپے آٹھ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار ——— دہلی

وطن میں اجنبی

جگن ناتھ آزاد کا تیسرا مجموعۂ کلام

اِس کتاب میں بظاہر آزاد کی متعدد نظمیں جمع کی گئی ہیں لیکن جو رُوحِ مسلسل اُن میں جاری و ساری ہے اُس کے اعتبار سے یہ متعدد نظمیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی طویل نظم ہے جس کے مختلف حصّے مختلف بحروں اور مختلف زمینوں میں موزوں ہو گئے ہیں۔ ہر بحر اور ہر زمین شاعر کے ہنگامی جذبہ و احساس کا پتہ دیتی ہے۔

جگن ناتھ آزاد کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت دردواثر ہے جو خلوصِ احساس کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ زبان کی گھلاوٹ بیان کی سلاست اور حقیقت بینی نے اُس کو برصغیر ہند و پاک کی صفِ اوّل میں جگہ دے دی ہے اور وُہ بلاشبہ اس مقام کا مستحق ہے۔

عبدالمجید سالک

قیمت ۲ دو روپے ۱۲ بارہ آنے

مکتبۂ شاہراہ ۰ اُردو بازار دہلی